قرنِ اول میں مسلمانوں کے غیر مسلموں سے تعلقات و معاہدات
اور عصرِ حاضر

(تحقیقی مقالہ برائے پی - ایچ - ڈی، علومِ اسلامیہ)

۱۴۲۳ھ / ۲۰۰۲ء

مقالہ نگار
محمد اسلم صدیقی
رول نمبر ۲-۰۲-۰۳

نگرانِ مقالہ
ڈاکٹر حافظ محمود اختر
پروفیسر
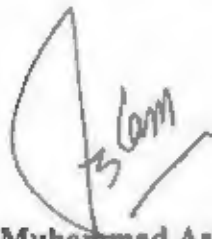
شعبہ علومِ اسلامیہ، جامعہ پنجاب، لاہور

بسم الله الرحمن الرحیم

DECLARATION CERTIFICATE

This thesis which is being submitted for the degree of Ph.D. in the University of the Punjab does not contain any material which has been submitted for the award of Ph.D. degree in any University and, to the best of my knowledge and belief, neither does this thesis contain any material published or written previously by another person, except when due reference is made to the source in the text of the thesis.

Mr. Muhammad Aslam Siddiqui
Ph.D. Scholar
Deptt. of Islamic Studies.

Telephone: 042-9231232

DEPARTMENT OF ISLAMIC STUDIES
UNIVERSITY OF THE PUNJAB
Quaid-i-Azam Campus, Lahore
E-mail: chairman@is.pu.edu.pk

Ref. No. D/535/I.S *Dated* 13/4/10

TO WHOM IT MAY CONCERN

It is certified that Mr. Muhammad Aslam Siddiqui is a regular student in Department of Islamic Studies and he has completed his Thesis.

Titled: قرنِ اول میں مسلمانوں کے غیر مسلموں سے تعلقات و معاہدات اور عصر حاضر under my supervision for the award of Ph.D. degree. Mr. Muhammad Aslam Siddiqui is eligible for submission of thesis under the rules & regulation of the Department as well as of the University regarding Ph.D. The material used by him is original and he has shown creativeness in his work. The thesis presents work done by the candidate.

Dr. Hafiz Mehmood Akhtar
Supervisor / Professor 13.4.10

انتساب

والد محترم علی حسن مرحوم کے نام
جن کی پرخلوص دعاؤں اور چاہت
سے میں علوم اسلامیہ کا طالب علم
بننے کی سعادت سے ہمکنار ہوا۔

اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لَهٗ وَارْحَمْهُ وَعَافِهٖ وَاعْفُ عَنْهُ.
.... وَاَدْخِلْهُ الْجَنَّةَ الْفِرْدَوْسَ

آمین

اظہار تشکر

الحمد للہ رب العالمین

میں اپنی اس عاجزانہ کاوش پر سب سے پہلے اس ذات بابرکات کا شکریہ ادا کرتا ہوں جس نے مجھے انتہائی کم ہمتی اور نامساعد حالات کے باوجود اپنے دین متین کی مدافعت میں چند کلمات لکھنے کی توفیق عطا فرمائی۔

اس کے بعد میں ان تمام شخصیات کا شکر گزار ہوں جو میرے لیے میرے رب کا بہت بڑا انعام ثابت ہوئیں۔ جنھوں نے میرے ڈگمگاتے قدموں کو سہارا دیا اور ہر ملاقات پر میرے اندر اس باسعادت اور کار عظیم کو سرانجام دینے کے لیے تشویق اور تحریک پیدا کی۔

ان حضرات میں میرے سپروائزر پروفیسر ڈاکٹر حافظ محمود اختر ڈین فیکلٹی آف اسلامک سٹڈیز اور پروفیسر ڈاکٹر شبیر احمد منصوری صدر شعبہ علوم اسلامیہ جامعہ پنجاب خصوصی شکریہ کے مستحق ہیں جنھوں نے مجھے جو شفقت اور راہنمائی مرحمت فرمائی وہ میرے لیے سرمایہ حیات اور بقیہ عمر میں اس کام سے جڑے رہنے کا سبب بنے گی۔

پروفیسر ڈاکٹر محمد حماد لکھوی اور پروفیسر ڈاکٹر محمد عبداللہ کے تعاون کا بھی میں دلی معترف اور شکر گزار ہوں۔

جملہ اساتذہ شعبہ علوم اسلامیہ اور جملہ عملہ لائبریری کے بہترین تعاون کا شکریہ ادا کرنا بھی میں ضروری سمجھتا ہوں۔

پروفیسر ڈاکٹر امان اللہ گورنمنٹ کالج شیخوپورہ بھی انتہائی شکریے کے مستحق ہیں انہوں نے جس خلوص اور لگن کے ساتھ مواد کی فراہمی اور میری حوصلہ افزائی کی ان کے لیے میں اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہوں کہ انہیں دنیا و آخرت میں بہتر جزا عطا فرمائے۔

میری اہلیہ اور بچے میری اس مصروفیت کی بنا پر بہت ڈسٹرب رہے لیکن میرے سامنے اظہار نہ کر کے میرا حوصلہ بڑھاتے رہے اللہ تعالیٰ ان سب کو بھی جزائے خیر اور اپنے دین کی خدمت کے لیے قبول فرمائے۔

جزاهم الله كلهم احسن الجزاء فی الدارین

آمین

محمد اسلم صدیقی

۹۔اپریل ۲۰۱۰ء

فہرست مضامین

مقدمہ

اسلام ایک عالمی دین ہے اس کو اپنانے ہی میں پورے عالم کی بقاء اور سلامتی کا راز مضمر ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں قابل قبول دین صرف اور صرف اسلام ہی ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

إِنَّ الدِّينَ عِندَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ [1]

''بے شک اللہ کے ہاں قابل قبول دین اسلام ہی ہے۔''

اسلام کے علاوہ کوئی دین اللہ کے ہاں قابل قبول نہیں ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

وَمَن يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَن يُقْبَلَ مِنْهُ [2]

''اور جو کوئی اسلام کے علاوہ کوئی اور دین اختیار کرے گا تو وہ اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا۔''

اسلام پورے عالم کی خیر خواہی چاہنے والا دین ہے۔ نبی کریم ﷺ نے دین کا مختصر تعارف یوں کرایا ہے:

الدين نصيحة [3]

''دین خیر خواہی کا نام ہے۔''

اسلام پوری مخلوقات کو اللہ کا کنبہ قرار دیتا ہے۔ حدیث نبوی ہے:

الخلق عيال الله فاحب الناس الى الله من احسن الى عياله [4]

''اللہ کی مخلوق اللہ کا کنبہ ہے اور اللہ تعالیٰ کو مخلوق میں سے زیادہ محبوب وہ ہے جو اس کے کنبہ کے ساتھ اچھا سلوک کرتا ہے۔''

لہٰذا اسلام کی رو سے اللہ تعالیٰ کا محبوب بننے کے لیے اس کی مخلوقات سے حسن سلوک شرط ہے۔ اسلام میں ایک جان کی حرمت یہاں تک ہے کہ اس کا ناحق قتل پوری انسانیت کے قتل کے مترادف اور ایک کی جان بچانا پوری انسانیت کی زندگی بچانے کے برابر سمجھا جاتا ہے۔

مَن قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ أَوْ فَسَادٍ فِي الْأَرْضِ فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيعًا وَمَنْ أَحْيَاهَا فَكَأَنَّمَا أَحْيَا النَّاسَ جَمِيعًا [5]

---

[1] آل عمران ۳:۱۹

[2] آل عمران ۳:۸۵

[3] صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان ان الدین النصیحہ (۱۹۶) الکتب الستہ، ص ۶۸۹

[4] مجمع الزوائد ۱۹۱/۸

[5] المائدہ ۵:۳۲

''جس شخص نے کسی کو (ناحق) قتل کیا یعنی بغیر اس کے کہ جان کا بدلہ لیا جائے یا ملک میں خرابی پیدا کرنے کی سزا دی جائے تو گویا کہ اس نے تمام لوگوں کو قتل کیا اور جو اس کی زندگانی بچانے کا موجب ہوا تو گویا کہ وہ تمام لوگوں کی زندگی بچانے کا سبب بنا۔''

اسلام احترام انسانیت کا قائل ہے۔قرآن میں ہے:وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ[1] ''اور ہم نے بنی آدم کو عزت بخشی۔''

اسلام کی مذکورہ تعلیمات کی بدولت اس دین سے وابستہ کوئی شخص انسانیت سے نفرت نہیں کر سکتا اور نہ ہی اسے تکلیف پہنچا کر یا تکلیف میں مبتلا دیکھ کر خوش ہو سکتا ہے۔

حضرت محمد ﷺ پوری انسانیت کے خیر خواہ اور اس کی دنیوی و اخروی فلاح کے متمنی تھے اور اس جذبے میں یہاں تک بڑھے ہوئے تھے کہ قرآن نے آپ کے لیے حریص کا لفظ استعمال کیا ہے۔ کیونکہ آپ کا یہ جذبہ اپنے پرائے دوست دشمن بلکہ بدترین دشمنوں تک کے لیے یکساں تھا۔

اسلام سلامتی اور امن کا دین ہے جیسا کہ اس کے لغوی معنی سے ہی ظاہر ہے۔اسلام تمام انسانیت کے لیے بلا امتیاز مذہب پرامن بقائے باہمی کا علمبردار ہے۔قرآن وسنت کی تعلیمات میں سب سے زیادہ اہمیت معاشرتی امن وسلامتی اور مختلف طبقات معاشرہ کے درمیان باہمی ہم آہنگی کو دی گئی ہے۔

مسلمانوں کے باہمی تعلقات ہوں یا دیگر غیر مسلموں سے تعلقات اسلام کسی نہ کسی اشتراک یا بنیاد کی نشاندہی کر کے ہر حال میں معاشرے کو فساد سے بچاتے ہوئے معاشرتی امن کو فروغ دیتا ہے۔جس کی بہترین مثال اس آیت میں دی گئی پکار ہے:

قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَىٰ كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ[2]

''کہہ دیجیے اے اہل کتاب آؤ اس کلمہ کی طرف جو ہمارے تمہارے درمیان برابر ہے۔''

موجودہ دور میں اسلامی تعلیمات سے مکمل آگاہی نہ ہونے کی بناء پر یا پھر غیر مسلموں سے غیر معمولی تشدد اور اذیت کا شکار ہونے کی بناء پر انتقام کے طور پر کچھ جوشیلے مسلمانوں کے قول وعمل سے ایسے واقعات اور رویے ظاہر ہو رہے ہیں جو اسلامی تعلیمات اور مزاج کے خلاف ہیں۔ان کو بنیاد بنا کر بہت سے غیر مسلم اپنے مفادات اور اسلام کو بدنام کرنے کی خاطر اسے دہشت گردی اور دنیا کے ساتھ پرامن بقائے باہمی نہ رکھنے والا مذہب قرار دینے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں اور قرآن وحدیث کی وہ تعلیمات جو کہ فتنہ پرداز اور معاشرتی امن تباہ کرنے والے لوگوں کے لیے تھیں، انہیں اسلام کی عمومی تعلیمات قرار دے رہے ہیں اور کسی بھی ملک میں اسلامی غلبے یا نفاذ شریعت کو دنیا کے لیے خطرہ قرار دیتے ہوئے اس پر حملہ یا بائیکاٹ کر رہے ہیں۔ اس لیے ضروری محسوس ہوا کہ اسلام کے عروج کے دور کا تحقیقی مطالعہ کر کے صحیح صورت حال دنیا کے سامنے رکھی جائے۔

نفاذ اسلام کے مکمل عملی نفاذ کا دور، دور نبوی اور خلفاء راشدین کا دور ہے جس کی اہمیت نبی کریم ﷺ نے ایک حدیث میں یوں بیان فرمائی:

---

[1] الاسراء ۱۷:۷۰

[2] آل عمران ۳:۶۴

علیکم بسنتی و سنۃ الخلفاء الراشدین[1]

''تم پر میری سنت اور خلفاء راشدین کی سنت کی پیروی لازم ہے۔''

ایک اور حدیث میں نبی کریم ﷺ نے اپنے قرن (صدی) کو بہترین زمانہ قرار دیا۔

خیر امتی القرن الذی بُعِثْتُ فیھم[2]

''میری امت کا بہترین زمانہ وہ قرن ہے جس میں میں ان میں بھیجا گیا۔''

لہٰذا میں نے قرن اول کو اپنی تحقیق کا مرکز بنا کر اس میں شامل دور نبوی خلافت راشدہ اور قرن اول میں شامل اموی حکمرانوں کے دور میں غیر مسلموں سے تعلقات اور معاہدات کا جائزہ لے کر یہ بات جاننا اپنا موضوع بنایا ہے کہ ان ادوار میں غیر مسلموں سے مسلمانوں کے تعلقات کی نوعیت کس انداز کی تھی۔

قرن اول میں مسلمانوں کے غیر مسلموں سے تعلقات و معاہدات ایک تاریخی حقیقت کی حیثیت رکھتے ہیں ان سے متعلق حقائق اور مسائل کتب تاریخ، سیرت، احادیث اور فقہ کی تمام امہات الکتب میں جہاد، سیر، فئی، خراج، جزیہ، امارہ اور احکام اہل الذمہ کے ابواب و عنوانات کے تحت تفصیلاً موجود ہیں۔

انسانی تعلقات کا مسئلہ چونکہ سماج کا نازک ترین مسئلہ ہے اس لیے اہل علم ہر دور میں اس پر لکھنا اپنی ذمہ داری سمجھتے رہے ہیں۔ امام ابو یوسف کی کتاب الخراج ابو عبید القاسم کی کتاب الاموال اور امام ابن حزم کی مشہور کتاب الفصل فی الملل والاھواء النحل میں بھی اس چیز کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔

ابن قیم کی دو ضخیم جلدوں پر مشتمل کتاب احکام اہل الذمہ اور ڈاکٹر زیدان عبدالکریم کا احکام الذمیین والمستامنین فی دارالاسلام اور ڈاکٹر حمید اللہ کے الوثائق السیاسیہ کے عنوان سے کام منظر عام پر آ چکا ہے۔ اردو میں مولانا مودودی کی ''اسلامی ریاست میں ذمیوں کے حقوق'' اور ''الجہاد فی الاسلام'' ڈاکٹر حمید اللہ کی کتاب ''عہد نبوی کا نظام حکمرانی'' اہمیت کی حامل ہیں۔ مگر یہ کتب عصر حاضر کے تقاضے پورے نہیں کرتیں کیونکہ موجودہ حالات میں دنیا ایک گلوبل ویلج کی حیثیت اختیار کرتی جا رہی ہے۔ مختلف مذاہب، عقائد اور کلچر کے لوگ ایک دوسرے کے ساتھ رہنے پر مجبور ہیں۔ ان میں باہمی ہم آہنگی، رواداری اور حقیقی اسلامی روشن خیالی کی بنیاد پر تعلقات کی بہتری اور قیام امن کے لیے شرعی لائحہ عمل تیار کرنا آج کے دور کا اہم ترین کام تھا۔

مزید برآں نیو ورلڈ آرڈر کے عملی نفاذ اور 9/11 کے واقعہ کے بعد سے مسلمانوں کے خلاف پائی جانے والی نفرت اور عناد اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ قرن اول کو جو کہ فرمان نبوی کے مطابق خیر القرون ہے بنیاد بنا کر موجودہ دور میں غیر مسلموں سے تعلقات و معاہدات کے لیے شرعی لائحہ عمل تیار کیا جائے۔

---

[1] سنن ابی داؤد، کتاب السنۃ، باب لزوم السنۃ (۳۶۰۷) الکتب الستۃ، ص ۱۵۶۱

[2] سنن ابی داؤد، کتاب السنۃ، باب فضل اصحاب النبی (۴۶۵۷) الکتب الستۃ، ص ۱۵۶۵

قرن اول میں غیر مسلموں سے رواداری پر مبنی تعلقات و معاہدات کا تحقیقی تجزیہ اور عصر حاضر میں بین الاقوامی حالات و تعلقات پر ان کا اطلاق تحقیق کی بالکل نئی، منفرد اور انتہائی مفید جہت ہے۔ اللہ تعالیٰ سے امید واثق ہے کہ میرا یہ عنوان

''قرن اول میں مسلمانوں کے غیر مسلموں سے تعلقات و معاہدات اور عصر حاضر''

اسلام کی پر امن تعلیمات اور پر امن بقائے باہمی پر مبنی رویوں کا صحیح عکاس اور غیر مسلموں کے بہت سے اعتراضات اور تحفظات کو ختم کرنے کا سبب بنے گا اور آج کے دور کے مسلمانوں کو بھی غیر مسلموں سے صحیح اسلامی رویہ اپنانے میں راہنمائی فراہم کرے گا۔

وما توفیقی الا باللہ

محمد اسلم صدیقی

۹۔اپریل ۲۰۱۰

باب اول

اسلامی تعلیمات کی روشنی میں غیر مسلم

فصل اول

غیر مسلموں کی مختلف اقسام

فصل دوم

غیر مسلموں سے مسلمانوں کے تعلقات اور اسلامی تعلیمات

فصل اول

غیر مسلموں کی مختلف اقسام

مسلم اور غیر مسلم کی تفریق اسلام کو ماننے یا نہ ماننے کے اعتبار سے ہوئی ہے۔ اللہ کے ہاں قابل قبول دین صرف اور صرف اسلام ہی ہے۔ قرآن میں ارشاد ہوتا ہے:

إِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْإِسْلَامُ[1]

''بے شک اللہ کے ہاں قابل قبول دین اسلام ہی ہے''۔

لہٰذا مسلم اور غیر مسلم کی تعریف جاننے سے پہلے لفظ اسلام کے لغوی اور اصطلاحی معنی معلوم کرنا ضروری ہیں۔

اسلام کے لغوی معنی:

لفظ اسلام کے حروف اصلیہ س، ل، م ہیں۔

یہ باب افعال سے ہے اور اس کے لغوی معنی درج ذیل ہیں:

۱۔ ظاہری و باطنی آلائشوں (آفات) اور عیوب سے پاک خالص و محفوظ ہونا۔

۲۔ صلح و امان

۳۔ سلامتی

۴۔ اطاعت و فرمانبرداری[2]

اصطلاحی معنی:

اس لفظ کے اصطلاحی معنی یوں بیان کیے گئے ہیں:

ومعنی هذه الكلمة الخضوع او الاستسلام (لله) اور اس کلمہ کے معنی اللہ کے لیے جھکنا اور فرماں بردار ہونا ہے۔[3]

مشہور لغت نویس ابن منظور لفظ اسلام کے اصلاحی معنی یوں لکھتے ہیں:

---

[1] آل عمران ۱۹:۳

[2] اردو دائرہ معارف اسلامیہ، دانش گاہ جامعہ پنجاب بذیل مادہ س۔ ل۔ م، ۳۵/۲۱

[3] دائرۃ المعارف الاسلامیہ، دار المعرفہ، بیروت، لبنان، ۱۳۹/۲

والاسلام من الشريعة: اظهار الخضوع و اظهار الشريعة والتزام ما اتى به النبى صلى الله عليه و آله وسلم۔[1]

"اسلام کے شرعی معنی عجز و انکساری کا اظہار، پابندی شریعت اور نبی کریم ﷺ کے لائے ہوئے تمام احکامات پر عمل پیرا ہونا ہے۔"

مسلم کے لغوی معنی:

مسلم اسم فاعل ہے اس کے لغوی معنی ہیں:

دین اسلام کا پیرو : جمع مسلمون[2]

فارسی اور اردو میں مسلمان ج: مسلمانان[3]

مسلم اور مومن کی بحث:

مسلم میں ہر وہ شخص شامل ہے جو اسلام کا دعویٰ کرے خواہ اس کا ایمان دل میں داخل نہ ہو جب کہ مومن اسے کہتے ہیں جو ظاہری اسلام اپنانے کے ساتھ ساتھ دل سے بھی اسلام کی حقانیت کا قائل ہو۔ اس تصور کی بنیاد سورہ الحجرات کی یہ آیت ہے:

قَالَتِ الْأَعْرَابُ آمَنَّا قُل لَّمْ تُؤْمِنُوا وَلَٰكِن قُولُوا أَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْإِيمَانُ فِي قُلُوبِكُمْ[4]

"یہ بدوی کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ان سے کہو تم ایمان نہیں لائے بلکہ یوں کہو کہ ہم مطیع ہو گئے۔ ایمان ابھی تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا ہے۔"

فالمومن مبطن من التصديق مثل ما يظهر والمسلم التام الاسلام مظهر للطاعة مومن بها، والمسلم الذى اظهر الاسلام تعوذا غير مومن فى الحقيقه الا ان حكمه فى الظاهر حكم المسلم۔[5]

ابن منظور کامل مسلم کو مومن اور اسلام کو ظاہری طور پر اپنانے والے پر بھی مسلم کا حکم لگا رہے ہیں۔

مومن اور مسلم دونوں مترادف ہیں۔ سورہ حجرات میں ایمان اور اسلام کے حوالے سے تفریق چند مخصوص بدویوں کے لیے

---

[1] ابن منظور، الافریقی، لسان العرب، دار صادر بیروت ۱۲/۲۹۳

[2] لوئیس معلوف، المنجد، مولانا سعد حسن خان یوسفی (مترجم) دار الاشاعت، کراچی ۱۹۷۵ء، ص ۴۸۸

[3] مولانا محمد رفیع، فرہنگ فارسی، دار الاشاعت کراچی، ۱۹۹۰ء، ص ۲۸۶

[4] الحجرات ۴۹:۱۴

[5] لسان العرب، ج ۱۲، ص ۲۹۴

نازل ہوئی ہے۔ سورہ حجرات کی مذکورہ آیت کے حوالے سے مولانا مودودیؒ لکھتے ہیں:

''اس سے مراد تمام بدوی نہیں ہیں بلکہ یہاں ذکر چند خاص بدوی گروہوں کا ہو رہا ہے جو اسلام کی بڑھتی ہوئی طاقت دیکھ کر محض اس خیال سے مسلمان ہو گئے تھے کہ مسلمانوں کی ضرب سے محفوظ بھی رہیں گے اور اسلامی فتوحات کے فوائد سے متمتع بھی ہوں گے''۔[1]

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں پکے مسلمانوں کے لیے بھی مسلم کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔ ارشاد ہے:

مَا كَانَ إِبْرَاهِيمُ يَهُودِيًّا وَلَا نَصْرَانِيًّا وَلَٰكِن كَانَ حَنِيفًا مُّسْلِمًا[2]

''ابراہیم نہ یہودی تھے نہ نصرانی بلکہ وہ یکسو مسلم تھے''۔

تمام مسلمانوں کے لیے بھی اللہ تعالیٰ نے یہ لفظ استعمال فرمایا ہے:

هُوَ سَمَّاكُمُ الْمُسْلِمِينَ مِن قَبْلُ وَفِي هَٰذَا[3]

''اس نے تمہارا نام پہلے بھی مسلم رکھا تھا اور اس کتاب میں بھی''۔

آپ ﷺ پر وحی کے نزول کی بنا پر حقیقی مسلم اور منافق میں فرق کرنا ممکن تھا مگر اب یہ ممکن نہیں لہٰذا ہر دعویدار کو بشرطیکہ وہ نص سے ثابت شدہ عقائد اور ارکان اسلام میں سے کسی کا انکار نہ کرے مسلم قرار دیا اور سمجھا جائے گا۔

ایمانیات اور ارکان اسلام کی تفصیل نبی کریم ﷺ نے حدیث جبریل میں یوں فرمائی:

عن ابی هريرة قال كان النبی ﷺ بارزا يوما للناس فاتاه رجل فقال: ما الايمان؟ قال: "الايمان ان تومن بالله و ملائكته و بلقاله و برسوله و تومن بالبعث" قال: ما الاسلام؟ قال: الاسلام ان تعبد الله ولا تشرك به و تقيم الصلاة و تؤدی الزكاة المفروضة و تصوم رمضان.[4]

''حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں ایک دن نبی ﷺ لوگوں کے سامنے تشریف فرما تھے کہ آپؐ کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا اور اس نے دریافت کیا یا رسول اللہ ایمان کسے کہتے ہیں؟ آپؐ

---

[1] مودودی، ابوالاعلیٰ، تفہیم القرآن، ادارہ ترجمان القرآن لاہور، ۱۹۷۹ء، ۵/۹۹

[2] آل عمران ۳:۶۷

[3] الحج ۲۲:۷۸

[4] البخاری، محمد بن اسماعیل، الجامع الصحیح للبخاری، کتاب الایمان، باب سوال جبریل النبی عن الایمان والاسلام (۵۰) الکتب الستۃ، دارالسلام للنشر والتوزیع، الریاض السعودیہ، ۱۴۲۹ھ، ص ۶

نے فرمایا ایمان یہ ہے کہ تم اللہ کی ذات پر، فرشتوں پر، روز حشر اللہ کے حضور پیش ہونے پر، اللہ کے رسولوں پر اور مرنے کے بعد دوبارہ اٹھائے جانے پر ایمان لاؤ۔ اس نے مزید سوال کیا کہ اسلام کیا ہے تو آپ نے فرمایا کہ اسلام یہ ہے کہ تم صرف اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک مت ٹھہراؤ نماز قائم کرو اور فرض زکوٰۃ ادا کرو اور رمضان کے روزے رکھو۔''

پھر ایک دوسری حدیث جو فرضیت حج کے بعد کی ہے ارکان اسلام کو یوں بیان فرمایا:

عن ابن عمر قال قال رسول اللہ ﷺ بنی الاسلام علی خمس شھادۃ ان لا الہ الا اللہ و ان محمد رسول اللہ و اقام الصلوۃ و ایتاء الزکاۃ والحج و صوم رمضان[1]

''حضرت عبداللہ بن عمر سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر رکھی گئی ہے۔ اس بات کی گواہی دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ نماز قائم کرنا، زکوٰۃ ادا کرنا، بیت اللہ کا حج اور رمضان کے روزے رکھنا۔''

مذکورہ دونوں حدیثوں کو ملا کر دیکھا جائے تو ایک مومن یا مسلم کے لیے مذکورہ پانچ عقیدوں اور ارکان اسلام کی ادائیگی لازمی قرار دی گئی ہے۔

مذکورہ عقائد اور ارکان اسلام میں سے کسی ایک کا انکار بھی بندے کو اسلام سے خارج کر دیتا ہے۔ البتہ اس وقت دنیا میں مومن کی بجائے صرف مسلم کی اصطلاح مروج ہے۔

اردو دائرہ معارف اسلامیہ کے مطابق یہ اصطلاح بعض یورپی زبانوں میں رواج پا گئی نیز (Moslim)، (Moslem) بطور اسم فاعل یا اسم صفت یا دونوں، اس کے ساتھ ہی (Muhammadan) (مختلف صورتوں میں) بھی مروج ہے۔ اس نے مختلف شکلوں میں لفظ مسلمان کی جگہ لے لی ہے۔[2]

غیر مسلم:

غیر مسلم سے مراد ہر وہ آدمی ہے جو اسلام کے دین برحق ہونے کا مجموعی طور پر یا اس کے مسلمہ عقائد اور ارکان میں سے کسی ایک کا انکار کرے۔ مجموعی طور پر انکار کرنے والے کا نام کافر ہے۔ پھر اس کے کفر اور انکار کی کیفیت کے مطابق اس کو درج ذیل نام دیے جاتے ہیں۔

۱۔ الجامع الصحیح للبخاری، کتاب الایمان، باب دعاؤکم ایمانکم (۸) الکتب الستۃ، ص ۲

۲۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ، ۲۱/۳۵

۱۔ اہل کتاب

ان سے مراد وہ لوگ ہیں جو قرآن مجید میں موجود سابقہ الہامی کتابوں میں سے کسی ایک پر عمل پیرا ہونے کے دعویدار ہیں البتہ قرآن اور نبی کریم ﷺ کی بعثت کا انکار کرتے ہیں۔ جیسے یہود و نصاریٰ۔

قرآن نے ان کے لیے اہل کتاب کا لفظ استعمال کیا ہے:

قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَىٰ كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ [1]

''کہہ دیجئے اے اہل کتاب آ ؤ اس کلمہ کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان برابر ہے۔''

۲۔ شبہ اہل کتاب:

اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو قرآن، تورات، انجیل اور زبور کو نہیں مانتے مگر خود اپنے کسی اور آسمانی کتاب پر ایمان لانے کے مدعی ہیں جیسے صابی جو ایک آسمانی کتاب کے دعویٰ کے باوجود ستاروں کو پوجتے تھے اور مجوس یعنی پارسی جو ایک آسمانی کتاب رکھنے کا دعویٰ کرتے تھے اور ساتھ ہی سورج اور آگ اور دیگر مظاہر قدرت کی پرستش کرتے ہیں ان سے نکاح کرنے اور ان کا ذبیحہ کھانے کی ممانعت ہے باقی سب معاملات میں ان کے ساتھ اہل کتاب کا سا سلوک کیا جاتا ہے۔

علامہ سرخسی کے مطابق:

> ''رسول اللہ ﷺ نے بعض مجوس سے جزیہ لیا تھا۔ اور اسی طرح انہوں نے ہدایت فرمائی تھی کہ ان کی عورتوں سے نکاح اور ان کے ذبائح کی حرمت کے ماسوا دیگر امور میں مجوس کے ساتھ اہل کتاب کا سا سلوک کیا جائے''۔[2]

قرآن مجید نے بھی مجوس اور صابئین کا تذکرہ الگ سے کیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالصَّابِئِينَ وَالنَّصَارَىٰ وَالْمَجُوسَ وَالَّذِينَ أَشْرَكُوا إِنَّ اللَّهَ يَفْصِلُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ ۝ [3]

> ''بے شک جو لوگ ایمان لائے اور جو یہودی ہوئے اور صابی اور نصاریٰ اور مجوس اور جن لوگوں نے شرک کیا ان سب کے درمیان اللہ قیامت کے روز فیصلہ کردے گا۔''

یہاں پر صابی اور مجوس کو اتنگ الگ کیٹگری میں شمار کیا گیا ہے۔

---

[1] آل عمران ۳:۶۴

[2] السرخسی، شمس الدین، محمد بن احمد بن ابی سہل، المبسوط، کتاب السیر، باب صلح الملوک الموادعۃ، بیروت: دار الکتب العلمیہ، ۱۹۹۷ء، ۱۰/۹۸

[3] الحج ۲۲:۱۷

صابی کے نام سے قدیم زمانے میں دو گروہ مشہور تھے ایک حضرت یحییٰ علیہ السلام کے پیروکار جو بالائی عراق (یعنی الجزیرہ) کے علاقے میں اچھی خاصی تعداد میں پائے جاتے تھے اور حضرت یحییٰ علیہ السلام کی پیروی میں اصطباغ کے طریقے پر عمل کرتے تھے۔ دوسرے ستارہ پرست لوگ جو اپنے دین کو حضرت شیث علیہ السلام اور حضرت ادریس علیہ السلام کی طرف منسوب کرتے تھے۔ اور عناصر پر سیاروں کی اور سیاروں پر فرشتوں کی فرماں روائی کے قائل تھے ان کا مرکز حران تھا اور عراق کے مختلف حصوں میں ان کی شاخیں پھیلی ہوئی تھیں۔[1]

مجوسی یعنی ایران کے آتش پرست جو روشنی اور تاریکی کے دو خدا مانتے تھے اور اپنے آپ کو زرتشت کا پیروکار کہتے تھے ان کے مذہب و اخلاق کو مزدگ کی گمراہیوں نے بری طرح مسخ کر کے رکھ دیا تھا حتیٰ کہ سگی بہن سے نکاح تک رواج پا گیا تھا۔[2]

کفار و مشرکین:

وہ لوگ جن کے پاس کوئی آسمانی کتاب نہیں ہے اور نہ ہی وہ اس کے دعویدار ہیں اور وہ خدا کے ساتھ بہت سی چیزوں کو شریک ٹھہراتے تھے اور وہ اپنے آپ کو مذکورہ گروہوں میں سے کسی کے ساتھ نہیں جوڑتے انہیں مشرکین کہا جاتا ہے۔
اگرچہ شرک کسی نہ کسی انداز میں مذکورہ گروہوں میں بھی موجود ہے۔ لیکن ان کو ان سے نمایاں اور الگ کرنے کے لیے علیحدہ نام دیا گیا ہے۔

مرتدین:

مرتدین مرتد کی جمع ہے یہ اِرْتَدَّ یَرْتَدُّ ارتداد سے اسم فاعل ہے اس کے لغوی معنی ہیں لوٹ جانے والا، پھر جانے والا۔

اردو دائرہ معارف اسلامیہ کے مطابق:

ارتداد کا مادہ ر۔د۔د ہے۔ یہ باب افتعال سے اسم مصدر ہے۔ ارتداد کے لغوی معنی لوٹ جانے اور پھر جانے کے ہیں۔
کتب لغت میں ہے ارتد من دینہ وہ اپنے دین سے پھر گیا۔[3]

شرعی اصطلاح میں مرتد سے مراد ایسا شخص جو مسلمان ہو اور پھر اسلام سے پھر کر کوئی دوسرا مذہب اختیار کرے۔ دوسرے لفظوں میں دین اسلام کا پیروکار اسلام کا طریقہ چھوڑ کر کسی دوسرے دین کی طرف چلا جائے تو ایسے شخص کو مرتد کہا جاتا ہے۔ الشیخ الامام مجد الدین ابی البرکات مرتد کی تعریف یوں کرتے ہیں:

---

[1] تفہیم القرآن، ۳/ ۲۱۰

[2] ایضاً ص ۲۱۱

[3] اردو دائرہ معارف اسلامیہ، ۳۶۶/۲۰

وھو الکافر بعد اسلامہ، فمن اشرک باللّٰہ او جحد ربوبیتہ، او صفۃ من صفاتہ او بعض کتابہ او رسلہ او سبّ اللہ او رسولہ فقد کفر[1]

''مرتد اسلام قبول کرنے کے بعد انکار کرنے والا ہے پس جس نے بھی اللہ کے ساتھ شرک کیا یا اس کی ربوبیت یا کسی صفت یا کسی کتاب یا رسول کا انکار کیا یا اللہ کو یا اس کے رسول کو گالی دی تو اس نے کفر کیا۔''

---

[1] ابوالبرکات، مجدالدین، امام، المحرر فی الفقہ، دار الکتاب العربی، بیروت، لبنان ۱۳۶۹ھ، ۲/ ۱۶۷

غیر مسلم جماعت کی تقسیم

دارالاسلام کی حدود یا حدود سے باہر غیر مسلم یا کافر جماعت کا مسلمانوں کے ساتھ مندرجہ ذیل صورتوں میں کسی ایک صورت میں ضرور واستوار ہوتا ہے۔ اس لیے اسلام نے ان سب کے لیے الگ الگ احکامات دیے ہیں۔

ا۔ متحارب غیر مسلم:

ان سے مراد وہ غیر مسلم ہیں جو اسلام کے اقتدار اعلیٰ کے خلاف حالت جنگ میں ہوتا ہے وہ عالم اسلام یا اس کے مجموعی مرکز یا پھر آج کے دور میں کسی اسلامی مملکت کے ساتھ برسرپیکار ہو تو ایسے غیر مسلموں کے خلاف جہاد فرض ہو جاتا ہے۔ قرآن و حدیث میں ان کا مقابلہ کرنے سے متعلق احکامات موجود ہیں۔ غیر مسلموں سے متعلق شدت پر مبنی آیات اور احادیث کا ہدف بھی ایسے ہی غیر مسلم ہوتے ہیں۔

وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ [1]

"اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں"

غیر متحارب غیر معاہد:

ان سے مراد وہ غیر مسلم ہیں جو مسلمانوں سے کسی قسم کا معاندانہ رویہ نہیں رکھتے یا عالم اسلام میں سے کسی ملک کے خلاف بھی برسرپیکار نہیں ہیں اور ان سے کسی قسم کا معاہدہ بھی مسلمان نہیں رکھتے ایسے غیر مسلموں سے مسلمان بھی پر امن رویہ رکھنے کے پابند ہوتے ہیں۔

لَا يَنْهَاكُمُ اللَّهُ عَنِ الَّذِينَ لَمْ يُقَاتِلُوكُمْ فِي الدِّينِ وَلَمْ يُخْرِجُوكُم مِّن دِيَارِكُمْ أَن تَبَرُّوهُمْ وَتُقْسِطُوا إِلَيْهِمْ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ ○ [2]

"جن لوگوں نے تم سے دین کے بارے میں جنگ نہیں کی اور نہ تم کو تمہارے گھروں سے نکالا ان کے ساتھ بھلائی اور انصاف کا سلوک کرنے سے خدا تم کو منع نہیں کرتا خدا تو انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔"

---

[1] البقرہ ۲:۱۹۰

[2] الممتحنہ ۶۰:۸

غیر متحارب معاہد:

ان سے مراد وہ غیر مسلم ہیں جو مسلمانوں سے برسر پیکار نہیں ہیں اور نہ ہی کوئی معاندانہ رویہ رکھتا ہیں بلکہ مسلمانوں کے ساتھ کوئی معاہدہ کیے ہوئے ہیں۔ تو ایسے لوگوں سے مسلمانوں پرامن رویہ رکھنے کے ساتھ ساتھ ان سے کیے معاہدات کی پاسداری کے بھی پابند ہیں۔

أَوْفُوا بِالْعَهْدِ إِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْؤُولاً[۱]

اسلامی حکومت کی غیر مسلم اقلیتیں:

اسلامی حکومت کے ماتحت غیر مسلم اقلیتوں کی قانونی اعتبار سے تین قسمیں ہیں۔

۱۔ معاہد:

وہ غیر مسلم رعایا جو کسی معاہدہ کے ذریعے سے اسلامی حکومت کو قبول کرے اور جنگ کی نوبت ہی نہ آئے۔ یہ فقہی اصطلاح میں معاہدین کہلاتے ہیں۔ اسلامی حکومت کے زیرنگین آنے کے وقت جو بھی معاہدہ ہوا ہو اسلامی حکومت اس میں کسی قسم کا ردوبدل کرنے کی مجاز نہیں ہوتی۔ جو مراعات یا حقوق بوقت معاہدہ طے پائیں وہ پورے کرنا لازمی ہوتے ہیں۔

معاہد! وہ غیر مسلم رعایا جو کسی عہد و پیان کے ذریعے بغیر جنگ کیے اسلامی حکومت کے زیرنگین آ جائے معاہد کہلاتی ہے۔

ابن اثیر اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

المعاهد، من كان بينك و بينه عهد و اكثر ما يطلق في الحديث على اهل الذمة و قد يطلق على غيرهم من الكفار اذا صولحوا على ترك الحرب مدة ما[۲]

''معاہد وہ ہے کہ تمہارے اور اس کے درمیان عہد و پیان ہو۔ حدیث میں اس کا زیادہ تر اطلاق ذمیوں پر ہوتا ہے ان کے علاوہ یہ ان غیر مسلموں کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے جن سے کسی مدت تک کے لیے جنگ کی صلح ہو جائے۔''

۲۔ ذمی:

وہ لوگ یا جماعت جو اسلام کے اقتدار اعلیٰ سے شکست کھا کر یا کسی دوسرے عوارض کی بناء پر اپنے متوازی نظام کو چھوڑ کر اسلام کے سیاسی و معاشی نظام کو قبول کر لیتی ہے اور اس کے اقتدار اعلیٰ کی سرپرستی منظور کر لیتی ہے وہ ذمی کہلاتی ہے۔ الدکتور عبدالکریم زیدان ان کی تعریف یوں بیان کرتے ہیں:

۱۔ بنی اسرائیل ۱۷:۳۴

۲۔ ابن اثیر، مجد الدین، ابوالسعادات، المبارک بن محمد الجزری النہایہ فی غریب الحدیث، المطبعہ عثمانیہ مصر، ۱۳۶۱ھ، ۱۴۱/۳

هم المعاهدون من النصاری والیهود وغیرهم ممن یقیم فی دار السلام [1]

''وہ یہود ونصاریٰ اوران کے علاوہ جو بھی دارالسلام میں اقامت اختیار کرے ہیں۔''

ذمی جزیہ کی ادائیگی پر جان و مال کے تحفظ کی ضمانت حاصل کرتے ہیں۔ جزیہ کی تعریف ابن منظور نے یوں کی ہے:

والجزیة ما یوخذ من اهل الذمه وهی عبارة عن المال الذی یعقد الکتابی علیه الذمة. [2]

''جزیہ کی ادائیگی کے بعد ان کے جان و مال کے تحفظ کی ذمہ داری اسلامی حکومت کے فرائض میں شامل ہوتی ہے۔ اوران سے جزیہ لینے کے بعد انہیں کسی بھی طرح پریشان یا ستانے کا کوئی حق حکومت نہیں رکھتی۔''

جزیہ صرف ان لوگوں پر ہوگا جو اہل قتال ہوں۔ بچے، عورتیں، اپاہج، بوڑھے، بیمار وغیرہ اس سے مستثنیٰ ہوں گے۔ [3]

مستامن:

دارالحرب کے حربی یا معاہد جماعتوں کے اگر بعض افراد تجارت یا وقتی ضروریات کے لیے خلیفہ یا اس کے عمال کی اجازت سے دارالاسلام میں آئیں اور چند روز قیام کرتے ہیں تو ان کو مستامن کہا جاتا ہے۔ **الموسوعة الفقهية** میں مستامن کی تعریف یوں بیان کی گئی ہے:

من یدخل اقلیم غیره بامان مسلماً کان ام حربیاً [4]

حربی مستامن کے لیے ارشاد ہے:

وَإِنْ أَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِينَ اسْتَجَارَكَ فَأَجِرْهُ حَتَّىٰ يَسْمَعَ كَلَامَ اللَّهِ ثُمَّ أَبْلِغْهُ مَأْمَنَهُ [5]

''اوراگر مشرکین میں سے کوئی آپ سے پناہ چاہے تو اسے پناہ دے یہاں تک کہ وہ کلام الٰہی سنے پھر اسے جائے پناہ تک پہنچا دو۔''

---

[1] زیدان، عبدالکریم، ڈاکٹر۔ احکام الذمیین والمستامنین فی دارالاسلام، مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت، لبنان ۱۴۰۸ھ/۱۹۸۸م

[2] لسان العرب، ۱۴/۱۴۷

[3] الکاسانی، علاء الدین ابوبکر بن مسعود، بدائع الصنائع، ۷/ ۱۱۱

[4] الموسوعۃ الفقہیۃ، وزارت والشئون الاسلامیہ، الکویت ۱۴۱۸ھ/۱۹۹۷ء، ۳۷/۱۶۸

[5] التوبہ ۹:۶

اہل ذمہ:

اس سے مراد وہ (اقلیت) ہے جو نہ تو جنگ کے ذریعہ اور نہ ہی صلح یا معاہدہ کے ذریعہ اسلامی حکومت کی رعایا بنے ہوں۔ بلکہ کسی بھی دوسری صورت میں اسلامی قلمرو میں شامل ہوئے ہوں، مثلاً ہجرت کر کے یہاں آباد ہوئے ہوں یا تجارتی مقاصد سے آئے ہوں اور وہیں آباد ہو گئے ہوں تمام اہل ذمہ جو کسی بھی مسلمان حکومت کے شہری ہوں ان کے لیے فقہائے اسلام نے حقوق متعین کر دیے ہیں۔

> ''امام ابو یوسف نے ہارون کو اقلیتوں کے بارے میں لکھا **لا یظلموا ولا یؤذوا ولا یکلفوا فوق طاقتھم**۔''[۱]
>
> ''ان پر نہ ظلم کیا جائے اور نہ ہی انہیں تکلیف دی جائے۔ ان کی طاقت سے بڑھ کر ان پر بوجھ نہ ڈالا جائے۔''

الماوردی نے الاحکام السلطانیہ میں محتسب کے فرائض گنواتے ہوئے لکھا ہے کہ اس پر یہ لازم ہے کہ اگر خدانخواستہ کوئی عاقبت نا اندیش مسلمان کسی بھی اقلیتی فرد سے زیادتی کا مرتکب ہو تو وہ اسے سزا دے اور کسی بھی اقلیتی افراد سے زیادتی نہ کرنے دے۔[۲]

---

۱ ابو یوسف، یعقوب بن ابراہیم۔ کتاب الخراج، دار المعرفہ، بیروت، لبنان، س ن، ۱۲۲، ۱۲۵

۲ الماوردی، ابوالحسن علی بن محمد۔ الاحکام السلطانیہ، بیروت، لبنان، ۱۹۸۰ء، ص ۲۲۷

تعلقات و معاہدات کے حوالے سے دنیا کی تقسیم

اسلامی حکومتوں کو عہد نبوی سے لے کر اب تک دوست، دشمن دونوں قسم کی حکومتوں سے سابقہ پڑا ہے۔ قرون اولیٰ کے فقہاء اسلام نے کتاب وسنت کی تعلیمات کی روشنی میں دنیا کو دارالحرب، دارالاسلام اور دارالعہد کی اصطلاحات میں تقسیم کیا ہوا تھا اور پھر ان کے حوالے سے تفصیلی احکامات دیے تھے۔ آج کے دور میں اگرچہ اس لحاظ سے تقسیم ممکن نہیں رہی تاہم غیر مسلموں سے تعلقات و معاہدات کے حوالے سے اسلامی تعلیمات سے آگاہی کے لیے ان اصطلاحات کا جاننا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

ذیل میں ان اصطلاحات کی تعریفات پیش کی جاتی ہیں:

دارالاسلام:

فقہاء کرام کی اصطلاح میں دارالاسلام سے مراد ایک ایسی باقاعدہ منظم ریاست یا ملک ہے جس کا سربراہ مسلمان ہو اور جہاں اسلامی شریعت کے احکام عملی طور پر نافذ ہوں۔[1]

دارالحرب:

دارالحرب سے مراد دشمنان اسلام کا وہ علاقہ یا وہ ملک ہے جس کے باشندے دعوت اسلام کو مسترد کر کے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف سرکشی اور عداوت کا اظہار کریں۔ اور جہاں اہل اسلام اور اہل ذمہ کی عبادت گاہیں محفوظ نہ ہوں۔[2]

دارالعہد:

فقہاء اسلام کی اصطلاح میں دارالعہد سے مراد ایسا علاقہ ہے جو دارالاسلام کے امام وقت یا اس کے نائب کے ساتھ بعض شرائط پر امن اور صلح کا معاہدہ طے کرے۔

ان کے افراد کو کافر ہونے کے باوجود "معاہد" اور "مسالم" کہا جاتا ہے۔[3]

---

[1] اردو دائرہ معارف اسلامیہ، دانش گاہ پنجاب، لاہور، ۱۹۷۳ء، ۹/۱۰۲

[2] ایضاً، ص ۱۱۰

[3] ایضاً، ص ۱۳۳

فصل دوم

غیر مسلموں سے مسلمانوں کے تعلقات اور اسلامی تعلیمات

اسلام ایک عالمی دین ہے یہ تمام انسانوں کو دنیا وآخرت کی کامیابی کی راہ دکھاتا ہے۔ اس کا خطاب کسی خاص قوم، گروہ یا طبقے کے لیے نہیں بلکہ انسانوں کے تمام طبقات سے ہے۔ جیسا کہ ارشاد خداوندی ہے:

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا ۨ الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ......[1]

(اے محمد) کہہ دو کہ اے لوگو میں تم سب کی طرف خدا کا بھیجا ہوا (رسول) ہوں جو آسمانوں اور زمینوں کا بادشاہ ہے۔

جس دین کا خطاب انسانیت کے تمام طبقات سے ہو جس کا نعرہ پورے عالم کی فلاح ونجات ہو وہ کسی طبقہ سے نفرت اور عداوت کا سبق کیوں کر دے سکتا ہے۔ ذیل میں قرآن وسنت کے حوالے سے اس بات کا جائزہ لیا جاتا ہے۔

قرآن کی روشنی میں غیر مسلموں سے تعلقات:

قرآن مجید پوری انسانیت کے لیے اللہ کا آخری پیغام ہے۔ یہ احترام انسانیت اور احترام مذہب کا درس دیتا ہے۔

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بنی آدم[2]

''ہم نے بنی آدم کو عزت بخشی ہے''۔

قرآن مجید میں دوسرے مذاہب کے معبودوں کو برا کہنے کی ممانعت ہے۔

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ......[3]

''جو لوگ اللہ کے سوا پکارتے ہیں انہیں گالی مت دو''

قرآن مجید میں غیر مسلموں کے ساتھ عفو ودرگزر، رواداری اور خیر خواہی پر مبنی رویے کی تلقین کی گئی ہے۔ ارشاد ہے:

خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ[4]

''معافی کی روش اپنایئے اور معروف کی تلقین کیجیے''۔

---

[1] الاعراف ۷:۱۵۸

[2] الاسراء ۱۷:۷۰

[3] الانعام ۶:۱۰۸

[4] الاعراف ۷:۱۹۹

فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِيْلَ ۱؎

''ان سے اچھی طرح درگزر کیجیے''۔

قرآن کی اتباع ہی میں چونکہ دنیا و آخرت کی فلاح مضمر ہے اس لیے یہ اپنے پیروکاروں کو غیر مسلموں کو حکمت موعظہ حسنہ اور مجادلہ احسن کے ساتھ دعوت دینے کی تلقین کرتا ہے اور جبر و اکراہ سے روکتا ہے۔

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۲؎

قرآن مجید میں دوسری جگہ ارشاد ہے:

اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُم بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ۳؎

قرآن مجید میں غیر مسلموں سے رواداری، ہمدردی، معافی اور خیر خواہی کا رویہ رکھنے کے ساتھ ساتھ دوستی نہ رکھنے بلکہ سخت رویہ رکھنے اور جہاد و قتال کا حکم بھی ہے۔ جن کا مطالعہ اگر ان آیات کا پس منظر دیکھے بغیر یا غیر مسلموں سے متعلق جملہ آیات کو مدنظر رکھے بغیر کیا جائے تو غلط فہمی کا سبب بھی بن سکتا ہے۔

ذیل میں ان دونوں قسم کی آیات کو پیش نظر رکھ کر غیر مسلموں سے تعلقات کا جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصَارٰى اَوْلِيَاءَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَاءُ بَعْضٍ وَمَن يَتَوَلَّهُم مِّنكُمْ فَاِنَّهُ مِنْهُمْ اِنَّ اللهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِيْنَ ○ ۴؎

''اے ایمان والو تم یہود و نصاریٰ کو اپنا دوست نہ بناؤ۔ وہ آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں اور جو تم میں سے ان کو دوست بنائے گا وہ انہی میں سے ہے اللہ ظالموں کو راہ یاب نہیں کرتا''۔

اس آیت میں بہت وضاحت کے ساتھ مسلمانوں کو یہود و نصاریٰ کے ساتھ دوستی قائم کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ اس حکم کے اطلاق کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ اسے عام حکم مانا جائے یعنی اس کا اطلاق ہر زمانے اور ہر علاقے کے مسلمانوں اور یہود و نصاریٰ پر کیا جائے۔ دوسرے یہ کہ اسے خاص حکم مانا جائے یعنی اس کا اطلاق خاص زمانے اور خاص علاقے کے مسلمانوں اور یہود و نصاریٰ پر کیا جائے۔ اگر ہم اسے عام حکم مانیں تو اس آیت کا قرآن کی بعض دوسری آیات سے تضاد اور تصادم ہو جاتا ہے۔

لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِيْنَ آمَنُوا الْيَهُوْدَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا وَلَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِيْنَ آمَنُوا الَّذِيْنَ قَالُوْا اِنَّا نَصَارٰى ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيْسِيْنَ وَرُهْبَانًا وَّاَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ○ ۵؎

۱؎ الحجر ۸۵:۱۵

۲؎ البقرہ ۲۵۶:۲

۳؎ النحل ۱۲۵:۱۶

۴؎ المائدہ ۵۱:۵

۵؎ المائدہ ۸۲:۵

''تم اہل ایمان کی عداوت میں سب سے زیادہ سخت یہود اور مشرکین کو پاؤ گے اور ایمان لانے والوں کے لیے دوستی میں قریب تر ان لوگوں کو پاؤ گے جنہوں نے کہا تھا کہ ہم نصاریٰ ہیں یہ اس وجہ سے کہ ان میں عبادت گزار عالم اور تارک الدنیا فقیر پائے جاتے ہیں اور ان میں غرور نفس نہیں ہے۔''

مذکورہ آیت میں نصاریٰ کے ساتھ دوستی سے منع کیا گیا ہے۔ جب کہ اس آیت میں ان کی تحسین کی گئی ہے اور انہیں دوستی کے لحاظ سے مسلمانوں سے قریب تر قرار دیا گیا ہے۔ سورہ المائدہ میں دوستی کا دائرہ مزید بڑھایا ہے۔ ارشاد ہے:

اَلْيَوْمَ أُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبَاتُ وَطَعَامُ الَّذِيْنَ أُوتُوا الْكِتَابَ حِلٌّ لَّكُمْ وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ الْمُؤْمِنَاتِ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ أُوتُوا الْكِتٰبَ مِن قَبْلِكُمْ إِذَا آتَيْتُمُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسَافِحِيْنَ وَلَا مُتَّخِذِىْ أَخْدَانٍ وَمَن يَكْفُرْ بِالْإِيْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهُ وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ O[۱]

''آج تمہارے لیے ساری پاک چیزیں حلال کر دی گئی ہیں۔ اہل کتاب کا کھانا تمہارے لیے حلال ہے اور تمہارا کھانا ان کے لیے اور محفوظ عورتیں بھی تمہارے لیے حلال ہیں خواہ وہ اہل ایمان کے گروہ سے ہوں یا ان قوموں میں سے جن کو تم سے پہلے کتاب دی گئی تھی۔ بشرطیکہ تم ان کے مہر ادا کر کے نکاح میں ان کے محافظ بنو، نہ یہ کہ آزاد شہوت رانی کرنے لگو یا چوری چھپے آشنائیاں کرو۔ اور جو کسی نے ایمان کی روش پر چلنے سے انکار کیا تو اس کا سارا کارنامہ زندگی ضائع ہو جائے گا اور وہ آخرت میں دیوالیہ ہوگا۔''

اس آیت میں یہود و نصاریٰ کا کھانا کھانا جائز قرار دیا گیا ہے جس کا مطلب ہے کہ ان کا ذبیحہ بھی حلال ہے اور ہم ان کے ساتھ ایک ہی دسترخوان پر بیٹھ کر کھانا کھا سکتے ہیں اور یہ عمل بغیر معاشرتی روابط اور دوستانہ مراسم کے ممکن نہیں ہے۔

مولانا مودودی اس آیت کی وضاحت میں لکھتے ہیں:

''اہل کتاب کے کھانے میں ان کا ذبیحہ بھی شامل ہے۔ ہمارے لیے ان کا اور ان کے لیے ہمارا کھانا حلال ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے اور ان کے درمیان کھانے پینے میں کوئی رکاوٹ اور چھوت چھات نہیں ہے ہم ان کے ساتھ کھا سکتے ہیں اور وہ ہمارے ساتھ۔''[۲]

اسی طرح یہود و نصاریٰ کی خواتین کو رشتہ ازدواج میں منسلک کرنے کی اجازت بھی اس آیت میں دی گئی ہے اور کسی عیسائی خاتون کا کسی مسلمان مرد کی بیوی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس کی رفیقہ حیات اس کے بچوں کی ماں، اس کے گھر کی نگران، اس کا لباس ہوگی اور اس کے یہودی یا عیسائی والدین اس کے ساس اور سسر قرار پائیں گے جو اس کے لیے والدین کا درجہ رکھتے ہوں گے اور یہ سب انس و محبت تعلق اور دوستی کے بغیر ممکن کیونکر ہو سکتے ہیں؟

---

۱ المائدہ ۵:۵

۲ تفہیم القرآن، ۱/۴۴۷

مسلمانوں پر اسلام کی دعوت پوری دنیا کو حکمت اور شائستگی کے ساتھ دینا لازم ہے۔ البتہ اہل کتاب کے لیے خاص طور پر بھی حکم ہے۔

وَلَا تُجَادِلُوٓا أَهْلَ الْكِتٰبِ إِلَّا بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ ؁

''اور اہل کتاب سے بحث نہ کرو مگر عمدہ طریقے سے''۔

قرن اول سے مسلمانوں کا وطیرہ دوسری اقوام کے ساتھ یہی رہا ہے کیونکہ کوئی بھی قوم دوستانہ روابط کے بغیر سنجیدگی سے بات سننے پر آمادہ نہیں ہو سکتی۔ نبی اکرم ﷺ کے زمانے کے وہ اہل کتاب جو آپ کے دوستانہ رویہ اور معاہدات کے باوجود دشمنی سے باز نہ آئے تھے ان کے ساتھ سورہ مائدہ کی اس آیت کو خاص سمجھنا ہی اس تناقض کو دور کر دیتا ہے۔

آپ کے دور کے بیشتر یہود و نصاریٰ منافقین اور مشرکین عرب کے ساتھ مل کر مسلمانوں کے خلاف سازشوں میں ملوث ہو گئے تھے اور آپ ﷺ کو گھر سے نکلتے وقت یہودیوں کی طرف سے حملے کا خطرہ رہتا تھا ایک عرصہ تک وہ در پردہ مسلمانوں کے خلاف برسرپیکار رہے اور پھر معاہدات کو توڑ کر کھلم کھلا آمادہ جنگ ہو گئے۔ ان حالات میں یہود و نصاریٰ سے دوستی سے منع کیا گیا۔ اس کے علاوہ سورہ آل عمران میں بھی اہل کتاب کو محرم راز بنانے سے اس لیے روکا گیا ہے کہ وہ غیر مخلص اور قلبی عناد رکھنے والے ہیں:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ لَا يَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا ۭ وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ ۚ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَاۗءُ مِنْ اَفْوَاهِھِمْ ښ وَمَا تُخْفِيْ صُدُوْرُھُمْ اَكْبَرُ ۭ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝؂

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو اپنی جماعت کے لوگوں کے سوا دوسروں کو اپنا راز دار نہ بناؤ وہ تمہاری خرابی کے کسی موقع سے فائدہ اٹھانے میں نہیں چوکتے تمہیں جس چیز سے نقصان پہنچے وہی ان کو محبوب ہے ان کے دل کا بغض ان کے منہ سے نکلا پڑتا ہے اور جو کچھ وہ اپنے سینوں میں چھپائے ہوئے ہیں وہ اس سے شدید تر ہے ہم نے تمہیں صاف صاف ہدایات دے دی ہیں اگر تم عقل رکھتے ہو۔''

اہل کتاب کا اسلام کے شعائر اور تعلیمات کا مذاق اڑانا بھی دوستی سے منع کرنے کا سبب بنا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَكُمْ هُزُوًا وَّلَعِبًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَالْكُفَّارَ اَوْلِيَاۗءَ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ وَاِذَا نَادَيْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ اتَّخَذُوْهَا هُزُوًا وَّلَعِبًا ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُوْنَ ۝ قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ هَلْ تَنْقِمُوْنَ مِنَّآ اِلَّآ اَنْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلُ ۙ وَاَنَّ اَكْثَرَكُمْ فٰسِقُوْنَ ۝؃

؁ العنکبوت ۲۹:۴۶

؂ آل عمران ۳:۱۱۸

؃ المائدہ ۵:۵۷-۵۹

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو تمہارے پیش رو اہل کتاب میں سے جن لوگوں نے تمہارے دین کو مذاق اور تفریح کا سامان بنا لیا ہے، انہیں اور دوسرے کافروں کو اپنا دوست اور رفیق نہ بناؤ۔ اللہ سے ڈرو اگر تم مومن ہو جب تم نماز کے لیے منادی کرتے ہو تو وہ اس کا مذاق اڑاتے اور اس سے کھیلتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ عقل نہیں رکھتے۔ ان سے کہو اے اہل کتاب تم جس بات پر ہم سے بگڑے ہو وہ اس کے سوا اور کیا ہے کہ ہم اللہ پر اور دین کی اس تعلیم پر ایمان لے آئے ہیں جو ہماری طرف نازل ہوئی ہے اور ہم سے پہلے بھی نازل ہوئی تھی اور تم میں سے اکثر لوگ فاسق ہیں''۔

دوسری جگہ سورۃ المائدہ میں ہی ان کے منافقانہ اور اسلام دشمنی پر مبنی طرز عمل کو یوں واضح کیا گیا:

وَإِذَا جَاءُوكُمْ قَالُوا آمَنَّا وَقَد دَّخَلُوا بِالْكُفْرِ وَهُمْ قَدْ خَرَجُوا بِهِ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا كَانُوا يَكْتُمُونَ ۝ وَتَرَىٰ كَثِيرًا مِّنْهُمْ يُسَارِعُونَ فِي الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَأَكْلِهِمُ السُّحْتَ لَبِئْسَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝ لَوْلَا يَنْهَاهُمُ الرَّبَّانِيُّونَ وَالْأَحْبَارُ عَن قَوْلِهِمُ الْإِثْمَ وَأَكْلِهِمُ السُّحْتَ لَبِئْسَ مَا كَانُوا يَصْنَعُونَ ۝[1]

''جب یہ تم لوگوں کے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے حالانکہ کفر لیے ہوئے آئے تھے اور کفر ہی لیے ہوئے واپس گئے اور اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ یہ دلوں میں چھپائے ہوئے ہیں۔ تم دیکھتے ہو کہ ان میں سے بکثرت لوگ گناہ اور ظلم و زیادتی کے کاموں میں دوڑ دھوپ کرتے پھرتے ہیں اور حرام کے مال کھاتے ہیں بہت بری حرکات ہیں جو یہ کر رہے ہیں کیونکہ ان کے علماء اور مشائخ انہیں گناہ پر زبان کھولنے اور حرام کھانے سے نہیں روکتے۔ یقیناً بہت ہی برا کارنامہ زندگی ہے جو وہ تیار کر رہے ہیں۔''

یہی وہ پس منظر ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے جزیرہ نمائے عرب کے ان اہل کتاب کے بارے میں یہ حتمی فیصلہ نازل فرمایا:

قَاتِلُوا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَلَا يُحَرِّمُونَ مَا حَرَّمَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَلَا يَدِينُونَ دِينَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ حَتَّىٰ يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَن يَدٍ وَهُمْ صَاغِرُونَ ۝[2]

''جنگ کرو اہل کتاب میں سے ان لوگوں کے خلاف جو اللہ اور روز آخر پر ایمان نہیں لاتے اور جو کچھ اللہ اور اس کے رسول نے حرام قرار دیا ہے اسے حرام نہیں کرتے اور دین حق کو اپنا دین نہیں بناتے (ان سے لڑو) یہاں تک کہ وہ اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں اور چھوٹے بن کر رہیں۔''

عرب کے اہل کتاب نے جان بخشی کی اس رعایت کے باوجود معاندانہ سرگرمیاں جاری رکھیں تو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانہ خلافت میں نبی اکرم ﷺ کے اس فرمان کو نافذ کر دیا:

---

[1] المائدہ ۵: ۶۱۔۶۳

[2] التوبہ ۹: ۲۹

لا یجتمع دینان فی جزیرۃ العرب[1]

''جزیرہ عرب میں دو دین اکٹھے نہ رہیں گے''

سورہ توبہ میں کفار، منافقین اور مشرکین کے ساتھ جہاد، قتال اور سختی کا حکم اسی لیے دیا گیا:

فَإِذَا انسَلَخَ الْأَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ حَيْثُ وَجَدتُّمُوهُمْ وَخُذُوهُمْ وَاحْصُرُوهُمْ وَاقْعُدُوا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ فَإِن تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ فَخَلُّوا سَبِيلَهُمْ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ○ [2]

''(مہلت کے چار مہینے گزرنے کے بعد) پس جب حرام مہینے گزر جائیں تو مشرکین کو قتل کرو جہاں پاؤ اور انہیں پکڑو اور گھیرو اور ہر گھات میں ان کی خبر لینے کے لیے بیٹھو پھر اگر وہ توبہ کر لیں اور نماز قائم کریں اور زکوۃ دیں تو انہیں چھوڑ دو۔ اللہ مغفرت کرنے والا اور انتہائی رحم کرنے والا ہے''۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْمُشْرِكُونَ نَجَسٌ ...... [3]

''اے ایمان والو مشرکین ناپاک ہیں''۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِينَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ وَمَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ ○ [4]

''اے نبی کفار اور منافقین دونوں کا پوری قوت سے مقابلہ کرو اور ان کے ساتھ سختی سے پیش آؤ آخرکار ان کا ٹھکانہ جہنم ہے اور وہ بدترین جائے قرار ہے۔''

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قَاتِلُوا الَّذِينَ يَلُونَكُم مِّنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوا فِيكُمْ غِلْظَةً وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُتَّقِينَ ○ [5]

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو جنگ کرو ان منکرین حق سے جو تم سے قریب ہیں اور چاہیے کہ وہ تمہارے اندر سختی پائیں اور جان لو کہ اللہ متقیوں کے ساتھ ہے''۔

مذکورہ آیات سورۃ التوبہ کی ہیں جو جہاد کی سورۃ ہے۔ کفار، منافقین اور مشرکین نے یہود و نصاریٰ کے ساتھ مل کر ایسے حالات پیدا کر دیے تھے کہ اب ان کے ساتھ جنگ اور سخت رویہ کے سوا چارہ ہی نہ رہا تھا۔ قرآن مجید میں ان سنگین حالات کا ذکر یوں ملتا ہے:

---

[1] موطا امام مالک، کتاب الجامع، باب اجلاء الیہود من المدینۃ، دار الفکر، بیروت، لبنان، ۱۹۸۹ء، حدیث رقم: ۱۳۸۸

[2] التوبہ ۹:۵

[3] التوبہ ۹:۲۸

[4] التوبہ ۹:۷۳

[5] التوبہ ۹:۱۲۳

كَيْفَ وَإِن يَظْهَرُوا عَلَيْكُمْ لَا يَرْقُبُوا فِيكُمْ إِلًّا وَلَا ذِمَّةً يُرْضُونَكُم بِأَفْوَاهِهِمْ وَتَأْبَىٰ قُلُوبُهُمْ وَأَكْثَرُهُمْ فَاسِقُونَ ۝ اشْتَرَوْا بِآيَاتِ اللَّهِ ثَمَنًا قَلِيلًا فَصَدُّوا عَن سَبِيلِهِ إِنَّهُمْ سَاءَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝ لَا يَرْقُبُونَ فِي مُؤْمِنٍ إِلًّا وَلَا ذِمَّةً وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُعْتَدُونَ ۝ فَإِن تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ فَإِخْوَانُكُمْ فِي الدِّينِ وَنُفَصِّلُ الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ۝ وَإِن نَّكَثُوا أَيْمَانَهُم مِّن بَعْدِ عَهْدِهِمْ وَطَعَنُوا فِي دِينِكُمْ فَقَاتِلُوا أَئِمَّةَ الْكُفْرِ إِنَّهُمْ لَا أَيْمَانَ لَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَنتَهُونَ ۝ أَلَا تُقَاتِلُونَ قَوْمًا نَّكَثُوا أَيْمَانَهُمْ وَهَمُّوا بِإِخْرَاجِ الرَّسُولِ وَهُم بَدَءُوكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ أَتَخْشَوْنَهُمْ فَاللَّهُ أَحَقُّ أَن تَخْشَوْهُ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ۝[1]

''ان لوگوں کے ساتھ عہد و پیمان کیسے باقی رہ سکتا ہے جن کا حال یہ ہے کہ تم پر قابو پا جائیں تو نہ تمہارے معاملے میں کسی قرابت کا لحاظ کریں نہ کسی معاہدہ کی ذمہ داری کا۔ وہ اپنی زبانوں سے تم کو راضی کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر دل ان کے انکار کرتے ہیں اور ان میں سے اکثر فاسق ہیں انہوں نے اللہ کی آیات کے بدلے تھوڑی سی قیمت قبول کر لی پھر اللہ کے راستے میں سدِ راہ بن کر کھڑے ہو گئے بہت برے کرتوت تھے جو یہ کرتے رہے۔ کسی مومن کے معاملہ میں نہ یہ قرابت کا لحاظ کرتے ہیں اور نہ کسی عہد کی ذمہ داری کا اور زیادتی ہمیشہ انہی کی طرف سے ہوئی ہے۔ پس اگر یہ توبہ کر لیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں تو تمہارے دینی بھائی ہیں۔ اور جاننے والوں کے لیے ہم اپنے احکام واضح کیے دیتے ہیں اور اگر عہد کرنے کے بعد یہ پھر اپنی قسموں کو توڑ ڈالیں اور تمہارے دین پر حملے کرنے شروع کر دیں تو کفر کے علمبرداروں سے جنگ کرو کیونکہ ان کی قسموں کا کوئی اعتبار نہیں شاید کہ وہ باز آ ئیں گے کیا تم نہ لڑو گے ایسے لوگوں سے جو اپنے عہد توڑتے رہے ہیں اور جنہوں نے رسول کو ملک سے نکال دینے کا قصد کیا تھا اور زیادتی کی ابتدا کرنے والے وہی تھے؟ کیا تم ان سے ڈرتے ہو؟ اگر تم مومن ہو تو اللہ اس کا زیادہ مستحق ہے کہ اس سے ڈرو۔''

قرآن مجید کے مذکورہ بیانات سے ان سنگین حالات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے جو مشرکین، یہود و نصاریٰ اور منافقین نے مل کر پیدا کر دیے تھے۔ مسلمان پوری طرح حالت جنگ سے گزر رہے تھے۔ عہد و پیمان توڑے جا رہے تھے۔ سازشیں جاری تھیں۔ ہر طرف سے دشمن کی یلغار تھی اور امن کی کوئی صورت نہیں رہ گئی تھی۔ اس صورت حال میں کسی فرد کا ملت اور ریاست کی حریف طاقتوں سے محبت کا رشتہ استوار کرنا اور خفیہ تعلقات رکھنا غداری اور بغاوت سمجھا جاتا ہے۔ دنیا کی کوئی قوم اس کی اجازت نہیں دیتی پھر اسلام سے اس کی توقع کیسے کی جا سکتی ہے؟

اس لیے اللہ کی راہنمائی میں ایسے کفار، مشرکین، منافقین اور یہود و نصاریٰ سے سخت رویہ اور جہاد و قتال کا معاملہ کرنا پڑا۔ لیکن ان حالات میں بھی اسلام کی طرف پلٹنے والوں کے لیے بھائی کا لفظ اور امن چاہنے والوں کے لیے امن اور جائے امن تک

---

[1] التوبہ ۹: ۸-۱۳

پہنچانے کا احسن عمل مسلمانوں کی طرف سے جاری رہا۔ اور پر امن غیر مسلموں سے تعلق اور دوستی کا رشتہ جاری رہا۔

مذکورہ مخصوص صورت حال کے علاوہ قرآن مجید نے مشرکین اور جملہ غیر مسلموں سے بہتر روابط اور حسن سلوک سے منع نہیں کیا ہے۔ سورہ ممتحنہ کے آغاز میں کہا گیا ہے کہ جو لوگ اللہ اور خود تمہارے دشمن ہیں جنھوں نے تمہارے ساتھ ہر طرح کی زیادتی کی ہے انھیں اپنا ولی نہ بناؤ پھر اس کے فوراً بعد ارشاد فرمایا:

لَا یَنۡهٰکُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِیۡنَ لَمۡ یُقَاتِلُوۡکُمۡ فِی الدِّیۡنِ وَلَمۡ یُخۡرِجُوۡکُمۡ مِّنۡ دِیَارِکُمۡ اَنۡ تَبَرُّوۡهُمۡ وَتُقۡسِطُوۡۤا اِلَیۡهِمۡ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الۡمُقۡسِطِیۡنَ ۝ اِنَّمَا یَنۡهٰکُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِیۡنَ قٰتَلُوۡکُمۡ فِی الدِّیۡنِ وَاَخۡرَجُوۡکُمۡ مِّنۡ دِیَارِکُمۡ وَظٰهَرُوۡا عَلٰۤی اِخۡرَاجِکُمۡ اَنۡ تَوَلَّوۡهُمۡ وَمَنۡ یَّتَوَلَّهُمۡ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الظّٰلِمُوۡنَ ۝ [1]

''اللہ تعالیٰ تمھیں اس بات سے نہیں روکتا کہ تم ان لوگوں کے ساتھ نیکی اور انصاف کا برتاؤ کرو جنھوں نے دین کے معاملہ میں تم سے جنگ نہیں کی ہے اور تمھیں تمہارے گھروں سے نہیں نکالا ہے اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے وہ تمھیں جس بات سے روکتا ہے وہ تو یہ ہے کہ تم ان لوگوں سے دوستی کرو جنھوں نے تم سے دین کے معاملہ میں جنگ کی ہے اور تمھیں تمہارے گھروں سے نکالا ہے اور تمہارے اخراج میں ایک دوسرے کی مدد کی ہے۔ ان سے جو لوگ دوستی کریں وہی ظالم ہیں''۔

سورہ ممتحنہ کی یہ آیات واضح ہدایت ہیں کہ جن غیر مسلموں نے مسلمانوں کے ساتھ زیادتیاں نہ کی ہوں اور نہ ہی وہ سازشوں میں مبتلا ہوں اور جن سے مسلمانوں کی کوئی جنگ نہ ہو ان کے ساتھ ہمدردی، دوستی، عدل و مساوات اور مصالحت کا رویہ رکھنا اسلام کی تعلیمات کے خلاف نہیں ہے۔ قرآن مجید نے مخالفین اور دشمنوں کے ساتھ جس رویہ کی ہدایت کی ہے اسے غیر مسلموں کے بارے میں ایک عام رویہ قرار دینا کسی طرح درست نہیں۔ قرآن کا عام رویہ تو درگزر، صبر، عفو اور پوری انسانیت سے بھلائی کا رویہ ہے۔ وہ اپنے عقیدے اور فکر کو جبر و اکراہ کی بجائے حکمت اور دلائل کے ساتھ پیش کرنے اور مخالفت اور مزاحمت کو عزم و حوصلہ اور ہمت سے برداشت کرنے کا سبق دیتا ہے۔

وَاصۡبِرۡ عَلٰی مَا یَقُوۡلُوۡنَ وَاهۡجُرۡهُمۡ هَجۡرًا جَمِیۡلًا ۝ [2]

''جو کچھ یہ کہہ رہے ہیں اس پر صبر کرو اور ان کو اچھی طرح چھوڑ دو''۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:

فَاصۡفَحِ الصَّفۡحَ الۡجَمِیۡلَ ۝ اِنَّ رَبَّکَ هُوَ الۡخَلّٰقُ الۡعَلِیۡمُ ۝ [3]

---

[1] الممتحنہ ۶۰: ۸۔۹

[2] المزمل ۷۳: ۱۰

[3] الحجر ۱۵: ۸۵۔۸۶

"ان سے اچھی طرح درگذر کیجیے تمہارا رب وہی ہے جو پیدا بھی کرتا ہے اور باخبر بھی ہے"۔

اسلام نے اپنے پیروکاروں کی یہ خوبی بتائی ہے:

وَالْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ[۱]

"وہ غصہ کے پی جانے والے اور لوگوں سے درگزر کرنے والے ہیں"۔

سنت نبوی ﷺ کی روشنی میں غیر مسلموں سے تعلقات:

آپ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے سارے جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔ وَمَا أَرْسَلْنٰكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِينَ[۲] اور آپ کے اسوہ کو بہترین اسوہ قرار دیا ہے لقد کان لکم فی رسول اللّٰہ اسوۃ حسنہ۔[۳] آپ ﷺ نے اپنے دور نبوت کے مکمل بے بسی اور مکمل اختیار دونوں زمانوں میں غیر مسلموں سے ہمیشہ اچھا سلوک اور برتاؤ کیا۔ مکی دور میں آپ پر ظلم و ستم کی انتہا کی گئی آپ کے ساتھ توہین آمیز سلوک کیا گیا۔ اس کے جواب میں کبھی بھی آپ کی زبان مبارک پر نازیبا کلمات یا بددعا کے الفاظ نہیں آئے۔ بسا اوقات آپ کے راستے میں کانٹے بچھائے جاتے تاکہ رات کے اندھیرے میں آپ کے پاؤں زخمی ہوں۔ گھر کے دروازے پر غلاظتیں پھینکی جاتیں تاکہ صحت و جمعیت خاطر میں خلل پیدا ہو۔ آپ نے یہ سب کچھ صبر و تحمل سے برداشت کیا۔ کبھی صرف اس قدر فرما دیا کرتے کہ فرزندان عبد مناف حق ہمسائگی خوب ادا کرتے ہو؟

مدنی دور میں اللہ تعالیٰ نے جب آپ کو غلبہ دیا تو آپ نے کسی سے انتقام نہیں لیا بلکہ عام معافی کا اعلان فرما دیا۔ غیر مسلموں سے حسن سلوک اور معافی کے بے شمار واقعات کتب احادیث و سیرۃ میں موجود ہیں۔

ہجرت مدینہ کے موقع پر قریش مکہ کی طرف سے آپ کے زندہ یا مردہ پکڑ کرلانے کی قیمت ۱۰۰ اونٹ رکھی گئی تھی۔ سراقہ بن مالک نے اپنے تیز رفتار گھوڑے کی مدد سے یہ کام کرنا چاہا اور آپ کے پاس جا پہنچا۔ پکڑنے کی ہر کوشش پر اس کا گھوڑا زمین میں دھنس جاتا۔ تین دفعہ کی کوشش کے بعد ارادہ ترک کیا اور آپ سے سند امان حاصل کرنے کی درخواست کی آپ نے اسے سند امان لکھ دی۔ آٹھ سال بعد فتح مکہ کے موقع پر جب سراقہ مسلمان ہوا تو اس کے سابقہ جرم کا ذکر تک نہ ہوا۔[۴]

جابر بن عبداللہ روایت کرتے ہیں کہ ایک دفعہ آپ ﷺ ذات الرقاع غزوہ سے واپس آرہے تھے۔ راستہ میں ایک جگہ پڑاؤ کیا اور تیز دھوپ کی وجہ سے لوگ درختوں کے نیچے آرام کرنے لگے۔ ایک بدو نے غافل سمجھ کر تلوار سونت لی۔ بولا: محمد (ﷺ) آپ کو مجھ سے کون بچا سکتا ہے۔ آپ نے فرمایا: اللہ۔ اس آواز کی تاثیر تھی کہ وہ کانپنے لگا تلوار نیام میں کر لی۔ اتنے میں صحابہ آ گئے آپ نے سارا واقعہ بیان فرمایا لیکن اس شخص کو کسی قسم کی سزا نہ دی۔[۵]

۱۔ آل عمران ۳:۱۳۴

۲۔ الانبیاء ۲۱:۱۰۷

۳۔ الاحزاب ۲۱:۳۳

۴۔ ابن حجر، محمد بن عسقلانی، الاصابہ، دار احیاء التراث العربی، بیروت، لبنان، ۱۳۲۸ھ، ۲/۸

۵۔ الجامع الصحیح للبخاری، کتاب المغازی، غزوۃ ذات الرقاع (۴۱۳۶ء)، الکتب ستۃ، ص ۳۲۸

صلح حدیبیہ کے زمانے میں اسی آدمیوں کا دستہ تاریکی میں جبل تنعیم سے اتر کر آیا تا کہ چھپ کر آپ کو قتل کر دیں۔ مسلمان ہوشیار تھے انہوں نے ان کو گرفتار کر لیا لیکن آپ نے ان سے کوئی تعرض نہ کیا۔[1]

مکہ میں آپ کی مخالفت میں ابوجہل اور ابوسفیان کا گھرانہ پیش پیش تھا۔ ابوجہل تو جنگ بدر میں مارا گیا لیکن اس کا بیٹا عکرمہ جو بعد کی جنگوں میں مسلمانوں کے خلاف بھرپور حصہ لے چکا تھا۔ فتح مکہ کے بعد خوف کی وجہ سے وہ یمن دوڑ گیا اس کی بیوی مسلمان ہو چکی تھی۔ وہ اسے آپ کے عفو و درگزر کا ذکر کر کے واپس لے آئی۔

آپ نے دونوں کو آتے دیکھا تو خوشی سے اٹھے اور اتنی تیزی سے ان کی طرف بڑھے کہ جسد اطہر پر چادر کا خیال بھی نہ کیا اور فرمایا: مرحبا بالراکب المہاجر (اے ہجرت کرنے والے سوار تیرا آنا مبارک ہو)۔[2]

غزوہ بدر میں مشرکین کے ستر آدمی مارے گئے اور ستر ہی قیدی بنائے گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے قیدیوں کو صحابہ کرام کے درمیان تقسیم کر دیا اور نصیحت فرمائی کہ ان کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے۔ آپ کی اس نصیحت کا اثر صحابہ پر کس قدر ہوا اس کا ذکر حضرت مصعب بن عمیر کے بھائی ابوعزیز بن عمیر یوں کرتے ہیں:

> ''وہ اس جنگ میں نضر بن حارث کے بعد مشرکین کے علم بردار تھے۔ فرماتے ہیں کہ انہیں بعض انصار کے حوالے کیا گیا۔ رسول اللہ ﷺ کی نصیحت کا ان پر یہ اثر تھا کہ وہ صبح و شام کھانے کے وقت مجھے روٹی کھلاتے اور خود کھجور کھا کر رہ جاتے۔ ان میں سے کسی کو روٹی کا ایک ٹکڑا بھی ملتا تو مجھے دے دیتا اسے ہاتھ نہیں لگاتا تھا اس سے مجھے شرم سی محسوس ہوتی تھی۔''[3]

بدر کے قیدیوں کے علاوہ بھی جب کبھی آپ کے پاس قیدی لائے جاتے تو آپ کا رویہ ان سے بہت مہذب اور شریفانہ ہوتا تھا۔ حضرت حسن بصری فرماتے ہیں:

> "كان رسول الله ﷺ يؤتى بالاسير فيدفعه الى بعض المسلمين فيقول احسن اليه فيكون عنده اليومين والثلاثة فيؤثره على نفسه".[4]
>
> ''رسول اللہ ﷺ کے پاس قیدی لایا جاتا تو آپؐ اسے کسی مسلمان کے حوالے کر دیتے اور فرماتے کہ اس کے ساتھ اچھا سلوک کرے۔ یہ قیدی اس کے پاس دو تین دن رہتا اور وہ مسلمان اس کی ضروریات کو اپنی ضروریات پر ترجیح دیتا تھا''۔

رسول اللہ ﷺ نے غیر مسلموں کی دعوت قبول فرمائی ہے۔

---

[1] الجامع ترمذی، کتاب التفسیر، تفسیر سورہ الفتح (۳۲۶۴) الکتب الستۃ، دار السلام للنشر والتوزیع، الریاض السعودیہ، ۱۴۲۹ھ، ص ۱۹۸۵

[2] الجامع ترمذی کتاب الاستئذان باب ما جاء فی مرحبا، (۲۷۳۵) الکتب الستۃ، ص ۱۹۲۷

[3] شبلی نعمانی، سیرۃ النبی، الفیصل تاجران و ناشران، لکھنو، ۲/۲۵۶۔۲۵۷

[4] زمخشری، ابوالقاسم محمد بن عمر، الکشاف عن حقائق غوامض التنزیل وعیون الاقاویل فی وجوہ التاویل، دار الکتاب العربی، بیروت، لبنان، س ن، ۴/۶۶۸

انّ یهودیا دعا النبی ﷺ الی خبز شعیر و اهالة سنخة فاجابه [۱]

''ایک یہودی نے نبی ﷺ کو جَو کی روٹی اور بدبودار چربی (یا تیل) کی دعوت دی۔ آپ نے قبول فرمائی''۔

بدر سے فتح مکہ تک ابوسفیان آپ کا بدترین دشمن رہا تھا۔ فتح مکہ کے موقع پر حضرت عباسؓ ان کو لے کر خدمت نبوی ﷺ میں حاضر ہوئے تو آپ نے اسے نہ صرف معاف کیا بلکہ اس کے گھر کو امان کی جگہ قرار دیا۔

مَنْ دَخَلَ دارَ ابی سفیان فهو امن [۲]

غیر مسلموں کے جو بیرونی وفود نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں آتے ان کی آپ خود میزبانی فرماتے۔ چنانچہ جب مدینہ منورہ میں آپ ﷺ کی خدمت میں حبشہ کے عیسائیوں کا ایک وفد آیا تو آپ ﷺ نے ان کو مسجد نبوی میں ٹھہرایا اور ان کی مہمان نوازی خود اپنے ذمہ لی اور فرمایا:

انهم كانوا لاصحابنا مكرمين، و انی احب ان اكافئهم [۳]

''یہ لوگ ہمارے ساتھیوں کے لیے ممتاز و منفرد حیثیت رکھتے ہیں اس لیے میں نے پسند کیا کہ میں بذات خود ان کی تعظیم و تکریم اور مہمان نوازی کروں۔''

ایک دفعہ نجران کے عیسائیوں کا چودہ رکنی وفد مدینہ منورہ آیا آپؐ نے اس وفد کو مسجد نبوی میں ٹھہرایا اور اس وفد میں شامل مسیحیوں کو اجازت دی کہ وہ اپنی نماز اپنے طریقہ پر مسجد نبوی میں ادا کریں چنانچہ یہ مسیحی حضرات مسجد نبوی کی ایک جانب مشرق کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے [۴]

اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ایک ایسے مجمع کے پاس سے گزرے جس میں مسلمان، مشرک، بت پرست، یہودی اور ہر قسم کے آدمی تھے آپ ﷺ نے انھیں سلام کیا۔ [۵]

حضرت اسماء بنت ابوبکر رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ (صلح حدیبیہ کے بعد جب امن قائم ہوگیا) میری ماں جو مشرک تھیں مجھ سے ملنے آئیں۔ میں نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ وہ مجھ سے کچھ توقع لے کر آئی ہیں۔ کیا میں ان کے ساتھ تعاون اور ہمدردی کر سکتی ہوں۔ آپؐ نے فرمایا اپنی ماں کے ساتھ صلہ رحمی کرو۔ [۶]

۱۔ احمد بن حنبل، مسند، المطبعہ المیمنیہ، مصر ۱۳۱۳ھ، ۳/۲۱۱، ۲۷۰

۲۔ صحیح مسلم، کتاب الجہاد، باب فتح مکہ (۳۴۲۷) ص ۹۹۵

۳۔ بیہقی، حسین بن علی، شعب الایمان (۹۱۲۵) ادارہ تالیفات اشرفیہ، ملتان۔ س ن، ۶/۵۱۸

۴۔ ابن سعد ابوعبداللہ، محمد، الطبقات الکبریٰ، دار صادر، بیروت، لبنان، ۱۹۵۸، ۱/۳۵۷

۵۔ الجامع الصحیح للبخاری، کتاب الاستئذان، الکتب الستۃ، ص ۵۲۷

۶۔ الجامع الصحیح للبخاری، کتاب الہبہ، باب الہدیہ للمشرکین (۲۶۲۰) الکتب الستۃ، ص ۲۰۶

قبیلہ ثقیف کے وفد کو جو ابھی اسلام نہیں لایا تھا آپ ﷺ نے مسجد نبوی میں ٹھہرایا۔ حضرت خالد بن سعید اس کے کھانے کا نظم فرماتے تھے۔ وفد کے لوگ حضرت خالد کے کھانے سے پہلے کھانا نہیں کھاتے تھے[1]۔ اسی قبیلے نے بعد میں چند شرائط کے ساتھ اسلام قبول کر لیا۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک یہودی سے پینے کی کوئی چیز طلب کی۔ اس نے وہ پیش کی تو آپ نے اسے دعا دی کہ اللہ تعالیٰ تمہیں حسین وجمیل رکھے۔ چنانچہ مرتے وقت تک اس کے بال سیاہ رہے[2]۔

آپ ﷺ کے چچا حضرت ابو طالب بیمار ہوئے تو آپ نے ان کی عیادت فرمائی[3]۔

جب آپ کے چچا ابو طالب کا انتقال ہوا تو حضرت علیؓ نے آپ ﷺ کو اس کی اطلاع دی یہ خبر سن کر آپ رو پڑے۔ ایک روایت میں ہے کہ آپ ان کی مغفرت کی دعا بھی کرتے رہے بعد میں جب اللہ تعالیٰ نے اس سے منع فرمایا تو رک گئے[4]۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے والد کے انتقال پر دریافت کیا کہ انہیں کون دفن کرے گا؟ آپ ﷺ نے فرمایا جاؤ اپنے باپ کو دفن کرو۔ حضرت علی نے عرض کیا وہ تو مشرک اور ہدایت سے محروم تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا جاؤ اور اپنے باپ کو دفن کرو۔ پھر اور کوئی کام کیے بغیر سیدھے میرے پاس آؤ۔ میں گیا اور انہیں دفن کیا اور آپ کی خدمت میں پہنچا تو آپ ﷺ نے مجھے غسل کا حکم دیا اور دعا دی۔ ایسی دعا کہ اس کے عوض مجھے سرخ وسیاہ اونٹ (دنیا جہاں کی دولت) بھی پسند نہیں[5]۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں **ان النبی ﷺ اشتری طعاماً من یهودی الی اجل و رهنه درعه من حدید**[6]۔ رسول اللہ ﷺ نے ایک یہودی سے ایک مدت کے لیے غلہ خریدا اور اس کے پاس اپنی لوہے کی زرہ رہن رکھی۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ غیر مسلموں سے کاروباری روابط رکھے جا سکتے ہیں۔

احادیث میں غیر مسلموں کو تحفے دینے اور ان کے تحفے قبول کرنے کا ثبوت موجود ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

ان کسری اهدی له فقبل و ان الملوک اهدوا الیه فقبل منهم۔

کسریٰ نے آپ کو ہدیہ پیش کیا آپ نے قبول کیا (اسی طرح) بادشاہوں نے آپ کو ہدیے دیے آپ نے قبول فرمائے[7]۔

---

[1] ابن ہشام، السیرۃ النبویہ، دار احیاء التراث العربی، بیروت، لبنان، ۱۹۷۱ء، ۱۹۳/۴۔۱۹۷

[2] ابوبکر عبد الرزاق بن ہمام، المصنف، تحقیق حبیب الرحمٰن، المکتب الاسلامی، بیروت، لبنان، ۳۹۲/۱۰

[3] ایضاً: ۳۶/۶

[4] طبقات ابن سعد ۱/۱۲۳۔۱۲۴

[5] سنن ابی داؤد، کتاب الجنائز، باب الرجل یموت لہ قرابۃ مشرک، الکتب الستۃ، ص ۱۳۶۴

[6] الجامع الصحیح للبخاری، کتاب البیوع، باب شراء النبی بالنسیئۃ (۲۰۶۸) الکتب الستۃ، ص ۱۶۱

[7] الجامع ترمذی، ابواب السیر، باب ما جاء فی قبول ہدایا المشرکین، الکتب الستۃ، ص ۱۸۱۴

اسحاق بن عبداللہ بن حارث بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے بیس سے زیادہ اونٹوں کے عوض ایک جوڑا خریدا اور ذی یزن کو تحفہ میں بھیجا۔[1]

جن غیر مسلموں نے آپ کے ساتھ معاہدے کیے یا آپ کے ماتحت ذمی رہنا پسند کیا آپ ﷺ نے کبھی ان کے ساتھ دوسرے درجے کے شہری کا سا سلوک نہیں کیا۔ بلکہ ان سے کیے ہوئے معاہدات کو نبھایا اور اگر ان کے ساتھ کسی قسم کی زیادتی ہوئی تو مسلم اور غیر مسلم کی تفریق کے بغیر ان کے ساتھ عدل کا معاملہ کیا۔ آپ ﷺ نے ایک مرتبہ معاہدین کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے فرمایا:

مَن قتل معاهدا لم يرح رائحة الجنة و ان ريحها لتوجد من مسيرة اربعين عاما۔[2]

''جب کسی نے کسی معاہد کو قتل کیا وہ جنت کی ہوا بھی نہیں پائے گا۔ حالانکہ جنت کی خوشبو چالیس برس کی مسافت تک پھیلی ہوئی ہے''۔

غیر مسلم رعایا سے حسن سلوک کے حوالے سے آپ ﷺ کا یہ ایک فرمان ہی کافی ہے۔

اَلا مَنْ ظَلَم معاهِدًا او انتقصه او كلفه فوق طاقته او اخذ منه شيئا بغير طيب نفس فانا حجيجه يوم القيامة۔[3]

''خبردار جس کسی نے کسی معاہد (اقلیتی فرد) پر ظلم کیا یا اس کا حق مارا یا اس کو اس کی استطاعت سے زیادہ تکلیف دی یا اس سے کوئی چیز اس کی خوشی کے بغیر لی تو میں بروز قیامت اس کی طرف سے (مسلمان کے خلاف) جھگڑوں گا''۔

آپ ﷺ نے اس بات کو بطور تنبیہ ہی کے نہیں رکھا بلکہ عملی طور پر اس کا ثبوت دنیاوی زندگی میں بھی پیش کیا۔ یحییٰ بن آدم القرشی کتاب الخراج میں ایک روایت نقل فرماتے ہیں:

ان رجلا من المسلمين قتل رجلا من اهل الكتاب فرفع الى النبى ﷺ فقال رسول الله ﷺ انا احق من وفى بذمته ثم امر به فقتل۔[4]

''ایک مسلمان نے ایک اہل کتاب کو قتل کیا اور مقدمہ نبی کریم ﷺ کے پاس فیصلہ کے لیے آیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں اہل ذمہ کا حق ادا کرنے کا سب سے زیادہ ذمہ دار ہوں۔ چنانچہ آپ ﷺ نے قاتل کے بارے میں قتل کرنے کا حکم دیا اور اسے قتل کر دیا گیا''۔

---

[1] سنن ابی داود، کتاب اللباس، باب لبس المرتفع (۴۰۳۴) الکتب الستۃ، ص ۱۵۱۸

[2] الجامع الصحیح للبخاری، کتاب الجزیہ، باب اثم من قتل معاھدا بغیر جرم (۳۱۶۶) الکتب الستۃ، ص ۲۵۶

[3] سنن ابی داود، کتاب الخراج، باب فی تعشیر اھل الذمۃ اذا اختلفوا، (۳۰۵۲) الکتب الستۃ، ص ۱۴۵۳

[4] یحییٰ بن آدم القرشی، کتاب الخراج مطبع المکتبۃ العلمیہ لاہور، ص ۲۱۵

آپ ﷺ کے مدنی دور میں بعض یہودی قبائل کے ساتھ ان کی عہد شکنی کی بنا پر سختی کا معاملہ فرمایا۔ جس کی وضاحت باب ٦ میں کی گئی ہے۔

غیر مسلموں سے تعلقات کی حدود اور حکمت:

اسلام خیر خواہی کی تعلیم دیتا ہے آپ ﷺ کا فرمان ہے الـدیـن نـصـیـحـة "دین خیر خواہی کا نام ہے" آپ ﷺ آخری نبی ہیں اور آپ کی امت آخری امت ہے۔ ارشاد ہے انا اخر الانبیاء و انتم اخر الامم (میں آخری نبی ہوں اور تم آخری امت ہو)۔ آپ کی امت کی دو قسمیں کی جا سکتی ہیں ایک امت اجابت یعنی جس نے آپ کو نبی اور اسلام کی تعلیمات کو مان لیا ہے اور دوسری امت دعوت یعنی جس نے آپ کے نبی ہونے کا انکار اور اسلامی تعلیمات کو ماننے سے انکار کیا ہے۔ امت اجابت کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ امت دعوت تک اسلامی تعلیمات کو احسن طریقے سے پہنچائے۔ لہٰذا ایک مسلم کے لیے یہ روا نہیں سمجھا جاتا کہ وہ تنہائی پسند ہو یا گوشہ نشینی کی زندگی گزارنے لگے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ غیر مسلموں سے عام انسانی اور اخلاقی روابط مستحکم کر کے ان کو دعوت اسلام پیش کرتا رہے۔ البتہ یہ کام کچھ حدود و قیود اور حکمت کے ساتھ سرانجام دینا ہوگا۔

کہا جاتا ہے کہ اسلام علیحدگی پسند ہے اور فرد کے اندر یہی رجحان پیدا کرتا ہے۔ نیز وہ دوسرے مذاہب کے ماننے اور مخالف نقطۂ نظر رکھنے والوں سے قطع تعلق کا حکم دیتا ہے۔ اور اپنے ماننے والوں کو ان سب افراد سے کاٹ دیتا ہے جو اس سے اختلاف رکھتے ہیں۔ جہاں تک ان اعتراضات کا تعلق ہے، اسلام کی واضح تعلیمات اس کی تردید کرتی ہیں۔ وہ غیر مسلموں سے عام انسانی اور اخلاقی روابط سے کبھی منع نہیں کرتا اس کے ساتھ وہ یہ بھی نہیں چاہتا کہ مسلمان کسی دوسرے گروہ میں ضم ہو جائیں اس کے لیے اس نے کچھ حدود مقرر کر رکھی ہیں۔[1]

اسلام دیگر مذاہب سے ہم آہنگی، روابط اور تعلقات کے حوالے سے بلاشبہ کچھ تحفظات بھی رکھتا ہے۔ وہ انسانیت کی بنا پر ہر طرح کے تعلقات استوار کرنے کا روادار ہے۔ تاہم دین و مذہب اور تشخص کے حوالے سے بہت محتاط اور متوازن رویہ رکھتا ہے۔ اس سلسلے میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ نہ تو ایسے افراد سے مکمل مقاطعہ کر لیں کیونکہ اس سے مسلمانوں اور دیگر مذاہب کے درمیان ایک ذہنی خلیج حائل ہو جائے گی۔ دونوں کے درمیان نفرت اور مخالفت کے جذبات پیدا ہو سکتے ہیں، اور نہ ہی اس رواداری میں اس قدر آگے بڑھیں کہ سب کچھ ہی ان کے حوالے کر دیا جائے۔

لہٰذا غیر مسلموں سے تعلقات درج ذیل حدود و شرائط پر مبنی ہونے چاہئیں:

(۱) فتنہ پرداز اور برسرپیکار غیر مسلموں کو رازدار دوست بنانے کی ممانعت۔

اسلام دیگر مذاہب کے ایسے افراد کو جو فتنہ برپا کرنا چاہتے ہوں یا غداری کے مرتکب ہوں یا مسلمانوں سے برسرپیکار ہوں انہیں اپنا رازدار، دوست بنانے کی ممانعت کرتا ہے:

---

[1] جلال الدین عمری، غیر مسلموں سے تعلقات اور ان کے حقوق، ادارہ تحقیق و تصنیف اسلامی، دودھ پور، علی گڑھ، ۱۹۹۹ء، ص ۱۲

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا بِطَانَةً مِّن دُونِكُمْ لَا يَأْلُونَكُمْ خَبَالًا وَدُّوا مَا عَنِتُّمْ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَاءُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ وَمَا تُخْفِي صُدُورُهُمْ أَكْبَرُ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْآيَاتِ إِن كُنتُمْ تَعْقِلُونَ ۝ ۱

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو اپنے لوگوں کے سوا دوسروں کو اپنا راز دار نہ بناؤ وہ تمہاری خرابی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھیں گے وہ چاہتے ہیں کہ تم کو تکلیف پہنچے ان کی دشمنی ان کی باتوں سے ظاہر ہے اور جو کچھ ان کے دل چھپائے ہوئے ہیں وہ اس سے بڑھ کر ہے اگر تم سوجھ بوجھ رکھتے ہو۔ ہم نے تمہارے لیے نشانیاں کھول کر ظاہر کر دی ہیں تا کہ تم احتیاط کرو''۔

۲۔ اسلام مداہنت کا قائل نہیں:

اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا کہ ہم روشن خیالی اور آزاد روش میں اس قدر کھو جائیں کہ اپنے ملی تشخص اور دینی شعار ہی پر سمجھوتہ کر لیں۔ آپ ﷺ کی تیرہ سالہ کی زندگی سے ہمیں یہی سبق ملتا ہے کہ آپ نے ہر قسم کا تشدد اور ظلم برداشت کر لیا لیکن مداہنت اور سودے بازی کا راستہ اختیار نہیں کیا۔

وَدُّوا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُونَ ۝ ۲

''وہ تو اس آرزو میں ہیں کہ کسی طرح تم نرمی کرو تو وہ بھی نرم پڑ جائیں''۔

کفار مکہ نے آپ ﷺ سے یہ سمجھوتا بھی کرنا چاہا کہ نہ آپ ان کے معبودوں کو برا بھلا کہیں اور نہ وہ آپ کے مذہب کو باطل قرار دیں گے۔ آپ نے صاف صاف بتا دیا کہ اسلام اور کفر کی راہیں جدا جدا ہیں لہٰذا ان دونوں میں سے کسی بات پر مصالحت ناممکن ہے۔ قرآن مجید نے ان الفاظ میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے:

لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ ۝ ۳

۳۔ محاربین اور غیر محاربین میں فرق:

قرآن مجید نے غیر مسلموں سے تعلقات کے حوالے سے واضح کر دیا ہے کہ غیر مسلموں سے ہم آہنگی اور رواداری کی حدود، ضابطے اور اصولی قاعدے کیا ہیں۔ جو لوگ اسلام کے نظام فکر و عمل سے اختلاف رکھتے ہیں وہ دو طرح کے رویے اختیار کر سکتے ہیں۔ ایک رویہ عداوت اور مخاصمت کا ہوگا کہ وہ مسلمانوں کو آزادی اور امن و سکون سے رہنے نہ دیں اور اسلامی ریاست سے ان کی جنگ جاری ہو۔ دوسرا رویہ آزادی، حریت فکر و عمل اور ظلم و زیادتی سے اجتناب کا ہوگا۔ اسلام نے ان دونوں رویوں کے درمیان فرق کیا ہے۔ وہ پہلے گروہ سے تمام انسانی ہمدردی اور تعاون سے منع نہیں کرتا البتہ موالات اور راز دارانہ تعلقات سے احتراز کا حکم دیتا ہے کیونکہ یہ چیز دشمن کو تقویت پہنچانے کے ہم معنی ہے۔ جہاں تک دوسرے گروہ کا تعلق ہے اس کے ساتھ حسن سلوک،

---

۱ آل عمران ۳:۱۱۸

۲ القلم ۶۸:۹

۳ الکافرون ۱۰۹:۶

تعاون اور ہمدردی کی بہر حال اجازت ہے اس نے اس سے منع نہیں کیا۔[1]

سورۃ الممتحنہ میں ہر دو قسم کے افراد کے ساتھ تعلقات کی نوعیت کے بارے میں وضاحت کی گئی ہے کہ غیر محارب غیر مسلموں کے ساتھ نیکی اور عدل و انصاف کی روش اختیار کرنے کو پسند کیا گیا ہے۔ اور محاربین کے ساتھ اس طرح سے تعلقات کی ممانعت فرمائی گئی ہے۔

۴۔ کافروں کے شر سے بچاؤ کے لیے دوستی جائز ہے:

قرآن مجید میں مومنوں کے لیے کافروں سے دوستی کا ایک استثناء بتایا گیا ہے کہ اگر ان کافروں سے بچاؤ کی تدبیر کے طور پر دوستی کا سا عمل کیا جائے تو جائز ہے۔

لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُونَ الْكَافِرِينَ أَوْلِيَاءَ مِن دُونِ الْمُؤْمِنِينَ وَمَن يَفْعَلْ ذَٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللَّهِ فِي شَيْءٍ إِلَّا أَن تَتَّقُوا مِنْهُمْ تُقَاةً[2]

''مومنوں کو چاہیے کہ وہ ایمان والوں کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا دوست نہ بنائیں جو ایسا کرے گا وہ اللہ کی کسی حمایت میں نہیں مگر یہ کہ ان کے شر سے کسی طرح بچاؤ مقصود ہو۔''

اس آیت سے تقیہ کے مشروع ہونے کی دلیل ملتی ہے۔ تقیہ سے مراد جان، عزت اور مال کی دشمنوں سے حفاظت ہے۔ حضرت حسن بصریؒ کا قول ہے:

التقیة جائزة للانسان الی یوم القیامة ولا تقیة فی القتل[3]

تقیہ کی دو اقسام ہیں (۱) دین کا خوف (۲) دنیوی مال و متاع اور امارت کا خوف۔

پس نوع اول میں ہر انسان کو اس مقام سے ہجرت کر جانا چاہیے جہاں اس کا دین غیر محفوظ ہو۔ اگر ہجرت کی قدرت نہ رکھتا ہو تو إِلَّا الْمُسْتَضْعَفِينَ[4] میں اپنے آپ کو شمار کرتے ہوئے رخصت اور عزیمت دونوں میں سے کوئی ایک راہ اختیار کر سکتا ہے۔[5]

۵۔ دنیوی معاملات میں موالات کی اجازت:

مومنوں اور کافروں کے درمیان محبت اور موالات صرف امور دین اور مملکت کے اہم کاموں میں ممنوع ہے، دنیوی مصالح جن کا ضرورت تقاضا کرتی ہے ممانعت نہیں۔[6]

---

[1] سید جلال الدین عمری، غیر مسلموں سے تعلقات اور ان کے حقوق، ص ۵۸۔۵۹

[2] آل عمران ۳:۲۸

[3] وہبہ الزحیلی، التفسیر المنیر ۳/۲۰۵، دار الفکر، دمشق، ۱۹۹۱ء

[4] النساء ۴:۹۹

[5] محمود آلوسی، روح المعانی، دار احیاء التراث العربی، بیروت، لبنان، س ن، ۳/۱۲۱

[6] وہبہ الزحیلی تفسیر المنیر ۶/۲۲۷۔۲۲۸

ہجرت مدینہ کے سفر میں ایک رہبر عبداللہ بن اریقط تھا جو اس زمانے میں کفر پر تھا مگر یہ دونوں (نبی اور ابوبکر) اس سے مطمئن تھے [۱]

علامہ یوسف القرضاوی کے خیال میں:

> ''مسلمان حاکم ہوں یا رعایا فنی امور جو دین سے متعلق نہیں مثلاً طب، صنعت، زراعت وغیرہ میں غیر مسلموں سے تعاون حاصل کر سکتے ہیں اگر ان کے حق میں بہتر یہ ہے کہ وہ ان امور میں خود کفیل ہوں''۔ [۲]

۶۔ دین اسلام کی اہانت نہ ہو:

غیر مسلموں سے ایسا معاہدہ جو اسلام کے شرف میں کمی کا باعث ہو جائز نہیں۔ ''یعنی کفار کے ساتھ ایسی دوستی ممنوع ہے جس سے تیرے دین کی رسوائی ہو یا تیرے دینی بھائیوں کو اذیت پہنچے یا وقار اور مفاد کو نقصان پہنچے۔'' [۳]

اسلام ایسے اتحاد کو پسند نہیں کرتا کہ جس میں شاطرانہ سیاست کاری سے مسلمانوں کے ہاتھ پاؤں باندھ کر ان کی دولت و ثروت ہڑپ کرنا مقصود ہو۔

۷۔ مذہبی تعلقات کی حد

اسلام مذہب کے بارے میں جبر کا قائل نہیں لَا اِكْرَاهَ فِی الدِّیْنِ [۴] اسلام چونکہ اللہ کے ہاں واحد قابل قبول دین ہے۔ اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ [۵] اس لیے یہ نہ ماننے والوں کو حکمت کے ساتھ اپنے اندر شامل ہونے کی دعوت دیتا ہے۔ اہل کتاب چونکہ اقرب الی الاسلام ہیں اس لیے ان کے انکار پر قرآن نے انہیں مشترکہ اقدار کی طرف دعوت دی ہے۔ قل یا اهل الكتاب تعالوا الى كلمة سواء بيننا و بينكم [۶] مجموعی طور پر اسلام دیگر مذاہب کے ساتھ پرامن بقائے باہمی کا علمبردار ہے۔ اسلام نے مسلمانوں کو غیر مسلموں کے ساتھ معاشرتی مذہبی و معاشی تعلقات جن حدود و قیود کے ساتھ قائم رکھنے کی اجازت دی ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ ان لوگوں کے ساتھ میل ملاپ رکھا جائے تاکہ ان تک اسلام کا صحیح پیغام پہنچانے کی راہ ہموار ہوتی رہے۔ لیکن اس میں ایک بات کا خیال رکھا جاتا ہے کہ اسلام کی کسی واضح تعلیم کی خلاف ورزی نہ ہونے پائے اور فتنہ پرداز لوگ اس سے غلط فائدہ اٹھا کر اسلام کو اپنے مذہب میں ضم کرنے کی مذموم کوشش نہ کر سکیں۔

---

[۱] طبقات ابن سعد، ۲۰/۲

[۲] اسلام میں حلال و حرام، اسلامک پبلی کیشنز پرائیویٹ لمیٹڈ لاہور، ۱۹۹۶ء، ص ۳۹۷

[۳] تفسیر المنیر، ۲۰۱/۳

[۴] البقرۃ ۲:۲۵۶

[۵] آل عمران ۳:۱۹

[۶] آل عمران ۳:۶۴

غیر مسلموں سے تعلقات کے بنیادی اصول

ا۔ رواداری

رواداری کا مطلب ہے سب کے ساتھ بلا امتیاز مذہب اور رنگ و نسل درست اور بھلائی پر مبنی رویہ رکھنا۔ اسلام پوری مخلوق کو اللہ کا کنبہ قرار دیتا ہے: الخلق عیال اللہ۔ اس لیے اس کی رحمت و شفقت کا دائرہ کسی خاص قوم یا طبقے تک محدود نہیں بلکہ پوری انسانیت کے لیے ہے۔ قرآن مجید میں سب کے ساتھ عدل و احسان کا حکم دیا گیا ہے:

إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ[۱]

''بے شک اللہ (سب کے ساتھ) عدل و احسان کا حکم دیتا ہے''

اللہ تعالیٰ کے ارادے اور بھلائی کے بغیر انسان کا وجود نا ممکن ہے۔ اس کی نعمتوں اور رحمتوں کے سائے میں ہی انسان زندہ ہے اس لیے اس کریم ہستی کا مطالبہ انسان سے بھی یہی ہے کہ:

احسن کما احسن اللہ الیک[۲]

''تو دوسروں کے ساتھ نیکی اور بھلائی کر جیسا کہ اللہ تیرے ساتھ بھلائی کرتا ہے۔''

اسلام کے اخلاقی احکام مثلاً مظلوموں کی امداد غریبوں کی خبر گیری، اخوت، رواداری اور اس طرح کے تمام نیک کام بلا امتیاز مذہب ہیں ان میں تمام مسلم و غیر مسلم شامل ہیں۔

اسلام کا یہ ایک نمایاں کارنامہ ہے کہ اس نے دوسرے مذاہب اور ان کے پیروکاروں سے متعلق مسلمانوں کے خیالات میں تبدیلی پیدا کی جس کی بنا پر ان کے دلوں میں غیر مسلموں کے ساتھ رواداری اور وسعت نظری پیدا ہوئی۔ اسلام کے علاوہ دیگر مذاہب ایک دوسرے کی تکذیب اور تضحیک کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ یہودی اور عیسائی ایک دوسرے کو جھوٹا سمجھتے تھے:

وَقَالَتِ الْيَهُودُ لَيْسَتِ النَّصَارَىٰ عَلَىٰ شَيْءٍ وَقَالَتِ النَّصَارَىٰ لَيْسَتِ الْيَهُودُ عَلَىٰ شَيْءٍ وَهُمْ يَتْلُونَ الْكِتَابَ[۳]

''اور یہود کہتے ہیں کہ نصاریٰ کا مذہب کچھ نہیں اور نصاریٰ کہتے ہیں کہ یہود کا مذہب کچھ نہیں۔ حالانکہ دونوں کتاب الٰہی کے پڑھنے والے ہیں''۔

ہندو دوسرے مذاہب کو مذہب کا درجہ ہی نہ دیتے تھے۔ ایرانیوں میں احساس برتری عروج پر تھا۔ اسلام نے اس نفرت کی فضا میں اعلان کیا کہ کوئی قوم اللہ کی رحمت سے دور نہیں رہی۔ اللہ تعالیٰ نے ہر قوم کی طرف رسول بھیجے ہیں:

۱۔ النحل ۱۶:۹۰

۲۔ القصص ۲۸:۷۷

۳۔ البقرہ ۲:۱۱۳

وَلِكُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولٌ[1]

''ہم نے ہر قوم کے لیے ایک رسول بھیجا''۔

وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ[2]

''ہم نے ہر قوم کے لیے ایک رہنما بھیجا''۔

ان آیات سے واضح ہوتا ہے کہ دنیا کی کوئی قوم ہدایت ربانی سے محروم نہیں رہی۔ ہر قوم میں پیغمبر آئے ہیں لیکن ان پیغمبروں کے حالات اور تعلیمات میں اتنی تحریف ہو چکی ہے کہ ان کی حقیقت کا پتہ چلانا ناممکن ہے۔

اسلام دیگر مذاہب کے مقابلہ میں زیادہ رواداری کا حامل ہے۔ یہ دین میں زبردستی کا قائل نہیں۔ لا اکراہ فی الدین[3]

اسلام دوسرے مذاہب کے باطل معبودوں کو بھی برا کہنے سے روکتا ہے:

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِينَ يَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ .... [4]

اسلام کے ابتدائی دور میں اسلام اور مسلمانوں کا ساتھ یہود و نصاریٰ اور مشرکین عرب سے رہا یہ تینوں اسلام اور مسلمانوں کے مخالف تھے اس کے باوجود اسلام نے ان کو ان کے حقوق سے محروم نہیں کیا۔ یہودیوں کے ساتھ عدل و انصاف کرنے کا حکم قرآن میں موجود ہے:

وَإِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُم بَيْنَهُم بِالْقِسْطِ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ ۝[5]

''اگر آپ ان کے درمیان فیصلہ کریں تو انصاف کے ساتھ کریں بے شک اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔''

آپ ﷺ غیر مسلموں کے ہدیے قبول فرماتے اور ان کی طرف ہدایا بھیجا کرتے تھے۔ ایلہ کے حاکم نے آپ کو ایک سفید خچر ہدیہ بھیجا تو آپ ﷺ نے اس کے لیے ایک چادر بھجوائی اور شہر کی حکومت اس کو لکھ دی۔[6]

حجاز اور شام کے مابین دومہ نامی ایک شہر ہے۔ وہاں کے عیسائی حاکم نے جس کا نام دومہ تھا آپ کے پاس سندس (نہایت باریک اور بیش قیمت دیبا) کا ایک جبہ ہدیہ بھیجا۔ یہ جبہ ایسا نرم اور خوشنما تھا کہ تمام لوگ اس کی نفاست و پاکیزگی پر عش عش کرتے تھے۔[7]

---

۱ یونس۱۰:۴۷

۲ الرعد۱۳:۷

۳ البقرہ۲:۲۵۶

۴ الانعام۶:۱۰۸

۵ المائدہ۵:۴۲

۶ الجامع الصحیح للبخاری، کتاب الھبۃ، باب قبول الھدیۃ من المشرکین (۲۶۱۵) الکتب الستۃ، ص ۲۰۶

۷ الجامع الصحیح للبخاری، بدء الخلق، باب ما جاء فی صفۃ الجنۃ وانھا مخلوقۃ، (۳۲۴۹) الکتب الستۃ، ص ۲۶۳

آپ ﷺ کا غیر مسلموں کے ہدیے قبول کرنا اور انہیں ہدایا بھیجنے کا عمل دراصل مختلف مذاہب کے درمیان چھوت چھات کے عمل کو ختم کرنے اور رابطہ محبت استوار کرنے کے لیے تھا۔ چھوت چھات کا جذبہ سراسر اشرف المخلوق انسان کی تذلیل اور اس سے نفرت اور انقطاع کو مستلزم ہے جب کہ اسلام اس قسم کی عدم رواداری کی ہرگز اجازت نہیں دیتا۔ آپ ﷺ نے اپنے پیروکاروں کے لیے چھوت چھات اور تنگ خیالی اور ہر وہ کام جس سے بنی نوع انسان کی تحقیر ہوا سے گوارا نہ کیا۔ اس لیے انہیں غیر مسلموں کا حلال کھانا کھانا اور تحائف کے لین دین سے منع نہیں کیا۔

غزوہ حنین کے اسیران جنگ میں آپ کی رضاعی بہن شیما بھی شامل تھی۔ جب مسلمانوں نے ان کو گرفتار کیا تو وہ کہنے لگی کہ میں تمہارے پیغمبر کی بہن ہوں۔ صحابہ کرام ان کو تصدیق کے لیے آپ ﷺ کے پاس لے آئے۔ تو انہیں دیکھ کر فرط محبت سے آپ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ ان کے بیٹھنے کے لیے خود اپنی ردائے مبارک بچھائی۔ دیر تک محبت آمیز گفتگو کرتے رہے اور چند اونٹ اور بکریاں عنایت فرمائیں۔ اس کے بعد ارشاد فرمایا کہ جی چاہے تو مدینہ چل کر رہو اور چاہو تو تمہیں تمہارے گھر پہنچا دیا جائے۔ انھوں نے گھر جانا پسند کیا۔ چنانچہ نہایت عزت واحترام کے ساتھ گھر پہنچا دی گئیں۔[1]

عہد جاہلیت میں حضرت ابوبکر صدیق کی دو بیویاں تھیں ایک قتلہ بنت عبدالعزیٰ مادر عبداللہ و حضرت اسماء ذات النطاقین، دوسری ام رومان بن عامر والدہ عبدالرحمٰن وام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہما۔ ان میں سے مؤخر الذکر ایمان لائیں اور ہجرت کر کے مدینہ منورہ آگئیں۔

حضرت اسماء کا بیان ہے کہ جن ایام میں حدیبیہ کے مقام پر قریش سے معاہدہ ہوا ان دنوں میری والدہ مکہ معظمہ سے میرے پاس مدینہ منورہ آئیں اور مجھ سے مالی امداد طلب کی۔ میں نے آستانہ نبوت میں حاضر ہو کر التماس کی یارسول اللہ میری والدہ مکہ سے آئی ہیں اور ایسی حالت میں کہ اسلام سے بیزار ہیں مجھ سے مدد مانگتی ہیں۔ کیا مجھے کچھ اعانت کرنی چاہیے یا نہیں؟ فرمایا ہاں ضرور مدد کرو۔[2]

آپ ﷺ کو فتح مکہ کے موقعہ پر دشمنان اسلام پر مکمل دسترس حاصل تھی انھیں ان کے سابقہ جرموں کی بنا پر غلام، قیدی یا قتل کروایا جا سکتا تھا لیکن رحمت عالم نے ان سب کو معاف کر دیا اور کسی کو زبردستی اسلام قبول کرنے پر مجبور نہ کیا۔ یہ رواداری کی ایک اعلیٰ مثال ہے۔

اسی طرح جنگ جیسے نازک معاملے میں بھی آپ نے صحابہ کرامؓ کو آداب جہاد وقتال سے روشناس کرا کر رواداری کی بے مثال روایت قائم کی۔ شرک اللہ کے ہاں ناقابل معافی جرم ہے۔ ایک مشرک آدمی بھی اگر پناہ مانگے تو قرآنی تعلیمات کے مطابق اسے پناہ دینا اور محفوظ مقام تک پہنچانا مسلمانوں کی ذمہ داری قرار دی گئی ہے۔ اس سے بڑھ کر رواداری اور کیا ہو سکتی ہے۔

---

[1] طبقات ابن سعد، ۱/ ۳۳۶

[2] الجامع الصحیح للبخاری، کتاب الہبۃ، باب الہدیۃ للمشرکین (۲۶۲۰) الکتب ھبۃ، ص ۲۰۶

وَإِنْ أَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِينَ اسْتَجَارَكَ فَأَجِرْهُ حَتَّىٰ يَسْمَعَ كَلَامَ اللَّهِ ثُمَّ أَبْلِغْهُ مَأْمَنَهُ[۱]

"اور اگر کوئی مشرک تم سے پناہ کا خواستگار ہو تو اس کو پناہ دو یہاں تک کہ کلام خدا سننے لگے پھر اس کو امن کی جگہ پہنچا دو"۔

عدل:

غیر مسلموں سے تعلقات کے حوالے سے ایک بنیادی اصول عدل ہے۔ قرآن میں ہر کسی کے ساتھ عدل کرنے کا حکم ہے۔

إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ ......[۲]

"بے شک اللہ (سب کے ساتھ) عدل واحسان کرنے کا حکم دیتا ہے"۔

عدل کی ضد ظلم وزیادتی ہے اور اسلام ہر قسم کی ظلم وزیادتی کے خلاف ہے۔ وہ اپنے ماننے والوں کو عدل وانصاف کا پابند بناتا ہے اور عدل وانصاف کی بنیاد پر پورے معاشرے کی تعمیر چاہتا ہے، جس میں مسلم اور غیر مسلم دونوں شامل ہوتے ہیں۔

عدل کے ہم معنی لفظ قسط ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

قُلْ أَمَرَ رَبِّي بِالْقِسْطِ[۳]

"کہہ دو میرے رب نے عدل وقسط کا حکم دیا ہے"۔

ایک اور جگہ ارشاد ہے:

وَأَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيزَانَ بِالْقِسْطِ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا وَإِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبَىٰ ......[۴]

"ناپ اور تول کو پورا کرو انصاف کے ساتھ، ہم کسی شخص پر اتنی ہی ذمہ داری ڈالتے ہیں جتنی اس میں طاقت ہے اور جب کوئی بات کہو تو عدل وانصاف کے ساتھ کہو چاہے معاملہ قرابت داری کا ہی کیوں نہ ہو"

اس آیت میں بلا امتیاز مذہب یا قرابت داری کے سب کے ساتھ ناپ تول پورا کرنے اور قول میں عدل کا مظاہرہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ قرابت داری میں چونکہ عدل کرنا مشکل ہوتا ہے اس لیے اس کا ذکر خاص طور پر کیا گیا ہے۔ یہی بات اپنی ذات، والدین، رشتے دار اور امیر وغریب کے حوالے سے ایک اور جگہ زیادہ وضاحت اور پورے زوردار طریقے کے ساتھ یوں کہی گئی ہے:

---

۱ التوبہ ۶:۹

۲ النحل ۹۰:۱۶

۳ الاعراف ۲۹:۷

۴ الانعام ۱۵۲:۶

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰۤى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰۤى اَنْ تَعْدِلُوْا وَاِنْ تَلْوٗۤا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ۝ [1]

''اے ایمان والو عدل وقسط کو لے کر کھڑے ہو جاؤ اللہ کے لیے گواہی دینے والے ہو چاہے اس کی زد تمہاری ذات پر پڑے یا والدین اور رشتہ داروں پر۔ اگر صاحب معاملہ مالدار یا غریب ہے تو اللہ ان کا تم سے زیادہ خیر خواہ ہے لہٰذا تم خواہش کی اتباع نہ کرو کہ عدل سے پھر جاؤ اگر تم زبان کو موڑ کر بات کرو یا اعراض کرو تو اللہ جو کچھ تم کرتے ہو اس سے باخبر ہے''۔

اس آیت میں اجتماعی عزیز رشتوں کے مقابلے میں عدل کو ہر حال میں قائم کرنے کی تلقین ہے۔

اسلامی ریاست کی اولین ذمہ داری ہے کہ وہ ظلم کو ختم کرے اور عدل وانصاف قائم کرے۔ اسلام اپنے حدود واقتدار میں کسی قسم کی ناانصافی، حق تلفی اور ظلم وجور کا روادار نہیں ہوتا اور اسلام کے حدود واقتدار میں کسی نہ کسی حیثیت میں ہر وقت غیر مسلم بھی ہوتے ہیں ان کو ظلم سے بچانا اور عدل وانصاف دلانا اسلامی ریاست کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ اس لیے صاف حکم ہے:

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰۤى اَهْلِهَا وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ اِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهٖ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِيْعًا بَصِيْرًا ۝ [2]

''بے شک اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں اہل امانت کو پہنچاؤ اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو انصاف کے ساتھ فیصلہ کرو اللہ تمہیں اچھی نصیحت کرتا ہے بے شک اللہ سننے اور دیکھنے والا ہے''۔

اس آیت میں الناس کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جس سے مراد تمام لوگ ہیں خواہ وہ دشمن ہوں یا دوست، مسلم ہوں یا غیر مسلم، اپنے ہوں یا پرائے مسلمانوں کو اس بات کا پابند بنایا گیا ہے کہ وہ امانتیں ان کے اہل کو دیں گے اور بے لاگ انصاف لوگوں کو فراہم کریں گے۔

مولانا مودودی اس آیت کی تفسیر میں بنی اسرائیل کی خرابیاں بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو ہدایت کرتا ہے کہ تم کہیں ایسے بے انصاف نہ بن جانا خواہ کسی سے دوستی ہو یا دشمنی، بہرحال بات جب کہو انصاف کی کہو اور فیصلہ جب کرو عدل کے ساتھ کرو۔[3]

عدل وقسط کے لیے بوقت ضرورت طاقت کا استعمال بھی اسلام کی رو سے ضروری ہو جاتا ہے۔ سورہ الحدید میں ہے:

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ وَاَنْزَلْنَا

۱۔ النساء ۴:۱۳۵

۲۔ النساء ۴:۵۸

۳۔ تفہیم القرآن، ۱/۳۶۳

الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَأْسٌ شَدِيْدٌ[1]

''ہم نے اپنے رسولوں کو کھلی نشانیوں کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان نازل کی تا کہ لوگ عدل وقسط پر قائم ہوں اور ہم نے لوہا نازل کیا اس میں سخت (سامان) جنگ ہے۔''

اس آیت میں رسولوں کی بعثت کا مقصد تمام لوگوں کو خواہ وہ مسلم ہوں یا غیر مسلم ان کو عدل وقسط پر قائم کرنا قرار دیا گیا ہے۔ خواہ اس کام کے لیے انہیں لوہے یعنی طاقت کا استعمال ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔

اسلام ہر حال میں عدل وانصاف پر قائم رہنے کا حکم دیتا ہے اور فرد اور ریاست دونوں کو اس کا پابند بناتا ہے۔ عدل و انصاف کے معاملے میں اس کے نزدیک دوست اور دشمن کا فرق صحیح نہیں ہے۔ وہ دشمنوں اور مخالفوں کے ساتھ بھی عدل وانصاف کی پابندی کو لازمی قرار دیتا ہے اور کسی حال میں بھی اس سے انحراف کی اجازت نہیں دیتا۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰۤى اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝[2]

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو اللہ کے لیے کھڑے ہونے والے اور انصاف کی گواہی دینے والے بن کر رہو۔ کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس قدر مشتعل نہ کر دے کہ تم انصاف نہ کرو یہی بات تقویٰ سے زیادہ قریب ہے اور اللہ سے ڈرتے رہو بے شک اللہ جو کچھ تم کرتے ہو اس سے باخبر ہے''۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو انصاف کا علمبردار بننے کا حکم دیا ہے اور کسی قوم کی شدید عداوت یا دشمنی کے سے حالات میں بھی ان کے ساتھ عدل کا حکم دیا گیا ہے۔

اسلام کی تاریخ میں غیر مسلموں سے عدل وانصاف کی بے نظیر مثالیں ملتی ہیں۔ اسلام نے قتل کی سزا قصاص رکھی ہے یعنی جان کے بدلے جان۔ ایک مسلمان اگر کسی مسلمان کو قتل کر دے تو وہ بھی قتل کر دیا جائے گا۔ ایک ذمی اگر ایک مسلمان کو قتل کر دے تو وہ ضرور قتل کر ڈالا جائے۔ ایک مسلمان اگر ایک ذمی کو قتل کر دے تو اسے قطعاً قتل کر ڈالا جائے گا۔ **کتب علیکم القصاص فی القتلٰی**[3] مقتولین کے بارے میں تم پر قصاص واجب کیا گیا ہے۔ اس آیت کی تفسیر میں ابوبکر جصاص لکھتے ہیں:

''یوجب القتل المسلم بالذمی اذ لم یفرق شئی منها بین المسلم وللذمی و قوله تعالٰی کتب علیکم القصاص، عام فی الکل .... و لیس فی الایة فرق بین المسلم والکافر وجب اجراء حکمها علیهما و یدل علیه قوله عزوجل ومن قتل مظلوما فقد جعلنا لولیه سلطانا''.[4]

---

[1] الحدید۵۷:۲۵

[2] المائدہ۵:۸

[3] البقرہ۲:۱۷۸

[4] جصاص، ابوبکر احمد بن علی، احکام القرآن، المطبعۃ البہیۃ مصر ۱۳۴۷ھ، ۱:۱۴۲

''مقتول ذمی کے بدلہ میں قاتل مسلمان کا قتل واجب ہے کیونکہ (عام حقوق میں) ایک ذمی اور مسلمان کے مابین کوئی فرق نہیں ہے اور قصاص کے واجب ہونے کا حکم عام ہے سب میں''۔

اس آیت کریمہ کی رو سے (عام معاملات میں) ایک کافر اور مسلمان کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔ قصاص کا حکم دونوں پر جاری ہوگا اور اس پر اللہ تعالیٰ کا یہ قول دلیل ہے کہ جو مظلوم قتل ہوا ہم نے اس کے ولی کو دعوے کا حق دیا ہے۔ اسلام نے خون بہا یعنی دیت میں بھی مسلم اور غیر مسلم کا کوئی فرق روا نہیں رکھا بلکہ عدل کی اعلیٰ مثال قائم کی ہے۔

اگر مقتول کے ورثا بغیر کسی جبر واکراہ کے دیت لینے پر آمادہ ہو جائیں تو انہیں پوری دیت لینے کا حق حاصل ہے۔

قال ابوحنیفه و ابویوسف و محمد و زفر و عثمان ابتی و سفیان الثوری والحسن بن صالح دية الكافر مثل دية المسلم اليهودی و النصرانی و المجوسی و المعاهد والذمی سواء.

''ابوحنیفہ ابو یوسف اور محمد اور زفر اور عثمان البتی اور سفیان ثوری اور حسن بن صالح کا قول ہے کہ کافر کی دیت (خون بہا) مسلمان کی دیت کی طرح ہے یعنی یہودی، نصرانی، مجوسی اور معاہد اور ذمی کی دیت وہی ہے جو مسلمان کی''۔

اس کے لیے ابوبکر جصاص قرآن کی آیت کو دلیل بناتے ہوئے لکھتے ہیں:

قال ابوبكر الدليل على مساواتهم المسلمين فی الديات قوله عزوجل "ومن قتل مومنا خطا فتحرير رقبة مومنة ودية مسلمة الى اهله الا ان يصدقوا الى قوله و ان كان من قوم بينكم و بينهم ميثاق فدية مسلمة الى اهله [1]

''ابوبکر جصاص کہتے ہیں کہ کافروں اور مسلمانوں کی دیت کی مساوات اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے کہ اگر کسی مسلمان نے کسی مسلمان کو غلطی سے قتل کر دیا تو ایک مسلمان غلام کا آزاد کرنا اور اس کے ورثا کو دیت دے دینا اور اگر تم میں اور کافروں میں کوئی عہد ہو تو مقتول کے ورثاء کو پوری دیت دی جائے گی''۔

آپ ﷺ کا چوری کی سزا نافذ کرتے وقت یہ فرمانا کہ اگر فاطمہ بنت محمد بھی چوری کرتی تو میں اس کا ہاتھ بھی کاٹ دیتا۔ یہ بے لاگ انصاف کی ایک اعلیٰ مثال ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا عدل تو ایک ضرب المثل کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان کے بیٹے ابو محمہ نے جب شراب پی تو خود اپنے ہاتھ سے انہیں ۸۰ کوڑے مارے [2]

یحییٰ بن آدم القرشی کتاب الخراج میں ایک روایت نقل کرتے ہیں:

---

[1] احکام القرآن، ۲/ ۲۹۰

[2] الفاروق، مکتبہ رحمانیہ لاہور، س ن، ص ۳۰۹

ان رجلا من المسلمين قتل رجلا من اهل الكتاب فرفع الی النبی ﷺ فقال رسول الله ﷺ انا حق من و فی بذمته ثم امر به فقتل [1]

"ایک مسلمان نے ایک اہل کتاب کو قتل کر دیا اور وہ مقدمہ نبی کریم ﷺ کے پاس فیصلے کے لیے آیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں اہل ذمہ کا حق ادا کرنے کا سب سے زیادہ ذمہ دار ہوں چنانچہ آپ نے قاتل کے بارے میں قتل کرنے کا حکم دیا اور اسے قتل کر دیا گیا"۔

مذکورہ حقائق اس بات کی نشان دہی کرتے ہیں کہ اسلام نفاذ عدل میں کسی قسم کی طرفداری کا قائل نہیں اس کے ہاں قانون کی نظر میں تمام انسان بلا امتیاز مذہب و نسل یکساں ہیں۔

عدم تشدد / اعتدال توازن:

اسلام امن و سلامتی کا دین ہے۔ اس نے مسلمانوں کو تشدد اور ظلم کی راہ سے روکا ہے اور ہر کام میں اعتدال و توازن اور ہر سطح پر امن و سلامتی کو برقرار رکھنے کی تعلیم دی ہے۔ داعی اسلام حضرت محمد ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے رحمۃ للعالمین قرار دیا ہے۔ آپ کی حیات طیبہ کا ایک ایک ورق رحمت عالم ہونے کی صداقت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ آپ نے دشمنوں کی طرف سے طعن و تشنیع کے تیر سہے اور گالیاں دینے والوں کو دعائیں دیں اور بدترین دشمنوں پر مکمل قابو پا کر ان کے لیے عام معافی کا اعلان فرمایا۔

دین اسلام کے بسرعت پھیلنے کا سبب بھی آپ کی عدم تشدد کی پالیسی تھی۔ آپ انتہائی نرم خو اور نرم دل تھے۔ قرآن مجید میں ہے:

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ...... [2]

"پس اللہ کی رحمت سے آپ ان کے لیے نرم خو ہو گئے ہیں اگر آپ تند مزاج، سخت دل ہوتے تو یہ لوگ آپ کے پاس سے منتشر ہو جاتے"۔

یہ آیت اس حقیقت کو واضح کر رہی ہے کہ اگر آپ درشت خو تند ہوتے تو لوگ آپ کے گرد بھی جمع نہ ہوتے۔

دین اسلام پر غیر مسلم جن وجوہات کی بنا پر تشدد پسندی کا الزام اور بہتان لگاتے ہیں ان میں زیادہ نمایاں یہ تین الزام ہیں:

(۱) اسلام تلوار سے پھیلا ہے۔

(۲) جہاد تشدد پسندی کی بنیاد ہے۔

(۳) اسلامی سزاؤں پر تشدد پسندی کا الزام۔

ذیل میں ان تینوں الزامات کا جائزہ لیا جاتا ہے۔

---

[1] یحییٰ بن آدم، القرشی، کتاب الخراج، ص ۸۲

[2] آل عمران ۳:۱۵۹

<u>الزام اول:</u> جو لوگ تلوار کے استعمال کی وجہ سے اسلام پر تشدد پسندی کا الزام لگاتے ہیں وہ خود تلوار کو شجر ممنوعہ نہیں سمجھتے بلکہ ان کے اکثر قومی ہیرو وہی ہیں جن کو تلوار استعمال کرنے کے فن میں کمال حاصل تھا۔ وہ صرف یہ کہہ کر اسلام کے خلاف یک طرفہ ڈگری جاری کرتے ہیں کہ دنیوی معاملات میں تو تلوار کا استعمال ناگزیر ہے لیکن دین کے حوالے سے تلوار کے استعمال کو جائز قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اور اس سے اسلام دشمن عناصر نے یہ پروپیگنڈا کیا کہ اسلام کی اشاعت میں بھی کلی طور پر شمشیر کے زور پر ہوئی ہے اس لیے مسلمان نام ہی تشدد پسندی کا ہے۔ وہ اسلامی غزوات کو بھی جو خالص ظلم و زیادتی کے خلاف یا دفاع کے لیے ﷺ انہیں بھی ڈاکے مارنے سے تعبیر کرتے ہیں۔

منٹگمری واٹ اسلامی جنگوں کے بارے میں کہتا ہے:

> "As these expeditions, even that to badar were crazies,
> where the aim was to capture booty without undue dang e r
> to one self."

> ''بدر کی مہم سمیت یہ مہمیں محض ڈاکے تھے اور ان کا مقصد یہ تھا کہ غیر ضروری خطرات مول لیے بغیر مال غنیمت اکٹھا کیا جائے۔''[۱]

دوسری جگہ لکھتا ہے:

> ''اور ڈاکے و جہاد میں فرق صرف نام کی تبدیلی کا تھا۔ اس طرح وہ کام جو دراصل ڈاکہ ہی تھا اس کو مذہبی رنگ دینے کی کوشش کی گئی۔''[۲]

جبکہ نارانڈرائے لکھتا ہے:

> ''اسلام کی اصل منبع ہی تلوار ہے''۔[۳]

دنیا میں حق و باطل کی کشمکش روزِ ازل سے جاری ہے اور جاری رہے گی۔ تلوار کا استعمال ظلم ہے یا انصاف؟ اس کا فیصلہ کسی شخص کے ہاتھ میں تلوار دیکھ کر نہیں کیا جا سکتا بلکہ اس کا فیصلہ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے یہ دیکھا جائے کہ جس شخص نے تلوار اٹھا رکھی ہے اس نے یہ تلوار کسی دوسرے شخص کی آزادی چھیننے کے لیے استعمال کی ہے یا اس نے اپنے حقوق کی طرف اٹھنے والے ظالمانہ ہاتھ کو روکنے کے لیے تلوار کا سہارا لیا ہے۔ اگر کسی شخص نے دوسروں کے حقوق پر ڈاکہ ڈالنے کے لیے تلوار اٹھائی ہے تو ظالم

۱۔ Muhammad at Madina, Oxford University Press, Karachi, 2004, p. 231

۲۔ محمد پرافٹ اینڈ سٹیٹسمین از منٹگمری واٹ، ص ۱۴۷

۳۔ Muhammad the man and his faith, New York, 1960, p.147

اور تشدد ہے اور اگر کسی نے تلوار اس لیے اٹھائی ہے کہ ظالم کے ظلم کا راستہ روک سکے تو ایسا شخص نہ صرف حق پر ہے بلکہ ایسا شخص تو معاشرے کے ان تمام کمزور افراد کے لیے فرشتہ رحمت بن جاتا ہے جو ظالم کے سامنے بے بس ہوتے ہیں۔ اس بات کو سامنے رکھا جائے تو یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ تلوار کے استعمال کا حق خود زندگی کے حق کی طرح مقدس ہے اور بوقت ضرورت اپنے دفاع میں تلوار استعمال کرنے کے حق سے محروم کرنا ظلم ہے۔

اگر تلوار کے استعمال کو جائز سمجھنے کی وجہ سے اسلام کو تشدد پسند ٹھہرایا جائے تو پھر اس الزام سے تو کوئی پیغمبر اور عظیم دینی رہنما بھی بچ نہیں سکیں گے۔ جیسا کہ یہودیوں کو ان کی آسمانی کتاب کے ذریعہ حکم دیا گیا تھا:

> ''جب تمہارا خدا تمہیں اس سرزمین میں پہنچا دے جس پر قبضہ کرنے تم جا رہے ہو اور وہ ''حتیوں'' وغیرہ سات قوموں کو جو تم سے اعداد اور قوت میں زیادہ ہیں ان سے ان علاقوں کو خالی کر دے اور تمہارا رب یقیناً ان قوموں کو تمہارے رحم و کرم پر چھوڑ دے گا۔ تمہیں چاہیے کہ تم ان کو شکست دو، تمہیں چاہیے کہ تم ان کو تباہ و برباد کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھو۔ تم ان کے ساتھ نہ تو کسی قسم کا کوئی معاہدہ کرو اور نہ ہی ان کے ساتھ نرمی اور شفقت کا سلوک کرو۔''[۱]

آپ ﷺ اور آپ کے ساتھیوں نے تلوار کا استعمال اپنے دفاع یا فتنہ دبانے کے لیے یا مظلوموں کی دادرسی کے لیے ضرور کیا مگر کبھی بھی کسی غیر مسلم کو مسلم بنانے کے لیے تلوار کا استعمال نہیں کیا۔ کیونکہ قوت کے زور پر کسی کو مسلمان بنانا دراصل اس کو منافق بنانا ہے اور نفاق کی سزا تو کفر سے بھی زیادہ ہے۔ ان المنافقین فی الدرک الاسفل من النار[۲] اس لیے اسلام تو خیر خواہی کا دین ہے اور پیغمبر اسلام رحمت عالم ہیں۔ وہ کسی کو منافق بنانے کا سوچ بھی نہیں سکتے۔ اس لیے قرآن نے واضح الفاظ میں مسلمانوں کو حکم دیا ہے:

لَا اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ[۳]

اور پیغمبر علیہ السلام کو حکم دیا ہے کہ آپ کے ذمہ صرف ابلاغ ہے حساب لینا نہیں ہے:

اِنَّمَا عَلَیْکَ الْبَلٰغُ وَعَلَیْنَا الْحِسَابُ ۝[۴]

''تمہارا کام (ہمارے احکام) پہنچا دینا ہے اور ہمارا کام حساب لینا ہے''۔

لست علیھم بمصیطر[۵]

تاریخ شاہد ہے کہ آپ ﷺ نے کسی ایک شخص کو بھی جبراً مسلمان نہیں بنایا۔

۱۔ کتاب مقدس، استثناء، پاکستان بائبل سوسائٹی، ۱۹۸۲ء، باب ۷ آیات ۱تا۲

۲۔ النساء۴:۱۴۵

۳۔ البقرہ۲:۲۵۶

۴۔ الرعد۱۳:۴۰

۵۔ الغاشیہ۸۸:۲۲

"یہ بات ثابت نہیں کہ حضور ﷺ نے کسی شخص کو زبردستی اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا ہو بلکہ یہ بات ثابت ہے کہ بعض انصار نے اپنے بچوں کو زبردستی حلقہ اسلام میں داخل کرنے کا ارادہ کیا تو حضور ﷺ نے ان کو ایسا کرنے سے منع کر دیا۔"[۱]

الزام دوم۔ جہاد:

غیر مسلم اسلام کے تصور جہاد کو دنیا میں تشدد پھیلانے اور خوف وہراس کو ہوا دینے کا ایک آلہ قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ جہاد ایک جامع عبادت ہے اس کا ایک جزو قتال ہے جس کی اجازت اس وقت دی گئی جب عالم کفر مسلمانوں کو نیست ونابود کرنے پر تل گیا تھا اور مفاہمت کی تمام راہیں مسدود ہو گئی تھیں۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ہے:

أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا وَإِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ ۝[۲]

"جن لوگوں سے جنگ کی جا رہی ہے انہیں جنگ کرنے کی اجازت دے دی گئی ہے کیونکہ وہ مظلوم ہیں اور بے شک اللہ ان کی مدد ونصرت کرنے پر قدرت رکھتا ہے"۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:

وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ ۝[۳]

"اور تم اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں اور زیادتی نہ کرو کہ بے شک اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔"

سورہ النساء میں اس کی مزید وضاحت یوں کی گئی:

وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا أَخْرِجْنَا مِنْ هَٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ أَهْلُهَا وَاجْعَل لَّنَا مِن لَّدُنكَ وَلِيًّا وَاجْعَل لَّنَا مِن لَّدُنكَ نَصِيرًا ۝[۴]

"اور تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ اللہ کی راہ میں کمزور مردوں، عورتوں اور بچوں کی خاطر نہیں لڑتے جو فریاد کر رہے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہمیں اس بستی سے نکال جس کے باشندے ظالم ہیں اور اپنی طرف سے ہمارا کوئی حامی اور مددگار پیدا کر"۔

فتنہ وفساد کو ختم کرنے کے لیے لڑائی کو ضروری قرار دیا گیا ہے:

۱۔ امام محمد ابوزہرہ، خاتم النبیین، دار الفکر العربی قاہرہ، س ن، ص ۵۸۳

۲۔ الحج ۲۲:۳۹

۳۔ البقرہ ۲:۱۹۰

۴۔ النساء ۴:۷۵

وَقَاتِلُوهُمْ حَتّٰى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ [1]

''ان سے لڑتے رہو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے''

یقیناً بعض اوقات قتال سے روگردانی فساد کا سبب بن جائے گی:

إِلَّا تَفْعَلُوهُ تَكُن فِتْنَةٌ فِي الْأَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيرٌ ۝ [2]

''تو (مومنو) اگر تم (یہ کام) نہ کرو گے تو ملک میں فتنہ برپا ہو جائے گا اور بڑا فساد مچے گا''۔

مذکورہ آیات سے واضح ہوتا ہے کہ اسلام کا تصور جہاد و قتال دفاع، مظلوموں اور بے کسوں کی دادرسی کے لیے ہے۔ اور فتنہ اور فساد کبیر کو روکنے کا ایک ذریعہ ہے نہ کہ تشدد کو ہوا دینے کا آلہ۔ اسلام کا یہ امتیاز ہے کہ اس نے جنگ کو بھی اخلاقی قوانین کا پابند بنا دیا اور اس کے دوران بھی زیادتی کو حرام قرار دیا اور عورتوں بچوں راہبوں کے قتل سے منع کیا۔ نیز ہتھیار پھینکنے والوں سے ہاتھ روکنے کا حکم دیا۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ جب لشکر روانہ کرتے تو انھیں نصیحت فرماتے:

''اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ نکلو اور اللہ کے راستے میں کافروں کے ساتھ لڑائی کرو۔ غدر نہ کرو، خیانت نہ کرو، بچوں اور خانقاہ نشینوں، زاہدوں کو قتل نہ کرو۔'' [3]

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ایک غزوہ میں دیکھا کہ ایک عورت قتل کی گئی ہے تو آپ نے اسے ناپسند کیا اور بچوں اور عورتوں کے قتل سے منع کر دیا۔ [4]

آپ ﷺ نے دوران جنگ لوٹ مار اور مثلہ کرنے کی بھی ممانعت فرمائی۔

حضرت عبداللہ بن یزید انصاری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے لوٹ مار اور مثلہ کرنے سے منع فرمایا ہے۔ [5]

قرآن و حدیث کی مذکورہ تعلیمات سے پتہ چلتا ہے کہ جہاد اور اس کے اصلاحی قوانین محض جنگ نہیں ہیں بلکہ یہ جنگ مظلوموں کی مدد اور انسانی زندگی کی آزادی کی جنگ ہے اسے تشدد کے زمرے میں لانا ظلم ہوگا۔

الزام سوم۔ اسلامی سزاؤں میں تشدد پسندی:

اسلام معاشرہ میں بے حیائی اور بدکاری کو ناپسند کرتا ہے اور بے حیائی کو پسند کرنے والوں کے لیے دنیا و آخرت میں عذاب کی خبر دیتا ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

۱۔ الانفال ۸:۳۹

۲۔ الانفال ۸:۷۳

۳۔ مسند احمد ۱/۲۶۶

۴۔ الجامع الصحیح للبخاری، کتاب الجہاد، باب قتل النساء فی الحرب (۳۰۱۴) الکتب الستۃ، ص ۲۴۲

۵۔ الجامع الصحیح للبخاری، کتاب المظالم، باب النہی بغیر اذن صاحبہ (۲۴۷۴) الکتب الستۃ، ص ۱۹۵

إِنَّ الَّذِينَ يُحِبُّونَ أَن تَشِيعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِينَ آمَنُوا لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ O ۱

''بے شک جو لوگ پسند کرتے ہیں کہ مومنوں میں بے حیائی پھیلے ان کو دنیا و آخرت میں دکھ دینے والا عذاب ہوگا اور خدا جانتا ہے اور تم نہیں جانتے''۔

جن جرائم پر اللہ تعالیٰ نے باقاعدہ سزا رکھی ہے ان میں سے ایک زنا ہے۔

وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنَىٰ إِنَّهُ كَانَ فَاحِشَةً وَسَاءَ سَبِيلًا O ۲

''اور زنا کے پاس نہ جانا کہ وہ بے حیائی اور بری راہ ہے''۔

زنا سے معاشرے میں فحاشی پھیلتی ہے اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ ایک صالح معاشرے کی بنیادیں گرنا شروع ہو جاتی ہیں۔ اسلام سب سے پہلے بچاؤ کی تدابیر اختیار کرتا ہے وہ شرم وحیا کا حکم آوارگی سے روکتا ہے مرد وزن کے آزادانہ میل جول پر قدغن لگاتا ہے۔ فتنے سے ڈراتا ہے اور فحاشی سے روکتا ہے۔

نکاح کی ترغیب دے کر اس سے بچنے کی تدبیر کرتا ہے اور جو لوگ نکاح کی استطاعت نہیں رکھتے ان کی مالی امداد کرنے کا مومنوں کو حکم دیتا ہے۔ اگر یہ ممکن نہ ہو سکے تو روزوں کے ذریعے اپنے جسم میں اعتدال لانے کی تلقین کرتا ہے۔

اے نوجوانوں کے گروہ تم میں سے جو نکاح کی طاقت رکھتا ہو اسے نکاح کر لینا چاہیے کیونکہ اس سے آنکھوں کی حیا اور شرم گاہ کی حفاظت حاصل ہوتی ہے اور نکاح نہ کر سکے تو اسے روزہ رکھنا چاہیے کیونکہ یہ اس کے لیے برائی سے بچنے کا ذریعہ ہے۔

اسلام نے ورزش اور شہسواری کی جو ترغیب دی ہے اس میں دوسرے فوائد کے علاوہ یہ فائدہ بھی ہے۔

ان سب اقدامات کے بعد بھی اگر کوئی بندہ زنا کرلے تو خاندانی امن اور معاشرے کے توازن کو برقرار رکھنے کے لیے بدکار مرد اور عورت کے لیے عبرت ناک سزا رکھی گئی ہے۔

الزَّانِيَةُ وَالزَّانِي فَاجْلِدُوا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ وَلَا تَأْخُذْكُم بِهِمَا رَأْفَةٌ فِي دِينِ اللَّهِ إِن كُنتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَائِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِينَ O ۳

''زنا کار عورت ہو یا مرد، ان میں سے ہر ایک کو سو کوڑے لگاؤ اگر تمہارا آخرت کے دن اور اللہ پر ایمان ہے تو دینِ خداوندی کے بارے میں ان پر نرمی نہ کرو۔ اور ایمانداروں کی ایک جماعت کو ان کی سزا کے موقع پر ہونا چاہیے''۔

---

۱ النور ۲۴:۱۹

۲ الاسراء ۱۷:۳۲

۳ النور ۲۴:۲

جناب رسالت مآب ﷺ نے شادی شدہ مرد یا عورت کو کوڑوں کی بجائے رجم کی سزا دی ہے۔ زنا کی سزا کوڑوں یا رجم کی شکل میں تبھی دی جاتی ہے جب چار گواہ موجود ہوں۔ اور یہ صرف اسی وقت ممکن ہوتا ہے جب کہ زناکار اس قدر ڈھٹائی سے کام لے کہ مسلح ساتھیوں کے ساتھ کسی گھر میں اہل خانہ کے سامنے اس سنگین جرم کا ارتکاب کرے یا پھر اس قدر ڈھیٹ ہو چکا ہو کہ پبلک مقامات پر اس قبیح حرکت کو کرنے لگے۔

ایسی صورت حال میں زانی پر یہ سزا نافذ کر کے معاشرے کے غریب طبقے اور پارسا طبقے کو اس وبا سے بچانے کے لیے زنا کی سزا تشدد کے زمرے میں لانا کسی طرح بھی درست نہ ہوگا۔

چوری کی سزا اسلام نے ہاتھ کاٹ دینا رکھی ہے۔ وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْا أَيْدِيَهُمَا[1] اس پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ یہ سخت ہے۔ یہ بات ناعلمی کی بنا پر کی جاتی ہے۔ ہاتھ کاٹنا چوری کی انتہائی سزا ہے۔ اس سے نیچے بھی عدالت جرم کے مطابق جرمانہ قید یا درے لگا دینے کا فیصلہ دیتی ہے۔ لیکن اگر کوئی چور واضح طور پر چور ثابت ہو جائے تو پھر معاشرے کو اس کے شر سے بچانے کے لیے یہ سزا دینا تشدد نہ ہوگا۔ رسول اکرم ﷺ کا فرمان ہے کہ زمین میں اللہ کی ایک حد کا قائم کرنا وہاں کے انسانوں کے لیے چالیس روز کی بارش سے بہتر ہے۔[2]

الحاصل اسلام نے جو حدود و تعزیرات قائم کرنے کا حکم دیا ہے وہ معاشرے میں امن کے قیام کے لیے ہے اس کی مثال کینسر کے پھوڑے کی سی ہے جسے کاٹنا پورے جسم کو بچانے کے لیے بھی ضروری سمجھتے ہیں اور اسے تشدد سے تعبیر نہیں کرتے۔

امن و آشتی:

بنی نوع انسان میں حضرت آدمؑ کے بیٹے قابیل سے لے کر اب تک امن کی ضرورت و اہمیت کو شدت سے محسوس کیا جا رہا ہے۔ انسانی تاریخ کا کوئی بھی دور امن کی طلب و فریاد سے خالی نہیں رہا۔ شر کے ساتھ خیر اور فساد کے ساتھ امن کے لیے جستجو کا عمل جاری ہے۔ قابل غور بات یہ ہے کہ طلب امن میں انسان صادق کہاں تک ہے اور اپنے اختیاری دائرے میں اس کے اقدامات امن و آشتی کے لیے کہاں تک مخلصانہ رہے اور جو نظریات، تدابیر اور نظام اس سلسلے میں انسانوں نے اختیار کیے وہ کہاں تک معقول اور درست ہیں۔ بدامنی کا پودا از خود نہیں اگتا بلکہ اس میں لوگوں کی اپنی کارستانیاں کارفرما ہوتی ہیں۔ جس کی طرف اشارہ قرآن نے یوں کیا ہے:

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ[3]

''خشکی اور تری میں لوگوں کی بداعمالیوں کے باعث فساد پھیل گیا''۔

قانون فطرت و نظام قدرت میں ایسا کبھی نہیں ہوا کہ نفرتوں کا بیج بو کر محبت کی فصل کاٹی گئی ہو۔ بدامنی کی بنیادی وجوہات

---

[1] المائدہ ۵: ۳۸

[2] سنن نسائی، کتاب قطع السارق، باب الترغیب فی اقامۃ الحد (۴۹۰۹) الکتب الستۃ، ۲۴۰۵

[3] الروم: ۴۱

اور عوامل ہر دور میں تقریباً ایک جیسے ہی رہے ہیں جو درج ذیل ہیں:

(i) نفسانی خواہشات و مطالبات، ہوس و آرزو

(ii) قوت و جبر کا استعمال، سرچشمہ قوت سمجھنے کے رجحانات

(iii) لینے اور چھیننے کا نظریہ، مطالبات، حقوق

(iv) ضروریات زندگی کی حرص، اس کی مجبوریاں اور محرومیاں۔

لیکن ہر عہد میں بدامنی کی انہیں وجوہات کو خوبصورت توجیہات کے ذریعے اور خوش رنگ نام تراش کر امن کی علامت ثابت کرنے کی کوششیں ہوتی رہیں اور ہو رہی ہیں۔ جن کے نتائج ہر دور میں بڑے مہلک اور خطرناک نکلے ماسوائے ان اوقات کے کہ جن میں انسان انبیاء و رسول کی راہ پر چلے۔ تہذیب و تمدن کے بلند بانگ دعوؤں اور سائنسی ترقی کے باوجود انسان نے انسان کو نوچا اور اس کا استحصال کیا۔

بغور جائزے سے یہ بات آسانی واضح ہوتی ہے کہ الہامی تعلیمات و ہدایات کے علاوہ کوئی اور چیز ایسی نہیں جو انسانوں کے لیے حقیقی امن و آشتی کی منزل کے حصول کا سبب بنے۔

یہی تعلیمات پیغمبر آخرالزماں لے کر اس دنیا میں تشریف لائے۔ آپ کی عطا کردہ امن کی بنیادوں کے علاوہ اور جتنی راہیں انسان نے امن کے لیے اختیار کی ہیں وہ اس منزل کی طرف جاتی ہی نہیں ہیں۔ نتیجتاً انسان منزل کی تلاش میں اور زیادہ بھٹک گیا ہے۔ انسان نے خود ساختہ افکار کے خوش کن سرابوں سے، بہت دھوکے کھائے ہیں۔ مظلوموں کی چیخیں، بے بسوں کی آہیں اور ستم رسیدہ انسانوں کے نوحے مسیحائی چاہتے ہیں۔

دوسری جنگ عظیم میں جب ایٹم نے لاکھوں انسانوں کو لقمۂ اجل بنا لیا اور اسلحہ و بارود کے بے دریغ استعمال سے انسانیت تڑپ رہی تھی، انسانوں نے درندوں کا روپ دھار لیا تھا اور آنکھوں میں پانی کی جگہ خون اتر آیا تھا۔ انسانیت کی بے حسی اور آدمیت کی بے حسی کو دیکھ کر کہا گیا:

''آج اگر محمد (ﷺ) کو حکم مان لیا جائے تو امن قائم ہو سکتا ہے''۔[1]

آنحضرت ﷺ نے امن اور احترام آدمیت پر مبنی ایسا معاشرہ قائم فرمایا تھا جس میں اگر کسی غیر مسلم شہری کے ساتھ کوئی مسلمان زیادتی کرتا تو آپ خود مظلوم غیر مسلم کی طرف سے ولی بن کر مسلمان کے خلاف فیصلہ صادر فرماتے تھے۔

آنحضرت ﷺ نے ذمی کے قتل تک کو ناپسند فرمایا اور اس کے قاتل کے لیے جنت کی خوشبو تک نہ پانے کی بات کی۔[2]

اسلام کی تعلیمات تو اس حد تک امن پر مبنی ہیں کہ جانوروں تک کو ایذاء پہنچانا غلط قرار پاتا ہے۔ یہاں تک کہ ذبح کرتے وقت بھی احسان کی تلقین فرمائی اور چھری کو تیز کرنے اور ذبیحہ کو آرام پہنچانے کی تلقین کی ہے۔[3]

---

[1] اسحاق قریشی، پروفیسر، حضور اکرم پیغمبر امن و سلامتی، لاہور: مکتبہ زاویہ، ۱۹۹۸ء، ص ۳۵

[2] الجامع الصحیح للبخاری، کتاب الجزیہ، باب اثم من قتل معاہدا بغیر جرم (۳۱۶۶) الکتب الستۃ، ص ۲۵۶

[3] صحیح مسلم، کتاب الاضاحی باب الامر باحسان الذبح والقتل (۵۰۵۵) الکتب الستۃ، ص ۱۰۲۷

دین اسلام تو ہمیں انسانوں کے ساتھ ساتھ جانوروں کے ساتھ بھی اچھے سلوک کا حکم دیتا ہے۔

حضرت اسامہ بن زیدؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک چھوٹے لشکر کے ساتھ ہمیں حرقات (چند قبیلوں کا نام ہے) کی طرف بھیجا۔ انہوں نے ہماری خبر سن لی اور بھاگ گئے۔ ایک آدمی کو ہم نے پکڑ لیا تو وہ لا الہ الا اللہ کہنے لگا مگر ہم نے اسے مار ڈالا۔ یہ واقعہ میں نے حضور ﷺ کی خدمت میں بیان کیا تو آپ نے فرمایا:

''روز قیامت کلمہ گو کے مدمقابل تیری مدد کون کرے گا''۔[1]

امن کو ترجیح:

اسلام نے جنگ کی اسی حالت میں اجازت دی جب کہ امن وامان کے راستے بند ہو جائیں اور سوائے جنگ کے کوئی دوسرا راستہ نہ ہو۔ اسلام ایک دین دعوت ہے وہ اپنے فکر کو عام کرنا چاہتا ہے۔ امن وامان کے ماحول میں اس پر سنجیدگی سے غور کرنے اور اس کے پھیلنے کے جتنے امکانات ہیں، حالت جنگ میں یہ امکانات کم تر ہو جائیں گے۔ اس لیے اسلام نے امن وامان اور صلح وآشتی کو بڑی اہمیت دی ہے۔ حکم ربانی یہی ہے کہ اگر دشمن مصالحت اور جنگ بندی کے لیے آمادہ ہو تو خدا کے بھروسہ پر مصالحت کر لی جائے تا کہ جنگ کی فضا ختم ہو اور اس کے نقصانات سے بچا جا سکے۔

وَإِن جَنَحُوا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ۝[2]

اس حوالے سے یہاں تک فرمایا کہ اگر صلح کے نام پر دشمن فریب بھی دینا چاہے تو گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ صلح کی پیشکش کا خیر مقدم کرنا بہتر ہے۔ اللہ تمہاری مدد کرے گا:

وَإِن يُرِيدُوا أَن يَخْدَعُوكَ فَإِنَّ حَسْبَكَ اللّٰهُ هُوَ الَّذِي أَيَّدَكَ بِنَصْرِهِ وَبِالْمُؤْمِنِينَ ۝[3]

''وہ اگر تمہیں دھوکہ دینا چاہیں (تا کہ اس مہلت میں مزید جنگی تیاری کر سکیں) تو اللہ تمہاری مدد کے لیے کافی ہے اس نے اپنی مدد سے اور مومنین کے ذریعہ تمہیں تقویت پہنچائی ہے''۔

یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اسلام میں جنگ پر صلح کو ترجیح دی گئی ہے۔ جہاں صلح کا امکان ہو وہاں اسی کو اختیار کرنے کا حکم دیتا ہے۔

امن وسلامتی کے نام پر آج دنیا میں مختلف نظریات کا ورود ہے۔ سیکولرازم، کمیونزم، کیپٹل ازم، نیشنل ازم اور کئی دوسرے ازم کارفرما ہیں۔ کبھی سلامتی کونسل کی خدمات کا شور اٹھتا ہے اور کبھی یو۔این انٹرنیشنل آرمی بنان اور کبھی ورلڈ پیس کونسل کے اجلاس ہوتے ہیں۔ کہیں روس کی امن مہمات اور امریکہ اور اس کے اتحادیوں کے دنیا میں امن قائم کرنے کے دعوے اور مسلمانوں پر ظلم وستم، تاہم امن وسلامتی دنیا سے ناپید اور انسانی جان ومال اپنی صحیح قدر وقیمت سے محروم ہیں۔ نہ عالمی تنازعات اور تناؤ میں کمی ہے اور نہ عام انسان ہی موت وحیات کی کشمکش سے محفوظ ہیں۔

---

[1] سنن ابی داود، کتاب الجہاد، باب علی ما یقاتل المشرکون (۲۶۴۳) الکتب العربیۃ، ص ۱۴۱۸
[2] الانفال ۸:۶۱
[3] الانفال ۸:۶۲

اس لیے اس وقت محمدی نظام امن کو دنیا کے سامنے پیش کرنے کی ضرورت ہے جو ہر انسان کو امن وعافیت کی ضمانت فراہم کرتا ہے۔ جس میں انسانی وحدت ومساوات، باہمی تعاون، شرافت انسانی، عفو ودرگزر اور اخوت وحمیت کو جزو لازم کی حیثیت حاصل ہے۔ جس میں کبر وغرور، ملکی ونسلی عصبیت اور حب جاہ واقتدار کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

انسانی فلاح:

پیغمبر اسلام کو اللہ تعالیٰ نے سارے جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے اور آپ کی رسالت قیامت تک آنے والے تمام انسانوں کے لیے ہے۔

قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا [1]

''کہہ دواے لوگو بے شک میں تم سب لوگوں کی طرف اللہ کا رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں''۔

آپ ﷺ تمام عمر انسانی فلاح کے لیے کام کرتے اور آپ نے اپنی امت کو بھی اس کام پر لگایا۔

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ [2]

''تم بہترین امت ہو تمہاری تخریج لوگوں کے لیے ہے''۔

جس طرح آپ ﷺ آخری نبی ہیں اسی طرح آپ کی امت بھی آخری امت ہے۔ آپ کی رسالت سب انسانوں کے لیے ہے تو آپ کی امت کی تخلیق بھی تمام انسانوں کے لیے ہے۔ پیغمبر اسلام حضرت محمد ﷺ نے اپنے کردار اور احکام کے ذریعے انسانی فلاح کا جو کام کیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ پہلی وحی کے موقع پر جب آپ کی طبیعت پر گھبراہٹ طاری ہوئی تو آپ کی رفیقہ حیات نے آپ کا تعارف جن الفاظ میں کرایا اس سے پتہ چلتا ہے کہ دعوئ نبوت سے قبل بھی آپ ﷺ کی زندگی انسانی فلاح کے کاموں کے لیے وقف تھی۔ حضرت خدیجہؓ نے آپ کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا تھا:

ہرگز نہیں اللہ کی قسم اللہ آپ کو کبھی رسوا نہیں کرے گا کیونکہ آپ رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک کرتے ہیں لوگوں کے بوجھ اٹھاتے ہیں، ناداروں اور محتاجوں کی مدد کرتے ہیں مہمان نوازی کرتے ہیں اور مصیبت کے دنوں میں متاثرہ لوگوں کی مدد کرتے ہیں۔ [3]

نبوت کے بعد آپ کی ان صفات میں مزید اضافہ ہوا اور آپ کی یہ خصوصیات مسلم اور غیر مسلم دونوں کے لیے تھیں۔ آپ ﷺ انسانی دکھ درد کو نہ صرف گہرائی سے دیکھتے تھے بلکہ ان کے دکھ درد کو اپنا سمجھتے ہوئے انسانی مشکلات کے حل میں گہری دلچسپی لیتے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کا تعارف ان الفاظ میں کرایا ہے:

---

[1] الاعراف ۷:۱۵۸

[2] آل عمران ۳:۱۱۰

[3] الجامع الصحیح للبخاری، کتاب بدء الوحی، باب کیف بدء الوحی الی رسول اللہ ﷺ (۳) المکتبۃ السلفیۃ، مص،

لَقَدْ جَاءَ كُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُم بِالْمُؤْمِنِينَ رَؤُوفٌ رَّحِيمٌ O ل

"بے شک تمہارے پاس ایک رسول تمہارے ہی درمیان سے آیا ہے تمہاری تکلیف اس پر گراں گزرتی ہے وہ تمہاری بھلائی کا حریص ہے اور مومنوں پر مہربان اور شفیق ہے"۔

اسلام نے انسانوں کی روحانی مشکلات حل کرنے اور اخلاقی برائیوں کی اصلاح کرنے کے ساتھ ساتھ معاشرے کے رنج وغم کو سکھ اور مسرت میں بدلنے کے لیے نیکی کا ایک جامع پروگرام دیا ہے جسے اپنا کر انسانیت فلاح وکامرانی سے ہم کنار ہو سکتی ہے۔

لَيْسَ الْبِرَّ أَن تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلَٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالْكِتَابِ وَالنَّبِيِّينَ وَآتَى الْمَالَ عَلَىٰ حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ وَالسَّائِلِينَ وَفِي الرِّقَابِ وَأَقَامَ الصَّلَاةَ وَآتَى الزَّكَاةَ وَالْمُوفُونَ بِعَهْدِهِمْ إِذَا عَاهَدُوا وَالصَّابِرِينَ فِي الْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ وَحِينَ الْبَأْسِ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ صَدَقُوا وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ O ٢

"نیکی یہ نہیں کہ تم اپنا چہرہ مشرق اور مغرب کی طرف کرو بلکہ نیکی تو یہ ہے کہ کوئی ایمان لائے اللہ پر آخرت کے دن پر فرشتوں پر کتاب پر اور نبیوں پر مال دے اس کی محبت پر رشتہ داروں کو یتیموں کو مسکینوں کو مانگنے والوں کو اور گردن چھڑانے میں اور نماز قائم کرے اور زکوۃ دے اور پورا کرے اپنے عہد و پیمان کو جب کہ عہد کرے، مقابلہ سختی اور تکلیف میں صبر کرے یہی لوگ سچے ہیں اور یہی لوگ پرہیزگار ہیں"۔

اس آیت میں تفصیل سے نیکی اور دین داری کا تصور بیان کیا گیا ہے۔ اس میں جہاں ایمانیات عبادات اور اخلاقی اصولوں کا تذکرہ ہے وہاں انسانی فلاح وخدمت ان کے دکھ درد میں شرکت اور ان کی حاجت روائی کی اہمیت بیان ہوئی ہے۔ یہی چیز مذہب کی روح اس کا خمیر اور جوہر ہے۔ جو کہ مشرکین مکہ کی زندگیوں سے نکل چکا تھا اور وہ انسانی فلاح وخدمت کے جذبے سے بالکل عاری ہو چکے تھے۔

قرآن ان کی زندگی کی تصویر کشی یوں کرتا ہے۔

كَلَّا بَل لَّا تُكْرِمُونَ الْيَتِيمَ O وَلَا تَحَاضُّونَ عَلَىٰ طَعَامِ الْمِسْكِينِ O وَتَأْكُلُونَ التُّرَاثَ أَكْلًا لَّمًّا O وَتُحِبُّونَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا O ٣

ل التوبہ۹:۱۲۸

۲ البقرہ۲:۱۷۷

۳ الفجر۸۹:۱۷۔۲۰

''ہرگز نہیں تم یتیموں کی عزت نہیں کرتے اور محتاجوں کو کھانا کھلانے کی ایک دوسرے کو تلقین نہیں کرتے اور مُردے کا سارا مال سمیٹ کر کھا جاتے ہو اور مال و دولت سے جی بھر کر محبت کرتے ہو''۔

یعنی انسانوں کی محبت و فلاح کی جگہ مشرکوں کے دل میں مال کی محبت نے جڑ پکڑ لی تھی۔ یہ سماج انسانوں پر مبنی تو تھا لیکن روح انسانیت سے خالی تھا۔ رسول اکرم ﷺ نے اس جاہلی معاشرے میں حقیقی خدا پرستی اور انسانی خدمت و فلاح کی تحریک برپا کی تو مشرکوں نے توحید خداوندی اور خدمت انسانی کے تمام منصوبوں کی مخالفت یوں کی۔ ارشاد ہے:

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ أَنْفِقُوا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللَّهُ قَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِلَّذِينَ آمَنُوا أَنُطْعِمُ مَنْ لَوْ يَشَاءُ اللَّهُ أَطْعَمَهُ إِنْ أَنْتُمْ إِلَّا فِي ضَلَالٍ مُبِينٍ ۝[1]

''اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جو اللہ نے تم کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرو تو کافر مومنوں سے کہتے ہیں ہم کیوں کھلائیں ایسے لوگوں کو کہ اگر اللہ چاہتا تو ان کو خود کھلاتا تم لوگ صریح گمراہی میں مبتلا ہو''

یہ تو حال مشرکین کا تھا۔ یہودیوں اور عیسائیوں کا بالخصوص ان کے مذہبی رہنماؤں کی حالت بھی کچھ اس سے مختلف نہ تھی۔ ان کی اکثریت نے انسانی فلاح و بہبود اور خدمت کی بجائے مذہب کو انسانوں کے استحصال کا ذریعہ بنا لیا تھا۔ ان کی سرمایہ دارانہ اور استحصالی ذہنیت پر تبصرہ کرتے ہوئے قرآن میں کہا گیا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ كَثِيرًا مِنَ الْأَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَأْكُلُونَ أَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ۝[2]

''اے مومنو بہت سے احبار اور رہبان (یہود و نصاریٰ کے مذہبی پیشوا) لوگوں کے مال غلط طریقے سے کھاتے ہیں اور اللہ کی راہ سے روکتے ہیں اور جو لوگ جمع کر کے رکھتے ہیں سونا اور چاندی اور اسے اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے، ان کو دردناک عذاب کی خوش خبری سنا دو۔''

لوگوں کی فلاح و بہبود کے بجائے ان کا مال باطل طریقے سے کھانا اور اللہ کی راہ سے روکنا ان مذہبی پیشواؤں کا وہ کارنامہ تھا جو ان کو مشرکوں کے مشابہ بنا دیتا تھا۔ بلاشبہ اہل کتاب میں ایسے لوگ بھی تھے جو راست باز تھے مگر ان کی تعداد بہت کم تھی اکثریت ایسے لوگوں کی تھی جن کا رویہ خدا پرستی اور انسان دوستی اور انسانی فلاح کے کاموں کے خلاف تھا۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ ان کو بھی خدا پرستی اور فلاح انسانیت کے کاموں کا حکم دیا تھا بلکہ ان سے عہد بھی لیا۔

وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَ بَنِي إِسْرَائِيلَ لَا تَعْبُدُونَ إِلَّا اللَّهَ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا وَذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينِ وَقُولُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ إِلَّا

---

[1] یٰس ۳۶:۴۷

[2] التوبہ ۹:۳۴

قَلِيۡلًا مِّنۡكُمۡ وَاَنۡتُمۡ مُّعۡرِضُوۡنَ O[1]

”اور یاد کرو جب ہم نے بنی اسرائیل سے یہ عہد لیا تھا کہ تم لوگ اللہ کے علاوہ کسی اور کی عبادت نہ کرنا اور والدین، رشتہ داروں اور مسکینوں سے اچھا سلوک کرنا، لوگوں سے بھلی بات کرنا اور نماز قائم کرنا اور زکوٰۃ دینا مگر تھوڑے آدمیوں کے سوا تم اس عہد سے پھر گئے اور تم ابھی تک برگشتہ ہو“۔

بنی اسرائیل میں یہود و نصاریٰ دونوں شامل ہیں مگر یہ استحصالی ذہنیت خاص طور پر یہود کی تھی جنھوں نے سرمایہ داری، سود خوری اور ذخیرہ اندوزی کو اپنا شعار بنا لیا تھا اور وہ انسانی فلاح و بہبود کے کاموں سے غافل ہو گئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو پھر وہی حکم دے کر بھیجا کہ اللہ کی توحید اور انسانوں کی خدمت کی تبلیغ کریں۔ انجیل میں متعدد مقامات پر اس کی تفصیل موجود ہے۔

انجیل میں زر پرستوں اور انسانی فلاح و بہبود کے خدمت گاروں کے انجام کا حال تمثیلی طور پر اس طرح بیان کیا گیا ہے:

”سب قومیں اس کے سامنے جمع کی جائیں گی اور وہ ایک کو دوسرے سے جدا کرے گا جیسے چرواہا بھیڑوں کو بکریوں سے جدا کرتا ہے اور بھیڑوں کو اپنے دائیں اور بکریوں کو اپنے بائیں کھڑا کرے گا اس وقت بادشاہ اپنے دائیں والوں سے کہے گا آؤ میرے باپ کے مبارک لوگو! جو بادشاہی بنائے عالم سے تمہارے لیے تیار کی گئی ہے، اسے میراث میں لے لو، کیونکہ میں بھوکا تھا تم نے مجھے کھانا کھلایا، میں پیاسا تھا تم نے مجھے پانی پلایا، میں پردیسی تھا تم نے مجھے اپنے گھر میں اتارا، میں ننگا تھا تم نے مجھے کپڑا پہنایا، میں بیمار تھا تم نے میری خبر گیری کی، میں قید میں تھا تم میرے پاس آئے۔ تب راست باز جواب میں کہیں گے اے خداوند! ہم نے کب تجھے بھوکا دیکھ کر کھانا کھلایا، کپڑا پہنایا، ہم کب تجھے بیمار یا قید میں دیکھ کر تیرے پاس آئے؟ بادشاہ جواب میں کہے گا، میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جب تم نے میرے ان سب سے چھوٹے بھائیوں میں سے کسی کے ساتھ یہ سلوک کیا تو میرے ہی ساتھ کیا۔ پھر وہ بائیں جانب مڑے گا اور کہے گا اے ملعونو! میرے سامنے سے ہمیشہ کے لیے آگ میں چلے جاؤ جو ابلیس اور اس کے فرشتوں کے لیے تیار کی گئی ہے کیونکہ میں بھوکا تھا، تم نے مجھے کھانا نہیں کھلایا، پیاسا تھا تم نے مجھے پانی نہیں پلایا اور پردیسی تھا تم نے مجھے گھر میں نہ اتارا، ننگا تھا تم نے مجھے کپڑا نہ پہنایا، بیمار اور قید میں تھا تم نے میری خبر نہ لی۔“[2]

توحید کو عیسائیوں نے تثلیث میں تبدیل کر دیا۔ لیکن عیسائیوں کے ایک طبقے نے انسانی خدمت اور فلاح و بہبود کے فریضے کو اپنا شعار بنا کر اس کے ذریعے عیسائیت کی تبلیغ و اشاعت کی جب کہ یہود توحید کی دعوت اور انسانی خدمت اور فلاح و بہبود کے

---

[1] البقرہ ۲:۸۳

[2] عہد نامہ جدید، متی بائبل سوسائٹی، انارکلی، لاہور ۱۹۸۳ء، ۲۵:۳۲۔۴۵

کاموں سے بے گانہ رہے۔

پیغمبر اسلام نے جو تعلیم دی ہے اس کا مرکزی نکتہ ہی اللہ کی توحید اور انسانوں کی محبت اور فلاح و خدمت کے ذریعے اللہ کی رضامندی، جنت کا حصول اور جہنم سے آزادی ہے۔

مسلمانوں کی اجتماعی اور انفرادی زندگی میں یہ تعلیم ریڑھ کی ہڈی کی طرح اہمیت رکھتی ہے۔ انسانی فلاح و بہبود اور خدمت انسانی کے بغیر اللہ کی خوشنودی حاصل نہیں ہوسکتی۔ یہ ایک ایسی گھاٹی ہے جسے پار کیے بغیر اللہ کی رضامندی کی بلندی تک پہنچنا ناممکن ہے۔

فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ ۝ وَمَا أَدْرَاكَ مَا الْعَقَبَةُ ۝ فَكُّ رَقَبَةٍ ۝ أَوْ إِطْعَامٌ فِي يَوْمٍ ذِي مَسْغَبَةٍ ۝ يَتِيمًا ذَا مَقْرَبَةٍ ۝ أَوْ مِسْكِينًا ذَا مَتْرَبَةٍ ۝ ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ ۝ أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْمَيْمَنَةِ ۝[1]

''اس نے دشوار گزار گھاٹی پار نہ کی، تمہیں کیا معلوم کہ کیا ہے وہ دشوار گزار گھاٹی کسی گردن کو غلامی سے چھڑانا یا فاقہ کے دن کسی رشتہ دار، یتیم یا خاک نشین مسکین کو کھانا کھلانا پھر ان لوگوں میں شامل ہونا جو ایمان لائے اور جنہوں نے ایک دوسرے کو صبر اور انسانوں پر رحم کرنے کی تلقین کی یہی لوگ اصحاب یمین ہیں''۔

انسانی فلاح اور خدمت کے حوالہ سے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ کی ایک حدیث نقل کی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ انسانوں سے مخاطب ہوگا اور اس طرح جواب طلب کرے گا: ''اے آدم کی اولاد! میں بیمار تھا مگر تو نے میری عیادت نہیں کی۔ بندہ کہے گا: اے میرے پروردگار! میں کس طرح تیری عیادت کرتا، جب کہ تو رب العالمین ہے۔ اللہ کہے گا: تجھے معلوم تھا کہ میرا فلاں بندہ بیمار ہے مگر تو نے اس کی عیادت نہیں کی اگر تو اس کی عیادت کے لیے جاتا تو مجھے اس کے پاس پاتا۔ اے ابن آدم! میں نے تجھ سے کھانا مانگا مگر تو نے مجھے کھانا نہیں کھلایا۔ اگر تو اسے کھانا کھلاتا تو یہ کھانا میرے پاس پاتا۔ اے ابن آدم میں نے تجھ سے پانی مانگا مگر تو نے مجھے پانی نہیں پلایا۔ بندہ کہے گا اے میرے پروردگار میں تجھے پانی کس طرح پلاتا جب کہ تو رب العالمین ہے۔ اللہ کہے گا کہ میرے فلاں بندے نے پانی مانگا مگر تو نے اسے پانی نہیں پلایا۔ اگر تو اسے پانی پلاتا تو اسے میرے پاس پاتا''۔[2]

یہ حدیث حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مذکورہ تمثیلی تعلیم خدمت خلق اور فلاح انسانی کے تصور سے ملتی جلتی ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد ﷺ کی انسانی فلاح و بہبود اور خدمت کی تعلیمات ایک ہی بحر رحمت کی دو موجیں ہیں۔

اس اشتراک کو بنیاد بنا کر دونوں مذہب فلاح انسانی کے مشترکہ منصوبے بنا سکتے ہیں۔

---

[1] البلد ۹۰: ۱۱۔۱۸

[2] صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ، باب فضل عیادۃ المریض (۶۵۵۶) الکتب الستۃ، ص ۱۱۲۸

مذکورہ حدیث سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ روحانیت اور فلاح انسانی کے کام یک جان دو قالب ہیں۔

پیغمبر اسلام نے انسانی فلاح کے معروف طریقوں میں دو اہم اور نادر اضافے فرمائے۔ ایک تو انسانی خدمت کو بعد از مرگ باقی رکھنا اور دوسرے انسانی فلاح کو ادارتی شکل دینا۔ پہلی چیز کے لیے صدقہ جاریہ اور دوسری کے لیے وقف کا تصور آپ کی بے مثال خدمت ہے۔

اس حقیقت پر تبصرہ کرتے ہوئے علامہ سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

''آج دنیا کے شہر شہر میں یتیم خانے قائم ہیں۔ مگر اگر یہ سوال کیا جائے کہ کیا محمد ﷺ سے پہلے بھی یہ بدقسمت گروہ اس نعمت سے آشنا تھا تو تاریخ کی زبان سے جواب نفی میں ملے گا۔ اسلام پہلا مذہب ہے جس نے اس مظلوم فرقے کی دادرسی کی، عرب پہلی سرزمین ہے جہاں یتیم خانے کی بنیاد پڑی اور اس کی حکومت دنیا کی پہلی حکومت ہے جس نے اس ذمہ داری کو محسوس کیا اور عرب، مصر، شام، عراق، ہندوستان جہاں جہاں مسلمانوں نے اپنی حکومتوں کی بنیادیں ڈالیں ساتھ ساتھ ان مظلوموں کے لیے بھی امن و راحت کے گھر بنائے۔ ان کے لیے وظیفے مقرر کیے، مکتب قائم کیے، جائدادیں وقف کیں۔''[1]

آج جب کہ دنیا ایک گلوبل ولیج کی حیثیت اختیار کرتی جا رہی ہے لہٰذا ان رفاہی اداروں کا کام اور انصرام تمام مذاہب کے لوگ مل کر بھی سرانجام دے سکتے ہیں۔

وسعت قلب

وسعت قلبی اللہ تعالیٰ کا ایک انعام ہے۔ اللہ تعالیٰ جس بندے کو ہدایت دینے کا ارادہ فرماتے ہیں اس کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیتے ہیں اور اسے وسعت قلبی کی دولت سے مالا مال کر دیتے ہیں اور جس شخص کو اس کے اعمال بد کی بنا پر گمراہ کرنا چاہتے ہیں اس کے سینے کو تنگ کر دیتے ہیں جس کی بنا پر اسے حق بات قبول کرنا اور اس پر عمل کرنا ایسے دشوار ہو جاتا ہے جیسے آسمان میں چڑھنا۔ اس حقیقت کو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں یوں بیان فرمایا ہے:

فَمَن يُرِدِ اللَّهُ أَن يَهْدِيَهُ يَشْرَحْ صَدْرَهُ لِلْإِسْلَامِ وَمَن يُرِدْ أَن يُضِلَّهُ يَجْعَلْ صَدْرَهُ ضَيِّقًا حَرَجًا كَأَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِي السَّمَاءِ [2]

''جس شخص کو اللہ تعالیٰ ہدایت دینا چاہتے ہیں اس کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیتے ہیں اور جس شخص کو اللہ تعالیٰ گمراہی میں رکھنا چاہتے ہیں اس کا دل تنگ اور سخت کر دیتے ہیں گویا کہ وہ زور سے چڑھتا ہے آسمان پر''۔

---

[1] سیرت النبی ۴۲۷/۲۱

[2] الانعام ۶:۱۲۵

اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ ہدایت یافتہ دل میں وسعت اور گمراہ دل میں تنگی اور سختی پائی جاتی ہے۔ ہدایت یافتہ دل میں قبول حق کی استعداد پائی جاتی ہے جبکہ گمراہی سے بھرا ہوا دل شکوک وشبہات سے بھرپور اور قبول خیر و بھلائی سے خالی ہوتا ہے۔ اللہ کے ذکر سے اسے وحشت ہونے لگتی ہے جبکہ کفر و شرک کی باتوں میں اس کا دل لگتا ہے۔

مولانا مفتی محمد شفیع اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

> ''آج پوری دنیا ان شکوک وشبہات کے گھیرے میں پھنسی ہوئی ہے اور بحث و مباحثہ کی راہ سے اس کو حل کرنا چاہتی ہے جو اس کا صحیح راستہ نہیں۔ راستہ وہی ہے جو صحابہ کرام اور اسلاف امت نے اختیار فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ اور ان کے انعام کا استحضار کر کے اس کی عظمت و محبت دل میں پیدا کی جائے تو شبہات خود بخود کافور ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ خود قرآن نے رسول کریم کو یہ دعا مانگنے کی تلقین فرمائی ہے کہ رَبِّ اشْرَحْ لِی صَدْرِی یعنی اے میرے پروردگار میرا سینہ کھول دیجیے۔''[1]

اللہ تعالیٰ جس بندے کو شرح صدر سے نواز دیتے ہیں اس کی زندگی کی ساری رغبت آخرت اور اس کی نعمتوں کی طرف ہو جاتی ہے۔ پھر وہ کسی دنیاوی معاملے میں تنگ نظری کا مظاہرہ نہیں کرتا وہ اپنوں اور غیروں کے ساتھ وسعت قلبی کا مظاہرہ کرتا ہے اس کی دوستی اور دشمنی اللہ کے لیے ہوتی ہے۔ وہ عفو و درگزر کا پیکر اور اپنے اور پرائے کا غم کھانے والا بن جاتا ہے۔ وہ بدترین دشمنوں کے لیے بھی بددعا کے الفاظ زبان پر نہیں لاتا بلکہ قحط کے زمانے میں ان کی مدد کرتا ہوا نظر آتا ہے۔

ہجرت مدینہ کے بعد مکہ والوں پر اللہ کی طرف سے قحط کی شکل میں عذاب آیا۔ قحط اتنا شدید تھا کہ اہل مکہ کی آنکھوں کی روشنی بھی کم ہوگئی۔ ابوسفیان اموی مسلمانوں سے ہمیشہ برسرِ پرخاش رہا کرتا تھا۔ وہ دربار مصطفیٰ ﷺ میں حاضر ہوا اور نہایت ادب سے بولا کہ حضورؐ ہمیشہ احسان اور صلہ رحمی کی تعلیم دیا کرتے ہیں ہم حضور کے قرابتی ہیں اور رحم کے مستحق، احسان فرمایئے اور دعا کیجیے کہ اس قحط شدید سے ہم کو نجات ملے۔ والیِ امن عالمین نے ثمامہ بن اثال سردار نجد کو جو دولت ایمان سے مالا مال ہو چکا تھا حکم بھیج دیا کہ مکہ میں فوراً غلہ پہنچانے کا بندوبست کرے۔ ان کے علاقے میں اناج بکثرت تھا۔ انھوں نے غلہ صرف اس لیے روک رکھا تھا کہ اہل مکہ دشمنان رسول ہیں۔ اب حکم نبوی ﷺ کی تعمیل ہوئی تو اہل مکہ کی جان میں جان آئی۔[2]

اہل طائف نے آپ کو تکلیف دینے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔ آپ ﷺ نے دورِ نبوت کا سب سے سخت دن طائف والے دن کو ہی قرار دیا تھا۔ ۸ھ میں مسلمانوں کی فوج نے طائف کا محاصرہ کر لیا۔ یہ محاصرہ کئی دن تک جاری رہا لیکن قلعہ فتح نہ ہو سکا۔ بہت مسلمان شہید ہو گئے۔ آپ نے واپسی کا ارادہ کیا لیکن پرجوش مسلمان نہ مانے۔ انھوں نے آپ ﷺ سے عرض کی کہ طائف والوں کے لیے بددعا فرمائیں۔ آپ نے ہاتھ اٹھائے اور فرمایا: ''اے خدا ثقیف کو ہدایت عطا کر اور توفیق دے کہ میرے پاس حاضر ہو جائیں۔''

---

[1] مفتی محمد شفیع، مولانا۔ معارف القرآن، ادارہ المعارف، کراچی، ۱۹۹۳ء، ۱/ ۳۲۵

[2] محمد سلمان منصور پوری، قاضی، رحمۃ للعالمین، لاہور اکیڈمی، لاہور، س ن، ۱/ ۳۰، ۸۷۔۸۸

یہ دعا اس شہر کے حق میں فرمائی جارہی تھی جہاں سے آپ ﷺ پر پتھر برسائے گئے، زخمی کیا گیا اور پناہ دینے سے انکار کیا گیا۔[1]

غزوہ حنین میں آپ ﷺ نے مال غنیمت تقسیم فرمایا تو ایک انصاری نے کہا:

ما اراد لهذه القسمة وجه الله.[2]

''یہ تقسیم اللہ کی رضامندی کے لیے نہیں''۔

آپ ﷺ اس الزام پر سزا بھی دے سکتے تھے۔ سخت رویہ بھی اختیار کر سکتے تھے۔ لیکن کمال وسعت قلبی کا مظاہرہ کرتے ہوئے فرمایا:

رحم الله موسى لقد اوذى باكثر من هذا فصبر[3]

''اللہ تعالیٰ موسیٰ پر رحم کرے ان کو لوگوں نے اس سے بھی زیادہ ستایا اور انھوں نے صبر کیا''۔

حضرت ابوسفیان کی بیوی ہندہ نے آپ ﷺ کے محبوب چچا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا سینہ چاک کیا تھا اور جگر کے ٹکڑے کیے تھے۔ فتح مکہ کے موقع پر نقاب پہن کر آپ کے سامنے آئی، آپ نے پہچان لیا لیکن کمال وسعت قلبی کا مظاہرہ کیا۔ آپ کے اخلاق سے متاثر ہو کر اس نے کہا:

''یا رسول اللہ! میری نگاہ میں آپ کے خیمے سے زیادہ مبغوض کوئی خیمہ نہ تھا لیکن آج آپ کے خیمے سے زیادہ محبوب تر کوئی خیمہ نظر نہیں آتا''۔[4]

انسانی جان کا تقدس

انسان کو اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں اپنے نائب کا درجہ دیا ہے۔ **اِنِّی جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃ**۔[5]
اللہ تعالیٰ نے انسان کو معزز اور مکرم پیدا کیا ہے۔ ارشاد ہے:

ولقد كرمنا بنى آدم ....[6] (ہم نے انسان کو معزز بنایا ہے)۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ[7]

''ہم نے انسان کو بہترین صورت میں پیدا کیا ہے''۔

---

[1] سلیمان ندوی، سید۔ خطبات مدراس، لاہور اکیڈمی، لاہور، ص ۱۲۳
[2] الجامع الصحیح للبخاری، کتاب المغازی، باب غزوۃ الطائف فی شوال سنہ ثمان (۴۳۳۶) الکتب الستہ، ص ۳۵۲
[3] ایضاً
[4] ایضاً، کتاب مناقب الانصار، باب ذکر ہند (۳۸۲۵) الکتب الستہ، ص ۳۱۰
[5] البقرہ ۲: ۳۰
[6] الاسراء ۱۷: ۷۰
[7] التین ۹۵: ۴

دنیا میں اگر کوئی انسان شیطان کے بہکاوے میں آ کر نسل انسانی کے کسی ایک فرد کو ناحق قتل کر دیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس جرم کو اتنا بڑا گناہ قرار دیتے ہیں کہ اس کے اس قبیح فعل کو پوری انسانیت کا قتل قرار دیتے ہیں۔

مَنْ قَتَلَ نَفْساً بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعاً وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَا اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعاً[1]

''جس نے کسی انسان کو خون کے بدلے یا زمین میں فساد پھیلانے کے سوا کسی اور وجہ سے قتل کیا اس نے گویا تمام انسانوں کو قتل کر دیا اور جس نے کسی کی جان بچائی اس نے گویا تمام انسانوں کو زندگی بخش دی''۔

مطلب یہ کہ دنیا میں انسانی زندگی کا بقا اس بات پر منحصر ہے کہ ہر انسان کے دل میں انسانوں کی جان کا تقدس ہو اس سے تمام انسانی زندگیوں کو تحفظ ملے گا جو شخص کسی کی ناحق جان لیتا ہے تو وہ اپنے اس اقدام سے ثابت کرتا ہے کہ اس کا دل حیات انسانی کے احترام سے خالی ہے اس لیے اس قبیح عمل کو پوری انسانیت کا قتل قرار دیا گیا ہے۔ اسلام انسانی جان کے تقدس میں مسلم اور غیر مسلم کا کوئی فرق روا نہیں رکھتا۔ ناحق قتل مسلم کا ہو یا غیر مسلم کا دونوں کے لیے یکساں سزا تجویز کرتا ہے۔

وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِناً مُّتَعَمِّداً فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خَالِداً فِيْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَاباً عَظِيْماً ۝[2]

''جو کسی مومن کو جان بوجھ کر قتل کرے تو اس کی سزا جہنم ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا اس پر اللہ کا غضب اور اس کی لعنت ہے۔ اور اللہ نے اس کے لیے سخت عذاب مہیا کر رکھا ہے''۔

ایک مسلمان نے ایک اہل کتاب کو قتل کر دیا اور مقدمہ نبی کریم ﷺ کے پاس فیصلہ کے لیے آیا آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں اہل ذمہ کا حق ادا کرنے کا سب سے زیادہ ذمہ دار ہوں۔ چنانچہ آپ نے قاتل کے بارے میں قتل کرنے کا حکم دیا اور اسے قتل کر دیا گیا۔[3]

ایک اور جگہ سرور کونین ﷺ نے فرمایا:

''جس نے کسی ذمی کو (ناحق) قتل کیا وہ جنت کی خوشبو بھی نہیں پا سکے گا حالانکہ اس کی خوشبو چالیس سال کی راہ سے سونگھی جا سکتی ہے۔''[4]

اسلام کا تصور جہاد و قتال اعلائے کلمۃ اللہ اور مظلوموں کی دادرسی اور فتنہ اور فساد کبیر کو روکنے کے لیے ہے۔ لیکن اسلام میں انسانی جان کا تقدس اس قدر ہے کہ دوران جنگ بھی کوئی کلمہ زبان پر لے آئے جب کہ سیاق و سباق سے ظاہر ہو رہا ہو کہ وہ کلمہ جان

---

[1] المائدہ ۵:۳۲

[2] النساء ۴:۹۳

[3] کتاب الخراج: ۸۲

[4] الجامع الصحیح للبخاری، کتاب الجزیہ باب اثم من قتل معاہد بغیر جرم (۳۱۶۶) الکتب الستۃ، ص ۲۵۶

بچانے کے لیے پڑھ رہا ہے، پھر بھی محسن اعظم ﷺ اس کے قتل کو ناپسندیدہ سمجھتے تھے۔

حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ہمیں اللہ کے رسول ﷺ نے قبیلہ جہینہ کی ایک شاخ کی طرف (مہم پر) بھیجا۔ ہم نے بوقت صبح ان پر حملہ کیا اور انھیں شکست دے دی۔ (اسامہ رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ میں اور ایک انصاری آدمی نے قبیلہ جہینہ کے ایک آدمی کا سامنا کیا جب ہم نے اسے گھیرے میں لے لیا تو اس نے کہا لا الہ الا اللہ انصاری صحابی نے تو ہاتھ روک لیا لیکن میں نے اپنے نیزے سے اسے قتل کر دیا۔ فرماتے ہیں جب ہم واپس آئے تو نبی کریم ﷺ کو اس واقعہ کی اطلاع ملی۔ آپ ﷺ نے فرمایا اسامہ! تم نے اس شخص کو لا الہ الا اللہ پڑھنے کے بعد قتل کیوں کیا؟ میں نے عرض کیا کہ اس نے صرف جان بچانے کے لیے اس کا اقرار کیا تھا۔ آنحضرت ﷺ نے پھر یہ فرمایا کہ تم نے اسے کلمہ شہادت کا اقرار کرنے کے باوجود قتل کر ڈالا۔ فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے اس جملے کو اتنی بار دہرایا کہ میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوگئی کہ کاش میں آج سے پہلے مسلمان نہ ہوا ہوتا۔[1]

اسلام سے پہلے غلاموں پر ہر قسم کا تشدد روا رکھا جاتا تھا۔ بعض اوقات غلام تشدد کی بنا پر مر بھی جاتے تھے۔ پیغمبر اسلام نے انسانیت کے اس پسے ہوئے طبقے کی جان کو تقدس بخشتے ہوئے فرمایا:

> ''حضرت سمرہؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص اپنے غلام کو قتل کرے گا ہم اسے قتل کریں گے جو اپنے غلام کی صورت بگاڑے گا ہم اس کی صورت بگاڑیں گے۔''[2]

اسلام میں ایک جان اتنی عزیز اور محترم ہے کہ اس کو مارنا تو دور کی بات، اس کی طرف ہتھیار اٹھانے یا ہتھیار سے اشارہ کرنے کی بھی ممانعت ہے۔ ارشاد نبوی ہے جو ہم مسلمانوں پر ہتھیار اٹھائے وہ ہم میں سے نہیں۔[3]

اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

> ''جو شخص اپنے مسلمان بھائی کی طرف ہتھیار سے اشارہ کرتا ہے اس پر فرشتے لعنت کرتے ہیں جب تک کہ وہ اسے رکھ نہ دے اگرچہ اس کا حقیقی بھائی ہی کیوں نہ ہو۔''[4]

انسانی جان کے تقدس کے حوالے سے یہ بات بڑی اہمیت کی حامل ہے کہ اسلام میں کسی کی جان لینا حرام ہونے کے ساتھ ساتھ اپنی جان لینا یعنی خودکشی کو بھی حرام قرار دیا گیا ہے۔

لا تقتلوا انفسکم[5]

''تم اپنی جانوں کو قتل نہ کرو۔''

---

[1] سنن ابی داؤد، کتاب الجهاد، باب علی ما یقاتل المشرکون (۲۶۴۳) الکتب الستۃ، ص ۱۴۱۸

[2] ایضاً، کتاب الدیات، باب من قتل عبدہ او مثل بہ (۴۵۱۵) الکتب الستۃ، ص ۱۵۵۴

[3] الجامع الصحیح للبخاری، کتاب الدیات، باب ومن احیاھا (۶۸۷۴) الکتب الستۃ، ص ۵۷۳

[4] صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ، باب النھی عن الاشارۃ بالسلاح (۶۶۶۶) الکتب الستۃ، ص ۱۱۳۲

[5] النساء ۴:۲۹

پیغمبر رحمت عالم نے فرمایا:

''جو شخص جس چیز سے دنیا میں خودکشی کرے گا قیامت میں اس کے ساتھ ہی اسے عذاب دیا جائے گا۔''[۱]

اس سے معلوم ہوا کہ انسانی جان اتنی عزیز ہے کہ اس کا تقدس کسی حال میں بھی مجروح کرنا کسی کے لیے جائز نہیں ہے۔

اسلام احترام انسانیت سکھاتا ہے اس کے احکام انسانی تقدس کے حوالے سے عام ہیں جن میں تمام بنی آدم خواہ وہ دوست ہوں یا دشمن سب شامل ہیں۔

اسلام دوسروں کی عزت کے ساتھ اپنے نفس کے حقوق ادا کرنے کی بھی تلقین کرتا ہے۔ ارشاد نبوی ہے **ولنفسک علیک حقا**[۲] تجھ پر تیری جان کا بھی حق ہے۔ لہٰذا اپنی جان کے حقوق ادا کرنے کے ساتھ ساتھ اسلام ہمیں خبردار کرتا ہے کہ ہم تمام نوع انسانی کی جانوں کا تقدس کسی حال میں بھی مجروح نہ کریں۔

قیامت کے دن سب سے پہلے جو فیصلہ ہوگا وہ ایک جان کے ناحق قتل کا ہوگا۔

عبداللہ بن عمرؓ کا بیان ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا ''قیامت میں جس مسئلہ پر پہلے فیصلہ ہوگا وہ خونی کا کیس ہوگا۔''[۳]

قرآن مجید اور آپ ﷺ کی تعلیمات کے نتیجے میں صحابہ کرامؓ انسانی جان کی حرمت کا اس قدر پاس رکھتے تھے کہ اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے ہونے والے جہاد میں صرف فریقین کی ۱۰۸۱ جانیں گئیں۔

قاضی محمد سلیمان منصور پوری لکھتے ہیں کہ سب لڑائیوں میں مسلمانوں اور فریق مخالف کے مقتولین ہر دو جانب کی تعداد ۱۰۸۱ ہے۔[۴]

اتنے معرکوں میں انسانی جانوں کا اس قدر کم نقصان یقیناً رحمت عالم کا ایک عظیم کارنامہ ہے۔

اس تعداد میں بدر، احد، خندق، طائف اور حنین کی جنگوں کا جانی نقصان رجیع اور بیر معونہ کے غداروں کا قتل اور سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کے حکم پر بنو قریظہ کے قتل ہونے والے لوگ سب شامل ہیں۔

اسلام نے انسانی جانوں کی اس قیمت پر بنی نوع انسان کو کیا دیا؟ اشرف المخلوقات کو بت پرستی کی لعنت سے نجات دلا کر توحید کی عظمتوں سے روشناس کرایا۔ مدینے کے باسی جو صدیوں سے ایک دوسرے کے خون کی ندیاں بہا رہے تھے ان کو بھائی بھائی بنایا۔ عرب جو خونخواری کی وجہ سے ننگ انسانیت بنے ہوئے تھے ان کے دلوں میں رحمت و رافت کے جذبات کی تخم ریزی کی۔ جو قوم کسی قانون کی پابندی کو اپنی توہین سمجھتی تھی اسے قانون کا پابند بنایا اور تہذیب و ثقافت سے ناآشنا عربوں کو تہذیب کا وہ درس دیا کہ دنیا صدیوں ان کی تہذیب و ثقافت کا درس لیتی رہی۔ مذکورہ اعداد و شمار کیا اس کے بدلے میں زیادہ ہیں؟

---

[۱] الجامع ترمذی، ابواب الطب، باب ما جاء فیمن قتل نفسہ ..... (۲۰۴۴) الکتب الستۃ، ص ۱۸۵۶

[۲] الجامع ترمذی، ابواب صفۃ القیامۃ، باب فی اعطاء حقوق النفس (۲۴۱۳) الکتب الستۃ، ص ۱۸۹۴

[۳] سنن ابن ماجہ، الدیات، باب التغلیظ فی قتل المسلم ظلما، (۲۶۱۵) الکتب الستۃ، ص ۲۹۴۴

[۴] رحمۃ للعالمین ۲/۲۱۴

باب دوم

اسلام اور معاہدات

فصل اول

مسلمانوں کے باہمی معاہدات

۱۔ انسانی معاشرے میں معاہدات کا معنی ومفہوم

۲۔ معاہدات کی اقسام

فصل دوم:

۱۔ معاہدات اور انسانی زندگی

۲۔ معاہدات کی اہمیت ازروئے قرآن

۳۔ معاہدات کی اہمیت ازروئے حدیث

فصل اول:

مسلمانوں کے باہمی معاہدات

معاہدات کا معنی و مفہوم

معاہدات باب مفاعلہ سے معاہدہ کی جمع ہے اس کا مادہ ع، ہ، د اور معنی قسم کھا کر پختہ عہد کرنا ہے جو عموماً فریقین میں طے پاتا ہے۔

لسان العرب میں عہد سے مراد:۔

العهد: الموثق واليمين يحلف بها الرجل، العهد جمع العهدة وهو الميثاق واليمين التي تستوثق بها من يعاهدك[1]

المنجد کے مطابق:

عهد (س) عَهِدَ الْأَمْرَ پہچاننا، حفاظت کرنا، دیکھ بھال کرنا۔

عاهده: معاہدہ کرنا، حلیف بنانا۔

تعاهدا القوم: ایک دوسرے سے معاہدہ کرنا۔ حلیف بنا

العهد: (مصدر) وفا، ضمان، امان، ذمہ، دوستی، وصیت، میثاق، قسم

العهدانۃ: ضمانت، کفالت

العهيد: معاہدہ کرنے والا[2]

مصباح اللغات کے مطابق:

پہچاننا، حفاظت کرنا اور پورا کرنا، دیکھ بھال کرتے رہنا۔[3]

فیروز اللغات میں ہے:

(i) قول و قرار۔ اقرار مدار، قسم۔ سوگند

(ii) وقت، سلطنت کا زمانہ، زمانہ حکومت

(iii) پابندی۔[4]

---

[1] لسان العرب، ۳۱۱/۳

[2] المنجد، ص ۶۸۸

[3] بلیاوی، عبدالحفیظ، ابوالفضل۔ مصباح اللغات، دہلی، مکتبہ برہان، ۱۹۵۰ء، ص ۵۹۹

[4] فیروز الدین، الحاج، مولوی۔ فیروز اللغات، لاہور، فیروز سنز، س ن، ص ۹۰۶

اردو دائرہ معارف اسلامیہ میں معاہدہ کی وضاحت یوں کی گئی ہے:

معاہدہ: جمع معاہدات، مادہ: (ع،ہ،د)

بمعنی کسی چیز کی حفاظت کرنا، اس کی رعایت رکھنا۔

معاہدہ باب مفاعلہ یعنی دو طرفہ قسمیں کھا کر عہد کرنا[۱]

اردو تھیسارس کے مطابق:

معاہدہ (اسم): قول و قرار، عہد، وعدہ، میثاق، بول، حلف، قسم، یقین دہانی

(فعل): قول و قرار کرنا، ذمہ لینا، طے کرنا، قسم کھانا، زبان دینا، بچن دینا، حامی بھرنا، ضمانت دینا، عہد باندھنا، حلف دلانا یا اٹھانا، گواہ کو قسم کھلانا[۲]

اصطلاحی مفہوم

عہد کا اصطلاحی مفہوم راغب اصفہانی کے مطابق:

العهد حفظ الشيء و مراعاته حالا بعد حال

''عہد کے معنی کسی چیز کی پیہم نگہداشت اور خبر گیری کرنا ہیں''۔[۳]

اس بنا پر اس پختہ وعدہ کو بھی عہد کہا جاتا ہے جس کی نگہداشت ضروری ہو۔

کفار میں سے جو شخص معاہدہ کے وقت مسلمانوں کے ساتھ شریک ہو، اسے معاہد یا ذو عہد کہا جاتا ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ:

لا یقتل مومن بکافر ولا ذو عهد فی عهده

''کہ کسی مومن کو کافر کے بدلے قتل نہ کیا جائے اور نہ ہی کسی معاہد کو مدت عہد کے اندر مارا جائے''۔[۴]

حفاظت اور پابندی کے اعتبار سے اس وثیقہ کو بھی عهدة کہا جاتا ہے جو فریقین عہد و پیمان کے وقت باہم لکھ لیتے ہیں۔[۵]

مفتی محمد شفیع آیت ذیل کی روشنی میں معاہدے کی تعریف یوں کرتے ہیں:

الَّذِيْنَ يَنقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِن بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ[۶]

عہد اس صورت معاملہ اور معاہدے کو کہا جاتا ہے جو دو شخصوں کے درمیان طے ہو جائے۔

---

۱ اردو دائرہ معارف اسلامیہ، لاہور، دانشگاہ پنجاب، ۳۰۴/۲۱

۲ رفیق خاور، اردو تھیسارس، راولپنڈی، ایس۔ٹی پرنٹرز، ۱۹۹۲ء، ص ۳۵۵۔۳۵۴

۳ راغب اصفہانی، مفردات القرآن، مترجم: محمد عبدہ فلاح، لاہور، المکتبہ القاسمیہ، ۱۳۸۳ھ، ص ۳۵۰

۴ سنن ابی داؤد، کتاب الدیات، باب: ایقاد المسلم من الکافر، مکتبہ علشہ، ص ۱۵۵۶

۵ مفردات القرآن، ص ۲۲۹

۶ البقرہ ۲: ۲۲

میثاق ایسے معاہدے کو کہتے ہیں جو قسم کے ساتھ مضبوط و مستحکم کیا جائے[1]

معاہدہ کے مترادفات

عقد، عہد، معاہدہ، وعدہ اور میثاق سب باہم مترادف ہیں۔ جس میں بندش، پختگی اور کسی کام کو پورا کر دینے کا مفہوم شامل ہے۔ گویا جب کوئی کسی سے معاہدہ کرتا ہے یا کوئی وعدہ کرتا ہے تو وہ اپنے کیے ہوئے وعدہ اور معاہدہ کا پابند ہو جاتا ہے، اور اس کا پورا کرنا اس پر ضروری ہو جاتا ہے۔

1۔ ''میثاق'' بطور مترادف

☆ میثاق مادہ (و۔ث۔ق) سے ہے۔

وثق، ثقه و ثوقا و موثقا: اعتبار کرنا، بھروسہ کرنا

وثق و ثاقة: ثابت وقوی ہونا سے اسم آلہ بمعنی عہد

جمع: مواثق، میاثق، مواثیق، میاثیق

اصطلاحی طور پر اس سے مراد وہ آئینی دستاویز ہیں جو ایک ہجری میں حضرت محمد ﷺ اور مدینہ منورہ کے باشندوں (مسلمان، یہودی، مشرک) وغیرہ کے درمیان طے پائیں[2]

☆ وثق یثق ثقه مولوقا: بھروسہ کرنا

واثقه و ثاقا و مواثقه: معاہدہ کرنا

توثیق: وثیقہ لینا

تواثق القوم: باہم عہد و پیمان ہونا[3]

المعجم الوسیط میں میثاق کی وضاحت یوں کی گئی ہے:

"میثاق یکون بین اثنین او جماعتین و (فی القانون الدولی) اتفاق بین دولتین او اکثر لتنظیم علاقات بینهما."[4]

اردو تھیسارس کے مطابق:

---

[1] معارف القرآن، ۱/۱۶۹

[2] اردو دائرہ معارف اسلامیہ، ۲۱/۹۱۳

[3] مصباح اللغات، ص ۹۱۷

[4] ابراہیم مصطفیٰ، معجم الوسیط، بیروت، لبنان، ۱۳۸۱ھ، ج ۲، ص ۵۱۷

میثاق(اسم): وثیقہ، ذمہ داری، عہد، امانی، بندوبست، اہتمام، معاہدہ، اقرارنامہ، عہدنامہ۔
(فعل): میثاق کرنا، اقرار کرنا، بات چیت کرنا، شرائط طے کرنا۔[1]

2۔ "عقد" بطور مترادف اس مفہوم کا حامل ہے۔

☆ المنجد میں "عقد" کا مفہوم یوں بیان کیا گیا ہے:

عقد (یعقد) عقدا

عقدا الحبل: گرہ لگانا

عقدا البیع او الیمین: بیع یا قسم کا پکا کرنا۔

عاقد معاقدہ: معاہدہ کرنا

العقید: معاہدہ کرنے والا۔[2]

فیروز اللغات میں:

عقد: (i) گرہ، گانٹھ

(ii) قول و قرار

(iii) شادی، نکاح، فروخت، بیع

عقد بندی: نکاح، عہد کا پورا کرنا۔[3]

المعجم الوسیط میں "عقد" کی وضاحت یوں کی گئی ہے:

العقد: ماعقد من البناء و العهد و اتفاق بین طرفین یلتزم بمقتضاه کل منهما تنفیذ ما اتفقا علیه. کعقد البیع والزوج. و عقد العمل "فی الاقتصادالسیاسی"

عاقد: عاهده.[4]

3 ۔Contract:

معاہدہ کے لیے انگریزی میں لفظ Contract مستعمل ہے۔ جس کا مفہوم بالعموم دو یا دو سے زیادہ افراد کے درمیان معاہدہ ہوتا ہے۔

---

[1] اردو تھیسارس، ص ۳۵۵
[2] المنجد، ص ۵۷۱
[3] فیروز اللغات، ص ۸۹۹
[4] المعجم الوسیط، ۲/ ۶۲۰

"contract is an agreement made by two or more persons that is entorced by law"۱؎

آکسفورڈ ریفرنس ڈکشنری کے مطابق معاہدہ کا قانون کے مطابق ہونا ضروری ہے خواہ وہ تحریری ہو یا غیر تحریری:

"An written or spoken agreement especially one enforceable by law, the document recording it" ۲؎

کرک پیٹرک معاہدہ کے لیے مقرر شدہ شرائط کو لازمی قرار دیتے ہیں۔

"An agreement on fixed term" ۳؎

ڈریٹ فیئر چائلڈ کے نزدیک معاہدہ افراد یا سوسائٹی کے درمیان ایسا تعلق ہے جس میں ہر ایک پابندیوں کو ماننے پر مجبور ہوتا ہے۔

"A relationship between persons, or society, in which there are assumed to be certain obligation binding on each to confirm to the conditions of the agreement."۴؎

جدید سوسائٹی میں معاہدات کی اہمیت زیادہ ہوتی جا رہی ہے۔

"Although the law of contracts involved slowly, it has assume increasing importance in modern society. The security assured by the legal onechanism known as a contract."۵؎

4- Agreement:

(i) "The act of agreement or coming to a mutual agreement."

(ii) Oneness of opinion, feeling or purpose, harmonious under standing" ۶؎

۱؎ The World Book Encyclopedia (Chicago 1998),Vol:4, P 1024

۲؎ Joyca.M. Hakins, The Oxford Refrence Dictionary, Chamber Press Oxf. 1986, page 186

۳؎ E.M. Kirk Patrick, Chambers Family Dictionary, (Edin Burgh 1981) p,162.

۴؎ Herry Dratt Fairchild, Dictionary of Sociology (New York City) p?

۵؎ New Age Encyclopedia (Lexieon Publications 1979) Vol:5, p:205.

۶؎ (A Merriam Webster, Webster's Third New International Dictionary of English Unabridged. Vol:1 (A to G), P 43.)

معاہدات کی اقسام

انسانی زندگی میں معاہدات کی اہمیت اور ضرورت کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس کی درج ذیل اقسام کی جا سکتی ہیں:

۱۔ سماجی معاہدات
۲۔ معاشی معاہدات
۳۔ سیاسی معاہدات

سماجی زندگی اور معاہدات

سماجی معاہدات میں نکاح، دین، رہن اور امانت وودیعت آتے ہیں۔

ا۔ نکاح:

ویسے تو زندگی کے ہر شعبے میں معاہدات اپنا اہم کردار ادا کرتے ہیں چاہے زندگی کا معاشی پہلو ہو یا سیاسی، اخلاقی پہلو ہو یا مذہبی، لیکن سماجی زندگی میں ایک معاہدہ ایسا ہوتا ہے جو انتہائی ضروری کردار ادا کرتا ہے کیونکہ زندگی کے دو اہم ستونوں کے درمیان یہ معاہدہ قرار پاتا ہے۔ اگر اس معاہدے کی اہمیت کو نہ سمجھا جائے تو زندگی میں بہت بڑا خلاء پیدا ہو جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے خاندانی تعلقات بری طرح متاثر ہوتے ہیں۔ اولاد پر برے اثرات مرتب ہوتے ہیں اور معاشرے میں قحط الرجال پیدا ہو جاتا ہے اور زندگی اپنے اصل راستے سے اپنا رخ بدل لیتی ہے۔ معاشرے میں فساد پیدا ہوتا ہے۔ انسانی قدروں کو پامال کیا جاتا ہے۔ اس لیے فریقین کو اس معاہدے کو قائم رکھنے میں نہایت باریک بینی سے کام لینا چاہیے۔

جس طرح تمام معاملات میں دو آدمی آپس میں ایک معاہدہ کرتے ہیں اور معاہدہ کرنے کے بعد دونوں پر اس وقت تک اس کی پابندی ضروری ہوتی ہے جب تک یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ اس معاہدے کے باقی رکھنے میں کسی نہ کسی فریق کو کوئی مادی یا اخلاقی نقصان پہنچی ہے۔ اس طرح اسلامی شریعت نکاح کے تعلق کو بھی مضبوط معاہدہ قرار دیتی ہے، اور اس معاہدے کو اس وقت تک توڑنے کی اجازت نہیں دیتی جب تک یقین نہ ہو جائے کہ اس کے توڑنے میں اچھائی ہے، اسی لیے وہ اس عقد نکاح کے تعلق کو بھی مضبوط معاہدہ قرار دیتی ہے۔ اسی لیے وہ اس کو عقد نکاح کے نام سے تعبیر کرتی ہے۔ عقد کے معنی گرہ دینے یا باندھنے کے ہیں۔ یعنی نکاح کے ذریعے میاں بیوی بندھ کر (مل کر) ایک خاندان کی داغ بیل ڈالتے ہیں اور اس کے واسطے سے معاشرے کی اس بنیاد کو استوار کرنے کا معاہدہ کرتے ہیں جس پر ایک صالح تہذیب اور پاکیزہ تمدن کے وجود وظہور کا دار ہے۔[1]

اسلامی شریعت میں نکاح کی حیثیت جو ایک معاہدہ کی قرار دی گئی ہے، اس کا مقصد یہ ہے کہ اس رشتہ کے سلسلے میں مرد و عورت کی حیثیت برابر کی ہے اور جس طرح دو آدمی آپس میں خوشی سے خرید وفروخت کا معاہدہ کرتے ہیں اسی طرح میاں بیوی اپنی مرضی اور خوشی سے ایک ساتھ زندگی گزارنے کا معاہدہ کرتے ہیں...... اسلامی شریعت نے انسان کی نفسیات اور فطرت کے پیش نظر اسے خالص مرد و عورت کا مساویانہ حق سمجھا ہے۔ اس لیے کہ زندگی ان کو گزارنی ہے۔ اس بناء پر اس میں رضا اور خوشی کو مغربی تہذیب

---

[1] مجیب اللہ ندوی، مولانا۔ اسلامی فقہ، زاہد بشیر پرنٹرز، لاہور، ۱۹۹۱ء، ص ۱۲

کی طرح اس میں بے لگام نہیں چھوڑا بلکہ اس کو قانونی بندشوں اور اخلاقی قدروں کا پابند بھی کیا ہے۔[۱]

۲۔ دَین:

قرض کا لفظ مصدر کی صورت میں "اقرض" (قرض دینے کے معنی میں آتا ہے) قرض کو سلف بھی کہتے ہیں، اور سلف کے معنی ہیں کسی کو ایک چیز کا مالک اس شرط پر بنا دینا کہ وہ اتنی ہی چیز واپس کرے گا۔[۲]

قرض یا دَین بھی طے شدہ معاہدہ کے ذریعے ہوتا ہے۔ اس لیے دَین کے معاملے میں بھی معاہدے کو بڑی اہمیت حاصل ہے......دَین اور قرض میں عام وخاص کا فرق ہے ہر قرض کو دَین کہہ سکتے ہیں مگر ہر دَین کو قرض نہیں کہہ سکتے۔ قرض وہ نقد جنس کہلاتا ہے جو کسی کو واپسی کی شرط کے ساتھ دیا جائے اور اگر کوئی چیز خریدی مگر قیمت باقی ہے، تو اسے قرض نہیں کہا جائے گا بلکہ دَین کہا جائے گا اسی طرح اگر قیمت پیشگی وصول کر لی لیکن مال ابھی نہیں دیا تو یہ مال بائع کے ذمہ دَین کہلائے گا قرض نہ ہوگا۔ قرض دینے والے اور قرض لینے والے کو ان اخلاقی ذمہ داریوں اور ہدایتوں پر عمل کرنا چاہیے جو اس سلسلہ میں اسلامی شریعت نے مقرر کی ہیں۔[۳]

اسلامی حکومت پر بھی یہ ذمہ داری ہے کہ اہلِ حاجت کو بیت المال سے غیر سودی قرضے دے اور اگر وہ ادا نہ کر سکیں تو قرضہ معاف بھی کر دے۔ ابتدائے اسلام میں بھی جب تک مہاجرین وانصار تنگ دست تھے اور اسلامی حکومت کا بیت المال قائم نہیں ہوا تھا اس وقت قرض دار میت کا جنازہ پڑھانے میں آپ ﷺ سے اس لیے توقف فرماتے کہ اعزہ اقارب یا معاشرے کے خوشحال افراد اس کا قرض ادا کرنے کو آگے بڑھیں لیکن جب بیت المال قائم ہو گیا اور اس میں رقم جمع ہونے لگی، تنگ دست مقروض کا قرض آپ بحیثیت نبی اور سربراہ حکومت خود ادا فرمانے لگے۔[۴]

۳۔ رہن:

لفظ "رہن" کے لغوی معنی ثابت رہنے یا قائم رہنے کے ہیں، چنانچہ کہا جاتا ہے "مـاء راھـن" یعنی ٹھہرا ہوا پانی اور "نعمة راھنه" یعنی پائیدار نعمت۔ لغت میں اس کے معنی "پابند ہو جانے" کے ہیں۔[۵]

رہن (گروی رکھنا) کسی مال کو کسی ایسے حق کے مقابلے میں اپنے قبضے میں رکھنا، جس حق کی ادائیگی اس مال سے ممکن ہو۔ ایسے مال کو مرھون یا مال رہن کہا جاتا ہے۔ یعنی گروشدہ مال۔[۶]

---

[۱] محیب اللہ ندوی، مولانا۔ اسلامی فقہ، زاہد بشیر پرنٹرز، لاہور، ۱۹۹۱ء، ص ۱۲

[۲] ایضاً

[۳] منہاجی، منہاج الدین، اسلامی فقہ، دہلی، مکتبہ الحسنات، ۱۹۸۶ء، ص ۵۶۷

[۴] منہاج الدین منہاجی، اسلامی فقہ، ص ۵۶۷

[۵] الجزیری، عبدالرحمٰن، کتاب الفقہ علی مذاھب الاربعہ، لاہور: محکمہ اوقاف ۱۹۷۱ء، ۲/۳۳۹

[۶] مجلۃ الاحکام العدلیہ، دفعہ: ۷۰۱، لاہور: محکمہ اوقاف، ص ۱۵۸

رہن معاشی کاروبار میں اعتماد (Credit) کا ایک ذریعہ ہے۔ رہن بطور ذریعہ کے جاہلیت کے عربوں میں بھی رواج پذیر تھا۔ جب کوئی سرمایہ دار محتاج کو قرض دیتا تو اس کو کوئی چیز یا زمین وغیرہ اپنے ہاں رہن رکھ لیتا۔ مدینہ منورہ کے یہودی سرمایہ دار محتاجوں کے بچے اور بیویاں تک رہن رکھ لیا کرتے تھے۔[1]

۴۔ امانت و ودیعت:

ازروئے لغت ودیعت (امانت) سے مراد وہ شے ہے جو مالک کے علاوہ کسی اور کے پاس حفاظت کی غرض سے رکھی جائے۔ کہا جاتا ہے کہ "اودعتہ مالا" یعنی میں نے فلاں مال اس کے سپرد کر رکھا ہے۔ تاکہ اس کے پاس محفوظ رہے اسی طرح یہ "اودعتہ مالا" اس معنی میں بھی بولا جاتا ہے کہ میں نے اس شخص کا فلاں مال کا اپنے پاس بطور امانت (حفاظت) رکھنا قبول کیا۔
گویا ایک لفظ دو متضاد معنوں میں استعمال ہوتا ہے یعنی اپنی چیز کسی کے پاس امانت رکھنا یا کسی کی چیز اپنے پاس امانت رکھنا۔[2]

ودیعت بھی دوسرے معاہدات کی طرح ایک معاہدہ ہے جس میں دوسرے معاملات کی طرح ایجاب و قبول ضروری ہے خواہ صراحتاً ہو یا دلالتاً دو صورتوں میں معاہدہ ودیعت ختم ہو جاتا ہے۔

۱۔ ایک یہ کہ جتنے دن کے لیے اس نے امانت رکھی تھی وہ مدت ختم ہو گئی۔

۲۔ دوسرے امین یا مودع یعنی امانت رکھنے والے میں سے کوئی معاہدہ فسخ کر دے۔ کیونکہ ان دونوں کو ہر وقت اختیار ہے کہ وہ اس کو جب چاہیں ختم کر دیں۔[3]

امانت کی بنیاد ہی اس وعدہ پر ہے کہ امانت رکھنے والا اس کی حفاظت کرے اور طلب کرنے پر واپس کر دے۔ اس خوبی کے لحاظ سے خود حضور اکرم ﷺ ایک بے مثال مقام رکھتے ہیں کہ نبوت سے پہلے ہی قوم نے انہیں صادق و امین تسلیم کر لیا تھا۔ حجر اسود کی تنصیب میں جب آپ کی تحکیم تسلیم کی گئی تو مجمع آپ کی سب سے پہلے آمد پر سب لوگ بے ساختہ پکار اٹھے "ھذا الامین رضیناہ ھذا محمد ﷺ"۔[4]

۱۔ نور محمد غفاری۔ نبی کریم کی معاشی زندگی، لاہور: دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری، ص ۵۸

۲۔ اسلامی فقہ، ۲/۳۴۷

۳۔ ایضاً ۲/۳۸۱

۴۔ رحمۃ للعالمین، ۱/۴۳

معاشی زندگی اور معاہدات

سماجی زندگی کی طرح معاشی زندگی میں بھی معاہدات کی بہت اہمیت ہے۔معاملات تجارت، بیع کی اقسام، احکام وشرائط شراکت، مضاربت، مزارعت نیز آجر اور اجیر کے حقوق وغیرہ میں معاہدات واضح طور پر ہماری رہنمائی کرتے ہیں۔اگر معاشی زندگی میں معاہدے کے ضروری پہلو کو نظر انداز کر دیا جائے تو پورا نظام بے وزن نظر آتا ہے۔

دور جہالت کی تجارتی صورتیں:

عربوں میں اسلام سے قبل تجارتی کاروبار کی مختلف شکلیں مروج تھیں جن میں بیع منابذہ، بیع ملامسہ، بیع حبل الحبلہ، بیع محاقلہ، بیع مصراۃ، بیع نجش اور بیع مضطر وغیرہ تھیں۔ اسلام نے ان تمام تجارتی شکلوں کو ممنوع قرار دیا۔ان اشکال مبادلہ کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایام جاہلیت کے عربوں میں احتکار و اکتناز کے ذریعے مال کو روک کر مصنوعی قلت پیدا کرنا اور قیمتوں کو بڑھا چڑھا کر وصول کرنا بھی ان کا عام فن تھا۔[1]

قریش کے تجارتی معاہدے:

قریش بیت اللہ کے ہمسائے اور خانہ کعبہ کے متولی ہونے کے سبب تمام اقوام عالم میں نہایت معزز و مکرم خیال کیے جاتے تھے۔ان کے تجارتی قافلے ہمسایہ ممالک میں بلاخوف وخطر سفر کیا کرتے تھے پھر بھی قریش کے داناؤں نے تمام ہمسایہ اقوام سے تجارتی معاہدے کر رکھے تھے جنہیں ''معاہدات ایلاف'' (معاہدات امن وسلامتی) کہا جاتا تھا اور قریش کو ''اصحاب الایلاف'' (معاہدہ امن وسلامتی برائے تجارت کرنے والے) کہا جاتا تھا۔جس کا ذکر سورۃ القریش میں اشارۃً موجود ہے:

لِإِيلَافِ قُرَيْشٍ O إِيلَافِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَاءِ وَالصَّيْفِ O[2]

تجارتی معاہدہ کے ضوابط:

کاروبار میں تجارتی معاہدوں کو کلیدی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔تجارتی کاروبار کی خیر خواہی، جواز وعدم جواز کا تمام انحصار انہیں معاہدوں پر ہوتا ہے۔تجارتی معاہدہ دراصل وہ عہد وپیمان ہے جس کی رو سے دو فریق بائع اور مشتری (خریدار) کسی چیز کی تجارت، خرید وفروخت وسودا طے کرتے ہیں۔اگر معاہدہ درست ہو گیا تو تجارتی عمل کے تمام مراحل بحسن وخوبی طے ہو جاتے ہیں، اور اگر معاہدہ غلط ہوا یا فریقین میں سے کسی ایک نے دھوکہ دہی سے کام لیا تو معاہدہ ٹوٹ جائے گا۔

اسلام کے عادلانہ نظام تجارت نے تجارتی معاہدہ کے درست اور خیر خواہانہ ہونے پر زور دیا ہے۔جس سے امن وآشتی اور بھائی چارہ قائم ہوتا ہے۔اور اس میں مسلم وغیر مسلم میں کوئی فرق روا نہیں رکھا گیا۔

---

[1] نور محمد غفاری۔اسلام کا قانون تجارت،لاہور: دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری، ۱۹۸۶ء، ص ۴۳

[2] القریش ۱۰۶: ۱۔۲

معاشی معاہدات کی پسندیدہ صورتیں:

اسلام کا قانون تجارت جہاں ان تمام طریقوں کو جو مکروہ فاسدہ اور حرام ہیں، ناپسندیدہ قرار دیتا ہے۔ وہاں مضاربت اور شراکت جیسے طریقوں کو استحسان کی نظر سے دیکھتا ہے۔[۱]

۱۔ مضاربت:

مضاربت دو فریقوں کے درمیان اس امر پر مشتمل معاہدہ ہوتا ہے جس میں ایک فریق دوسرے کو اپنے مال پر اختیار دیتا ہے کہ وہ اپنے نفع میں سے ایک مقرر نسبت کے عوض مخصوص شرائط کے ساتھ اس کو تجارت پر لگائے۔

مفردات القرآن کے مطابق مضاربت ایک قسم کی تجارتی شرکت ہے۔[۲]

شرعاً ایک طرف سے مال اور دوسری طرف سے عمل نفع میں شریک ہونے کے معاہدہ کو مضاربت کہتے ہیں، پس اگر باوجود ایک طرف سے مال اور دوسری طرف سے عمل ہو لیکن نفع میں شریک نہ ہو بلکہ یہ شرط ہو کہ نفع تمام تر رب المال (سرمایہ دار) کا ہوگا تو یہ بضاعت ہوگی۔ اور اگر یہ شرط ہو کہ سارا نفع ہی عامل کا ہوگا تو قرض ہے۔[۳]

شرعی اصطلاح میں مضاربت نفع میں شرکت کے معاہدے کو کہتے ہیں۔ یہ معاہدہ مال اور عمل سے ہوتا ہے اور عمل مضارب کی جانب سے معاونت باہمی کی چند قسمیں ہیں، ان میں سے ایک مضاربت ہے وہ یہ کہ مال ایک شخص کا اور محنت دوسرے شخص کی ہو، اور رضامندی طرفین کی تصریح کے ساتھ نفع دونوں کے درمیان ہو۔[۴]

۲۔ شراکت:

تجارتی کاروبار کا یہ قدیم ترین تعاونی طریقہ شراکت ہے۔ یہ طریقہ تجارت قبل از اسلام متمدن عربوں میں رواج پذیر تھا۔ اسلام نے اس کے فوائد کو مدنظر رکھتے ہوئے اسے پسندیدہ طریقہ تجارت قرار دیا۔

شراکتی کاروبار اسلام میں جائز ہے۔ نبی اکرم ﷺ مبعوث ہوئے تو لوگوں میں شراکت کا طریقہ تجارت جاری تھا۔ آپ ﷺ نے لوگوں کو اس پر برقرار رکھا۔

تمام فقہائے اسلام ایسی شراکت کو جائز سمجھتے ہیں جس کے شرکاء میں سے ہر ایک شریک دوسرے شریک ہی کی طرح اس قسم کا مال یعنی درہم و دینار کاروبار (تجارت) میں لگا دیتا ہے اور انہیں اس طرح خلط ملط کر دیتا کہ وہ مل کر ایک ہی مال بن جاتے ہیں حتیٰ کہ ان میں تمیز نہیں رہتی کہ کس کا مال فروخت کیا اور کس کے مال سے سامان تجارت خریدا گیا۔ نفع و نقصان میں شرکاء اپنے حصہ

۱۔ کتاب الفقہ، کتاب المبیع، ۲/۱۳۸

۲۔ مفردات القرآن، ص ۵۳۱

۳۔ فتاویٰ عالمگیری، کتاب المضاربت، لاہور: حامد اینڈ کمپنی، ۲/۳۹۸

۴۔ شاہ ولی اللہ، حجۃ اللہ البالغہ، المکتبہ السلفیہ، لاہور، ۱۹۸۳ء، ۲/۳۹۸

رسدی کے تناسب سے شریک ہوتے ہیں۔[1]

شرکت یہ ہے کہ دو یا دو سے زائد افراد کا کاروبار میں متعین سرمایوں کے ساتھ اس معاہدے کے تحت شریک ہونا کہ سب کاروبار کریں گے اور کاروبار کے نفع ونقصان میں متعین نسبتوں کے ساتھ شریک ہوں گے۔[2]

۳۔ مزارعت:

مزارعت ''زرع'' سے مفاعلہ ہے جس کے معنی اگانے کے ہیں۔ مزارعت، زمین کے مالک اور زمین پر کام کرنے والے کاشتکار کے درمیان ہونے والے ایسے معاہدے کا نام ہے جس میں وہ طے شدہ معاہدے کے مطابق اپنا حصہ وصول کرتے ہیں۔[3]

جب مسلمان ہجرت کر کے مدینہ پہنچے تو رسول اکرم ﷺ نے مہاجرین کے معاشی مسئلہ کو حل کرنے کے لیے مواخات کا سلسلہ قائم کر دیا۔ حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ اسی سلسلہ میں انصار نے رسول اکرم ﷺ سے عرض کیا کہ ہمارے نخلستان ہم میں اور ہمارے بھائیوں میں تقسیم فرما دیجیے۔ آپ نے فرمایا نہیں۔ پھر انصار نے مہاجرین کو مخاطب کر کے کہا کہ آپ ان میں محنت کریں ہم آپ کو پیداوار میں شریک کرتے ہیں۔ مہاجرین نے کہا ہمیں منظور ہے۔[4]

اسی طرح جب رسول اللہ ﷺ خیبر والوں پر غالب ہوئے آپ ﷺ نے چاہا کہ یہودیوں کو وہاں سے نکال دیں۔ لیکن انہوں نے آپ ﷺ سے درخواست کی کہ آپ یہود کو خیبر میں رہنے دیں۔ وہ کھیتی باڑی کریں گے اور پیداوار میں سے نصف حصہ لیں۔ رسول ﷺ نے یہ قبول فرمایا۔ صحیح بخاری میں ہے **اعطی رسول اللہ ﷺ خیبرا الیھود ان یعملوھا و یزرعوھا و لھم شطر ما یخرج منھا**۔ رسول اللہ ﷺ نے یہود خیبر کو ان کی زمینوں پر ایک خطے کے بدلے برقرار رکھا۔[5]

۴۔ مساقات:

اس کا مادہ سقی۔ سقیاً ہے جس کے معنی سیراب کرنا، پلانا، بارش دینا یا دعا کرنے کے ہیں۔ اسی سے لفظ استسقا بنا ہے جس کے معنی پانی یا بارش طلب کرنے کے ہیں۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ہے:

وَإِذِ اسْتَسْقَىٰ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ[6]

معاہدہ عمل میں چونکہ سب سے مشکل کام پرانے زمانے میں پانی دینا ہوتا تھا اس لیے اس کام کا نام مساقات رکھا گیا۔[7]

۱۔ مرغینانی، برہان الدین، امام ابو الحسن علی بن ابی بکر۔ الھدایہ، کتب خانہ رشیدیہ دہلی، ۱۳۵۸ء، کتاب الشرکت، ۲/۲۰۲-۲۰۳

۲۔ نجات اللہ صدیقی، شرکت ومضاربت کے شرعی اصول، لاہور: اسلامک پبلی کیشنز، ۱۹۶۹ء، ص ۱۹

۳۔ مجیب اللہ ندوی، اسلامی فقہ، ۲/۳۱۰

۴۔ بخاری، کتاب الشروط، باب الشروط فی المعاملہ (۲۷۱۹) ص ۲۱۶

۵۔ الجامع الصحیح للبخاری، کتاب الشروط، باب الشروط فی المعاملہ (۲۷۱۹) الکتب الستۃ ص ۲۱۶

۶۔ البقرہ ۲: ۶۰

۷۔ کتاب الفقہ ۲/ ۷۸۹

باغ یا درخت کسی کو اس لیے دینا کہ اس کی خدمت کرے اور جو کچھ اس سے پیداوار ہوگی اس کا ایک حصہ کام کرنے والے کو دیا جائے گا، اور ایک حصہ مالک کو دیا جائے گا۔ اس کو مساقات کہتے ہیں۔[1]

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے خیبر کی زمین اور کھجور کے درخت یہودیوں کو اس شرط پر دیئے کہ وہ اس میں اپنے مالوں کے ساتھ محنت کریں، اور رسول اللہ ﷺ کے لیے نصف پھل ہیں۔[2]

اسی طرح جب مکہ کے مسلمان ہجرت کر کے مدینہ گئے تو ان کی تنگدستی اور بے سروسامانی دیکھ کر انصار مدینہ نے رسول اللہ ﷺ سے کہا: یا رسول اللہ! آپ ہمارے کھجور کے باغات اور درختوں کو انصار و مہاجرین میں تقسیم فرما دیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا یہ نہیں ہو سکتا۔ پھر انصار نے مہاجرین سے کہا کہ تم محنت کرو اور پھل میں ہم دونوں شریک ہوں گے، انہوں نے اسے قبول کر لیا۔[3]

۵۔ اجارہ :

(i) **الاجارة عقد علی المنافع بعوض**

(ii) اجارہ ایک معاہدہ ہے جو کسی معاوضہ کے بدلہ کسی منفعت پر کیا جائے۔

(iii) اجارہ کے لغوی معنی ہیں اجرت و مزدوری، یہ لفظ اجارہ پر دینے کے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے۔[4]

معاہدۂ اجرت، یہ وہ مسلمہ حق ہے جسے اسلام نے آج سے چودہ سو برس پہلے محنت کش طبقہ کو دیا تھا۔ جس کے حصول کے لیے موجودہ دور میں مزدوروں کی انجمنیں دوڑ دھوپ کر رہی ہیں، مگر اب تک اس کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکلا۔

۶۔ معاہدۂ اجرت :

اسلامی قانون اجرت میں مستاجر، مالک اور مزدور کی حیثیت دو معاہدہ کرنے والوں کی ہوتی ہے۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت شعیب علیہ السلام سے یوں چرائی کا معاملہ کیا تو گویا حضرت شعیب علیہ السلام نے یہ کہہ دیا تھا کہ مجھے یہ حق ہے کہ میں تم پر کوئی زیادتی نہ کروں مگر پھر بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ واضح کر دیا تھا کہ ''میرے اور آپ کے درمیان ایک معاہدہ ہے۔ ان دونوں میں سے جس مدت کو میں پورا کر دوں، مجھ پر زیادتی نہ کی جائے۔'' قرآن میں ہے:

قَالَ ذٰلِكَ بَيْنِيْ وَبَيْنَكَ اَيَّمَا الْاَجَلَيْنِ قَضَيْتُ فَلَا عُدْوَانَ عَلَيَّ[5]

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بحیثیت اجیر (مستاجر) یہ وضاحت کر دی کہ میں محض معاہدہ کا پابند ہوں۔ اس کے علاوہ میرے اوپر کوئی ذمہ داری نہیں۔ مقصد یہ کہ ہمارے اور آپ کے درمیان جو معاہدہ ہوا ہے اس کی پابندی دونوں پر لازم ہے۔

اجرت کے معاملہ کو معاہدہ قرار دینے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ دونوں کو مساوی درجہ دیا جاتا ہے تا کہ معاشی اعتبار سے بھی ان کو وہی مرتبہ حاصل ہو جو ایک مستاجر کو حاصل ہوتا ہے۔

---

[1] امجد علی، مولانا۔ بہار شریعت، لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۸۸/۲

[2] الجامع الصحیح للبخاری، کتاب المزارعۃ، باب المزارعۃ (۲۳۲۸) الکتب الستۃ، ص ۱۸۲

[3] الجامع الصحیح للبخاری، کتاب الشروط، باب الشروط فی المعاملۃ (۲۷۱۹) الکتب الستۃ، ص ۲۱۶

[4] مجلۃ الاحکام العدلیہ، دفعہ: ۴۰۵، ص ۹۶

[5] القصص، ۲۸:۲۸

سیاسی زندگی اور معاہدات

انسانی زندگی میں معاشرتی اور معاشی معاہدات کو جس طرح اہمیت حاصل ہے اسی طرح سیاسی معاملات میں بھی معاہدات کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ سیاسی معاہدات انسانی زندگی میں تعلقات کی بہتری کی ضمانت فراہم کرتے ہیں تاکہ مختلف گروہ یا ممالک ایک دوسرے کے حلیف بن کر رہیں اور کسی کے لیے بھی بدعہدی کرنا آسان نہ ہو۔

سیاسی معاملات میں معاہدات کی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک مؤقت، جیسے صلح حدیبیہ کا معاہدہ۔ دوسرا مطلق جیسے نجران کے عیسائیوں کا معاہدہ۔ یعنی ایک معاہدہ کسی خاص مدت کے لیے ہوتا ہے اور ایک ہمیشہ کے لیے۔[1]

ایسے ممکنہ سیاسی معاہدات درج ذیل ہیں:

۱۔ معاہدۂ جوار:

معاہدۂ جوار یہ ہے کہ ایک غیر مسلم پڑوسی حکومت یا کسی طبقہ سے مسلمان کوئی معاہدہ کریں کہ ایک دوسرے کے حقوق کا خیال کریں گے اور آپس میں مل کر کچھ مشترکہ اقدامات کریں گے، جیسا کہ آپ نے یہود مدینہ سے معاہدہ کیا تھا کہ وہاں جو یہودیوں کے تین بڑے قبیلے آباد تھے ان کی حیثیت مستقل چھوٹی چھوٹی ریاستوں کی تھی۔ جن کے ماتحت بہت سے دوسرے یہودی اور غیر یہودی قبائل تھے۔

۲۔ معاہدۂ حلف:

دو قبیلے یا دو قومیں یا دو ملک یہ معاہدہ کریں کہ جنگ کے موقع پر ایک دوسرے کی مدد کریں گے جیسا کہ صلح حدیبیہ کے وقت بنوخزاعہ مسلمانوں کے حلیف بن گئے تھے اور بنوبکر قریش کے اس طرح بہت سے دوسرے قبائل بھی حلف میں داخل تھے۔ موجودہ دور میں چھوٹے ملک عموماً بڑے ملکوں سے اس طرح معاہدہ کرتے رہتے ہیں جیسے نائو معاہدہ اور سیٹو معاہدے ہیں۔

۳۔ معاہدۂ امن وصلح:

معاہدہ کی سب سے اہم صورت وہ ہوتی ہے جو دو قوموں یا دو حکومتوں کے درمیان جنگ کے بعد اختیار کی جاتی ہے، جیسا کہ آپ ﷺ نے صلح حدیبیہ میں معاہدہ صلح فرمایا تھا اور آپ کے بعد خلفاء راشدین نے سینکڑوں معاہدے کیے تھے۔ ان معاملات کے لیے امام یعنی حکومت یا اس کے مقرر کردہ ذمہ دار کی اجازت ضروری ہے۔

۴۔ معاہدۂ امان:

معاہدۂ امان دو طرح کا ہوتا ہے۔ یہ معاہدہ عموماً ان اشخاص سے متعلق ہوتا ہے جو کسی غیر مسلم حکومت کے باشندے

---

[1] حبیب اللہ ندوی، اسلام کے بین الاقوامی اصول وتصورات، دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری لاہور، ۱۹۹۰ء، ص ۷۷

ہوں اور دارالاسلام یا مسلمان حکومت میں پناہ لینے یا کاروبار وغیرہ کرنے کی غرض سے آئیں۔ اس کی کئی صورتیں ہو سکتی ہیں:

☆ ایک یہ کہ یہ افراد اس حکومت کے فرد ہوں جن سے عملاً مسلمان حکومت سے جنگ ہو رہی ہو یا جنگ کے امکانات ہوں تو ایسے افراد کو بھی پروانۂ امن دیا جا سکتا ہے بشرطیکہ وہ جاسوسی کے لیے یا اسلحہ کے فروخت کے لیے یا کسی حرام چیز کی تجارت کی غرض سے نہ آئے ہوں۔

☆ دوسرے یہ کہ یہ افراد ایسی مملکت کے ہوں جس سے اسلامی حکومت کا پہلے معاہدہ ہو، تو ان پر آمد و رفت اور کاروبار پر کوئی پابندی نہیں ہے البتہ حرام چیز کے کاروبار کی پابندی ان پر بھی باقی رہے گی۔

☆ تیسرے وہ افراد جو نہ تو دارالحرب کے ہوں اور نہ دارالعہد کے بلکہ کسی بھی غیر جانب دار ملک کے باشندے ہوں، ان کو بھی ہر طرح کی آزادی حاصل ہوگی۔[1]

معاہدات خواہ کسی بھی قسم کے ہوں ان کی پابندی بہر حال ضروری ہے کیونکہ زندگی گزارنے کے لیے ضوابط ناگزیر ہیں تاکہ خاندان و اجتماع کے تعلقات صحیح خطوط پر استوار ہو سکیں اور انسانوں کے انسانوں سے روابط درست ہو سکیں، اور ان اشیاء سے بھی انسان کا تعلق صحیح ہو جو اس کے گرد و پیش میں موجود ہیں اور اس کے لیے مسخر کی گئی ہیں۔ بعد از اں انسانوں کے اپنے خالق و مولیٰ سے رشتہ صحیح بنیادوں پر استوار ہو۔

اسلام انسان کے ان ہمہ پہلو تعلقات و روابط کو درست کرتا ہے اور ان تمام روابط کو اللہ تعالیٰ کی ذات سے وابستہ کر دیتا ہے تاکہ ان تمام روابط و تعلقات میں احترام کی روح سرایت کر جائے اور انسانی روابط وقتی جذبات اور لمحاتی میلانات کی نظر ہو کر نہ رہ جائیں۔ اور یہ نہ ہو کہ جب انسان کے سامنے مصالح اور مفادات ہوں تو تعلقات بہتر ہو جائیں اور جب مفادات ختم ہو جائیں تو روابط بھی منقطع ہو جائیں۔ اسلام کے نقطہ نظر سے جملہ انسانی روابط اللہ کے استوار کردہ ہیں اور انسانیت کی ہمہ گیر معلومات پر حاوی ہیں اور ادب کا شیوہ ہے کہ انسان اللہ کے مقرر کردہ ضوابط کی تسلیم و رضا کے ساتھ پابندی کرے، ان تمام ضوابط کا اجمالی نام ''عقود'' ہے اور اللہ نے جملہ عقود کو پورا کرنے کا حکم دیا ہے۔

---

[1] اسلام کے بین الاقوامی اصول و تصورات، ص ۷۷

فصل دوم:

انسانی زندگی میں معاہدات کی اہمیت

۱۔ معاہدات اور انسانی زندگی

۲۔ معاہدات کی اہمیت از روئے قرآن

۳۔ معاہدات کی اہمیت از روئے احادیث

معاہدات اور انسانی زندگی

انسانی تمدن کی ساری عمارت عہد و پیمان کی بنیاد پر کھڑی ہوتی ہے۔ انسانی معاشرے کے تمام اداروں اور تمام تعلقات کی اساس معاہدات پر ہی ہوتی ہے۔ ان کی نوعیت خواہ سیاسی یا معاشی و معاشرتی ہو۔

وعدوں کے احترام کے بغیر معاشرے میں کوئی خیر و خوبی باقی نہیں رہ سکتی۔ معاہدوں کی عدم پاسداری کی صورت میں اداروں کی بنیادیں ہل جاتی ہیں۔ اور باہم اعتماد کی فضا کا قائم رہنا ممکن نہیں رہتا۔ اجیر اور مستاجر میں ہم آہنگی باقی نہیں رہتی اور نہ ہی لین دین کے معاملات خیر و خوبی سے چل سکتے ہیں۔ یہاں تک کہ ازدواجی تعلقات اور خاندانی رابطوں میں استحکام کا فقدان نظر آتا ہے۔

دینی زندگی کی بنیاد ایمان پر ہوتی ہے۔ ایمان لانے والا دراصل یہ عہد کرتا ہے کہ اس نے اللہ کو اپنا رب واحد، رسول اللہ ﷺ کو اپنا پیشوا اور اسلام کو تمام شعبہ ہائے حیات کے لیے لائحہ عمل کے طور پر قبول کر لیا ہے۔ خدا اور رسول نے جو کچھ حکم دیے ہیں، انھیں وہ مانے گا۔ جن چیزوں سے روکا ہے ان سے وہ باز رہے گا۔ جو کچھ حلال قرار دیا ہے اسے حلال مانے گا اور جو کچھ حرام قرار دیا ہے اسے حرام تسلیم کرے گا۔ ایک رضا کارانہ فیصلہ ہے جس کے تحت آدمی نفس کے بہت سے تقاضوں سے دست بردار ہو کر اپنے آپ کو دین کی حدود کا پابند بناتا ہے۔[1]

وفائے عہد کی اہمیت کا اندازہ اس سے بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بعض جلیل القدر انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی جلالت قدر کی خصوصیات میں اس کو بھی شمار کیا ہے۔[2]

وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ إِسْمَاعِيلَ إِنَّهُ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَكَانَ رَسُولًا نَّبِيًّا ۝ [3]

(اور کتاب میں اسمٰعیل کا ذکر کرو بلا شبہ وہ وعدہ کا سچا تھا اور خدا کا رسول و نبی تھا)۔

گویا عہد کو ایک قسم کی امانت کا نام دیا گیا ہے اور یہ امانت اشیاء کی صورت میں بھی ہوتی ہے اور فرائض کی صورت میں بھی۔
آنحضرت ﷺ کو اپنی فرض شناسی اور عہد پروری کی وجہ سے آپ ﷺ کے اہل شہر نے امین و صادق کا خطاب دیا۔ آپ ﷺ صرف اشیاء کی امانتوں کی ہی حفاظت نہ کرتے تھے بلکہ قول و فعل کے معاہدات کے بھی پاسباں تھے۔

اسلام نہ صرف دوستوں اور بہی خواہوں سے معاہدات پورا کرنے کی تلقین کرتا ہے بلکہ دشمنوں سے بھی بد عہدی اور معاہدہ شکنی سے منع کرتا ہے۔ آنحضرت ﷺ نے مشرکین سے کئی معاہدات کیے اور یہ تمام معاہدات عہد و پیمان اور ان کی پاسداری کا بہترین نمونہ تھے۔ ان تمام معاہدات کا آغاز ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' سے ہوتا ہے۔ گویا خدا کے نام سے معاہدہ شروع کر کے یہ تاثر

---

[1] نعیم صدیقی، مقالات سیرت۔ اسلام آباد، وزارت مذہبی امور، حکومت پاکستان، ربیع الاول ۱۴۰۲ھ ''اوفوا بالعقود''، ص ۱۱۰

[2] حفظ الرحمٰن سیوہاروی، اخلاق اور فلسفہ اخلاق، خالد مقبول پبلشرز، لاہور، ۱۹۷۶ء، ص ۵۲

[3] مریم: ۱۹: ۵۴

دیا کہ خدا گواہ ہے، چنانچہ اسی بنا پر ایک مسلمان کا اقرار بھی پوری ملت کے دیے ہوئے امان کا درجہ رکھتا ہے اور عالمی سطح پر امن وامان صرف اسی صورت میں قائم رہ سکتا ہے جب تمام قومیں اپنے معاہدات کی پابندی کریں اور اس سلسلے میں احکام الٰہی کے تابع رہیں۔[۱]

عہد اور معاہدے میں معمولی فرق ہے۔ عہد یک طرفہ بھی ہو سکتا ہے، مگر معاہدہ ہمیشہ طرفین کے درمیان طے پاتا ہے۔ اور جانبین پر اس کی حفاظت ونگہداشت کی یکساں ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔

بلاشبہ انسانی زندگی میں معاہدات کی اہمیت سے کوئی انکار نہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ایک جامع آیت میں جہاں نیکی کے دیگر معیارات کا تذکرہ فرمایا ہے وہاں معاہدات کی انسانی زندگی میں اہمیت کا تذکرہ بھی بخوبی فرمایا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

لَّيْسَ الْبِرَّ أَن تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلَٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالْكِتَابِ وَالنَّبِيِّينَ وَآتَى الْمَالَ عَلَىٰ حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ وَالسَّائِلِينَ وَفِي الرِّقَابِ وَأَقَامَ الصَّلَاةَ وَآتَى الزَّكَاةَ وَالْمُوفُونَ بِعَهْدِهِمْ إِذَا عَاهَدُوا ۔[۲]

(ساری اچھائی مشرق ومغرب کی طرف منہ کرنے میں ہی نہیں، بلکہ حقیقتاً اچھا وہ ہے جو اللہ تعالیٰ پر، قیامت کے دن پر، فرشتوں پر، کتاب اللہ پر اور نبیوں پر ایمان رکھنے والا ہو، جو مال سے محبت کرنے کے باوجود قرابت داروں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں اور سوال کرنے والوں کو دے، غلاموں کو آزاد کرے، نماز کی پابندی اور زکوٰۃ کی ادائیگی کرے، جب وعدہ کرے تب اسے پورا کرے۔)

گویا قرآن کریم میں "بر" کی جو تعریف کی گئی ہے اس میں بنیادی عقائد وعبادت کے بعد اسی معاہدہ کی یاد دہانی فرمائی گئی ہے جو سب سے پہلے آدم اور اولاد آدم کے ہر فرد سے لیا گیا۔ یہ معاہدہ ایک بنیادی معاہدہ ہے اس کی پابندی جوہر آدمیت ہے۔ جب اس کی پابندی ہوگی تو دوسرے معاہدات کی پابندی بھی ہوگی، کیونکہ معاہدات پابندی اور عمل ہی کے لیے ہوتے ہیں یہی انسانیت ہے اور یہی تقاضائے شرافت ہے کہ جو معاہدہ ہو اس کی پابندی کی جائے۔ لہٰذا "بر" اور نیکی کا ایک اہم باب "ایفائے عہد" اور "پابندیٔ قول وقرار" ہے۔ اس پابندیٔ قول وقرار کو اسلام میں یہ اہمیت دی گئی ہے کہ عزیز ترین مفاد معاہدہ پر قربان کیا جاسکتا ہے مگر معاہدہ کو کسی مفاد پر قربان نہیں کیا جاسکتا۔[۳]

یہ اصول درحقیقت اصول توحید کا ہی قدرتی تقاضا ہے۔ انسان کی ذمہ داری وجوابدہی کا تصور نیز انسانی وحدت اور انسانی مساوات کا شعور قدرتی طور پر مسلمانوں پر یہ اخلاقی فریضہ عائد کرتا ہے کہ وہ انفرادی حیثیت میں بھی اور اجتماعی سطح پر بھی، اپنے تمام شخصی، قومی اور بین الاقوامی معاہدوں کی پاسداری اور تکمیل کریں۔ اسلام کے اندر اس اصول کا باضابطہ قیام، اسلام کے دیگر بنیادی

---

[۱] اردو دائرہ معارف اسلامیہ، ۳۰۵/۲۱

[۲] البقرہ۲:۱۷۷

[۳] مولانا سید محمد میاں، دین کامل، لاہور: جمعیۃ پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء، ص ۷۷

اصولوں اور اقدار کے عین مطابق ہے۔ قرآن کی متعدد آیات جن میں مسلمانوں کو اپنے عہد و اقرار کی پاسداری کی تلقین کی گئی ہے اس شعبہ میں اسلام کے حقیقی مثبت اخلاقی رویہ کا نہایت بین ثبوت ہیں۔ یہ اصول دوسرے معیاروں اور لینے اور دینے کے الگ الگ پیمانوں کی کوئی گنجائش نہیں رکھتا۔ کوئی مسلم فیصلہ ساز یا سیاسی مدبر اسلامی فکری ڈھانچہ میں اس کے اصولوں یا اس کی اقدار کے اندر کوئی گنجائش نہیں پا سکتا۔ جس کی رو سے وہ معاہدوں میں بدنیتی یا کسی دانستہ حرکت کے ذریعہ معاہدہ شکنی کا جواز پیش کر سکتا ہو۔[۱]

چونکہ انسانی زندگی کا دائرہ کار نہایت وسیع ہے اور اس میں کسی بھی حیثیت سے معاہدات کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا، لہٰذا زندگی کے ہر شعبے میں معاہدات اپنا اہم کردار ادا کرتے ہیں چاہے وہ زندگی کا معاشی پہلو ہو یا سیاسی، اخلاقی ہو یا مذہبی۔

معاشرتی زندگی میں نکاح کا معاہدہ زندگی کے دو اہم ستونوں کے مابین قرار پاتا ہے۔ اس کے علاوہ معاشرتی روابط کو مستحکم کرنے اور افراد معاشرہ کے درمیان تعلق کو بہترین خطوط پر استوار کرنے کے لیے دین، رہن، امانت و ودیعت جیسے معاہدات نہایت اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

معاشرتی زندگی کی طرح معاشی زندگی میں بھی معاہدات کا بہت اہم کردار ہے۔ معاملات اور تجارت، مضاربت، مساقات، بیع کی اقسام، احکام و شرائط، شراکت، مزارعت، آجر اور اجیر کے حقوق وغیرہ میں معاہدات واضح طور پر ہماری رہنمائی کرتے ہیں اور اگر معاشی زندگی میں معاہدے کے ضروری پہلوؤں کو نظر انداز کر دیا جائے تو پورا معاشی نظام بے وزن نظر آتا ہے۔

جس طرح انسانی زندگی کے معاشرتی اور معاشی امور میں معاہدات کو نہایت اہمیت حاصل ہے اسی طرح سیاسی معاملات میں بھی معاہدات کی اہمیت سے کوئی انکار نہیں، جن کا مقصد انسانی زندگی میں تعلقات کی بہتری کی ضمانت ہے تاکہ مختلف گروہ یا ممالک ایک دوسرے کے حلیف بن جائیں اور کبھی ضمانت لے کر ایک دوسرے سے معاہدہ کریں تو بد عہدی نہ کریں۔

معاہدات خواہ کسی قسم کے ہوں ان کی پابندی انسانی روابط کو صحیح خطوط پر استوار کرنے اور اخلاقی ضوابط کی بحالی کے لیے ناگزیر ہے اور انہی ضوابط اخلاق کا اجمالی نام ''عقود'' ہے جن کی پاسداری کا اسلام نے حکم دیا ہے۔

انسانی زندگی میں معاہدات کی اخلاقی حیثیت:

درحقیقت اصول اخلاق کے لحاظ سے ان معاہدات میں جو دو فریق اپنی آزاد مرضی اور مساویانہ طریقہ سے باہم طے کریں اور ان معاہدات میں جو ایک فریق کی کمزوری یا مجبوری سے ناجائز فائدہ اٹھا کر دوسرا فریق حاصل کرے بڑا فرق ہے۔ اخلاق کی نگاہ میں یہ دو الگ الگ نوعیتوں کے معاہدے ہیں اور ان دونوں کا حکم ہرگز یکساں نہیں ہو سکتا۔ جو معاہدے فریقین کی آزادانہ رضامندی سے مساویانہ طریقے پر طے ہوتے ہوں وہ یقیناً وزنی اور قیمتی معاہدے ہیں۔ ان کی پوری پوری پاسداری ہونی چاہیے۔

لیکن جو معاہدہ فریقین کی آزادانہ رضامندی سے مساویانہ طریقے پر طے نہ ہوا ہو، بلکہ جس کو ایک فریق نے اپنے زور سے حاصل کیا ہو اور اپنی کمزوری یا مجبوری کی بنا پر دوسرے نے مانا ہو وہ اخلاقی حیثیت سے کوئی وزن اور قیمت نہیں رکھتا۔ اس کا قیام و بقا

۱۔ ابوسلیمان عبدالحمید احمد، اسلام اور بین الاقوامی تعلقات، منظر اور پس منظر، لاہور، بُکس بکس، ۱۹۹۱ء، ص ۲۵۲

اخلاق پر نہیں بلکہ فریقین کے حالات پر منحصر ہے۔ جب تک وہ حالات باقی رہیں جن میں اس نوعیت کا معاہدہ ہوا تھا صرف اسی وقت تک ایسا معاہدہ نافذ العمل رہ سکتا ہے اور جب حالات بدل جائیں، جب ظالم کا زور ٹوٹ جائے اور مظلوم کی کمزوری یا مجبوری باقی نہ رہے، ایسے معاہدے کو آپ سے ٹوٹ جانا چاہیے۔

یہ کوئی من گھڑت اصول نہیں ہے بلکہ شریعت اسلامی میں اس کی بنیاد موجود ہے۔ اسلامی قانون سود کے معاہدے کو تسلیم نہیں کرتا، کیونکہ اس میں ایک فریق اپنی برتر مالی پوزیشن کی بنا پر سود کی شرط عائد کرتا ہے اور دوسرا فریق اپنی مالی کمزوری اور اپنے حالات کی مجبوری سے اس شرط کو قبول کرتا ہے اسی طرح اسلامی قانون بیع مضطر کو بھی تسلیم نہیں کرتا، کیونکہ اس میں ایک فریق دوسرے کو پریشان حال دیکھ کر اس کی 100 روپے مالیت کی چیز کے 5 روپے دام لگاتا ہے اور دوسرا فریق اپنی مصیبت سے مجبور ہو کر ان داموں پر اپنی چیز بیچ دیتا ہے۔ یہ اصول صرف شخصی معاملات تک ہی محدود نہیں ہے، بلکہ بین الاقوامی معاملات میں بھی اس کی نظیریں موجود ہیں۔ مثال کے طور پر صلح حدیبیہ کے معاہدے میں منجملہ دوسری شرائط کے ایک شرط یہ بھی تھی کہ مدینے سے جو لوگ بھاگ بھاگ کر مکہ جائیں گے انہیں تو کفار مکہ واپس نہ کریں گے، مگر مکہ سے جو لوگ بھاگ کر مدینہ جائیں گے انہیں نبی ﷺ واپس کر دیں گے۔ یہ صریح طور پر غیر معقول اور غیر منصفانہ شرط تھی جو کہ کفار مکہ کے اصرار پر مانی گئی تھی، اور نبی ﷺ نے صرف اس مجبوری سے اس کو قبول کیا تھا کہ کفار مکہ اس کے بغیر آپ کو اور مسلمانوں کو زیارت کعبہ کا حق دینے کو تیار نہ تھے۔

گویا یہ صریح طور پر بین الاقوامی معاہدے کی یک طرفہ ترمیم تھی، اور اس کے جواز کی اس کے سوا اور کوئی بنیاد نہ تھی کہ جس معاہدے کو ایک فریق نے دوسرے فریق کی مجبوری سے ناجائز فائدہ اٹھا کر تسلیم کرایا ہو۔ اس کی اخلاقی حیثیت ہرگز وہ نہیں ہے جو فریقین کی مساویانہ اور آزادانہ مرضی سے طے کیے ہوئے معاہدوں کی ہوتی ہے۔ یہ ایک مستقل اصول ہے جو قرآن سے مستنبط ہوتا ہے۔[۱]

انسانی زندگی میں معاہدات کی اہمیت کے پیش نظر اسلام نے جس قدر پاسداری عہد کی تاکید کی ہے اس سے معاہدات کے مقاصد اور غرض وغایت سے بخوبی آگاہی ہو جاتی ہے کہ اسلامی معاہدوں کا مقصد اور غرض وغایت وہی ہے جو اسلامی حکومت کی غرض وغایت ہے۔ نظریہ توحید کے مطابق تمام انسانوں کے تعلقات کی بہتری دنیا میں امن کا قیام، ظلم کا خاتمہ اور اسلام کی رہنمائی میں دنیا کے باشندوں کے معاشی، سیاسی اور اجتماعی حقوق کی مساوات ہی ان معاہدات کا اساسی مقصد ہے۔ اسلامی حکومت ایک عالمگیر حکومت ہے اور وہ اس حیثیت سے بین الاقوامی تعلقات کو بروئے کار لاتی ہے، لیکن معاہدوں کی وجہ سے اصل مقصد سے دست بردار نہیں ہوتی۔

۱۔ مودودی، ابوالاعلیٰ سید۔ ہمارے داخلی وخارجی مسائل، لاہور، اسلامک پبلی کیشنز، ۱۹۹۸ء، ص ۱۰۔۱۳

عہدنبویؐ کے اساسی معاہدات:

ہجرت مدینہ کے بعد جب اجتماعی زندگی کا آغاز ہوا اور مدینہ کو ایک سیاسی وحدت بنانے اور اسلامی حکومت کی بنیاد ڈالنے کی کوشش کے ساتھ ساتھ آنحضرت ﷺ نے نہ صرف مسلمانوں کے تحفظ کے لیے بلکہ ہمہ گیر اور عالم گیر امن کی خاطر قریب و بعید کے قبائل اور ارباب اقتدار سے جن میں مہاجرین وانصار اور یہود بھی شامل تھے ایسے معاہدات کیے جن میں ہر شخص کو جان و مال اور دین کا تحفظ رائے اور ضمیر کی مکمل آزادی کے ساتھ فیصلہ کرنے کا موقع دیا گیا ہے۔ اس طرح سیرت مقدسہ ﷺ کا یہ پہلو جو بین الاقوامی حیثیت رکھتا ہے نمایاں ہو کر سامنے آیا۔[1]

یہ معاہدات امن و آزادی کا واضح اعلان ہیں۔ یہ غیر مسلم شہریوں کے حقوق کا بنیادی ماخذ اور سیاسی اصول کی حیثیت رکھتے ہیں۔ بعد میں خلفائے اسلام نے غیر مسلم شہریوں کے لیے جو قانون بنائے ان کی اصل بنیاد بھی معاہدات ہیں۔ عہد نبوی ﷺ کا ریکارڈ آنحضرت کی سیرت، حضور ﷺ کے اخلاق و عادات اسلامی عقائد، عبادات و تعزیرات کے بے شمار مسائل، اسلامی تہذیب و تمدن کی خصوصیات، حکومت اسلامی کے سیاسی نظریات اور اسلامی تاریخ کے اہم ابواب کے لیے یہ خصوصیات اور معاہدے بنیادی ماخذ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اگر ان پر عمل ہوتا تو نہ صرف یہ کہ عرب کی تاریخی بدامنی ختم ہو جاتی بلکہ ہر ایک قبیلے کو رائے اور ضمیر کی مکمل آزادی کے ساتھ اپنے حال اور مستقبل پر غور کرنے اور فیصلہ کرنے کا موقع ملتا اور کم از کم قرون اولیٰ کی تاریخ میں کوئی جنگ پیش نہ آتی۔

نبی کریم ﷺ کے ان معاہدات کے ذریعے غیر مسلموں کو اسلام کے عالمگیر نظریات سے روشناس کرانا مقصود ہے تاکہ ناواقفیت کے باعث اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جو غلط فہمیاں اور نفرت پیدا کر دی گئی ہے وہ دور ہو سکیں اور وہ فیصلہ کر سکیں کہ ان کے ہمسائے ان کے لیے کتنے مفید اور کارآمد ہیں اور یہ کہ اسلام ان کے لیے کتنی عظیم رحمت اور ذریعہ فوز و فلاح ہے۔ کیونکہ اسلام کا سب سے بڑا مقصد انسان کو انسان کی غلامی سے نجات دلا کر پوری انسانیت کو ایک ایسی برادری میں تبدیل کرنا ہے جو خداوند کے فرمانبردار، نیکوکار اور اخوت پسندوں پر مشتمل ہو۔[2]

اسلام نے معاہدات کی پابندی کو اخلاقی و قانونی دونوں حیثیتوں سے ضروری قرار دیا ہے۔ معاہدہ خواہ شخصی ہو یا اجتماعی، معاشی ہو یا تجارتی صلح کا ہو یا امن و امان کے قیام یا بقا کا، معاہدہ کرنے کے بعد اس کی پابندی بہر صورت لازمی ہے۔

---

۱ ابن سید الناس، عیون الاثر، دار الجیل بیروت ۱۹۷۴ء، ۱/۱۹۷

۲ ڈاکٹر محمد یونس، رسول اللہ ﷺ کا سفارتی نظام، دار الفرقان راولپنڈی، ۱۹۹۶ء، ص ۲۸۷

معاہدات کی اہمیت از روئے قرآن

ایفائے عہد:

عہد کی پاسداری بنیادی انسانی اخلاقیات میں سے ہے۔ فطری طور پر انسان کا ضمیر قول و قرار کا احترام ضروری سمجھتا ہے۔ قرآن مجید ایفائے عہد کو اللہ کی صفات میں شمار کرتا ہے۔

ایفائے عہد اللہ تعالیٰ کی صفت:

اللہ تعالیٰ نے اپنی نسبت قرآن مجید میں فرمایا:

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُخْلِفُ الْمِیْعَادَ ۱؎

''بلاشبہ خدا وعدہ کے خلاف نہیں کرتا''

وَعْدَ اللّٰہِ لَا یُخْلِفُ اللّٰہُ وَعْدَہٗ ۲؎

''اللہ کا وعدہ ہوا ہے۔ اللہ وعدہ کے خلاف نہیں کرتا۔''

اِنَّکَ لَا تُخْلِفُ الْمِیْعَادَ ۳؎

''اے ہمارے رب! تو وعدہ کے خلاف نہیں کرتا''۔

فَلَنْ یُّخْلِفَ اللّٰہُ عَہْدَہٗ ۴؎

''تو البتہ اللہ اپنے قول و قرار کے خلاف نہ کرے گا۔''

جس طرح سے اللہ اپنے وعدے کا سچا اور اپنے عہد کا پکا ہے، اسی طرح بندوں کی خوبیوں میں سے ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ کسی سے جو وعدہ کریں وہ پورا کریں اور جو قول و قرار کریں، اس کے پابند رہیں۔ کسی مسلمان کو یہ بات زیب نہیں دیتی کہ وہ جو کہے اس کو پورا نہ کرے، اور کسی سے جو قول و قرار کرے اس کا پابند نہ رہے۔ ۵؎

عام طور پر لوگ عہد کے معنی صرف قول و قرار کے سمجھتے ہیں، لیکن اسلام کی نگاہ میں اس کی حقیقت بہت وسیع ہے۔ وہ اخلاق، معاشرت، مذہب اور معاملات میں ان تمام صورتوں پر مشتمل ہے جن کی پابندی انسان پر عقلاً، شرعاً، قانوناً اور اخلاقاً فرض ہے اور اس لحاظ سے یہ مختصر سا لفظ انسان کے بہت سے عقلی، شرعی، قانونی، اخلاقی اور معاشرتی فضائل کا مجموعہ ہے۔ اسی لیے قرآن مجید میں بار بار

۱؎ آل عمران ۳:۹

۲؎ روم ۳۰:۶

۳؎ آل عمران ۳:۱۹۴

۴؎ البقرہ ۲: ۸۰

۵؎ سیرۃ النبی ۲۲۴/۶

اس کا ذکر آیا ہے اور مختلف حیثیتوں سے آیا ہے۔[1]

۱۔ مومنین کی صفت:

قرآن کریم میں مومنین کی نمایاں صفت وعدوں کی پاسداری بیان کی گئی ہے:

وَالْمُوفُونَ بِعَهْدِهِمْ إِذَا عَاهَدُوا ۚ[2]

''اور جب وہ وعدہ کرتے ہیں تو پورا کرتے ہیں۔''

اس آیت میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ایفائے عہد کی عادت دائمی ہونا ہی اصل نیکی ہے۔ اتفاقی طور پر کوئی معاہدہ پورا کر دے تو یہ تو کافر و فاجر بھی کبھی کبھی کرتا ہے۔ اس کا اعتبار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ معاملات میں بھی ایفائے عہد ضروری ہے کیونکہ اگر غور کیا جائے تو تمام معاملات بیع و شراء، اجارہ، شرکت سب ہی کی روح ایفاء معاہدہ ہے۔[3]

بعض آیات میں اس صفت کو کامل الایمان مسلمانوں کے مخصوص اوصاف میں شمار کیا گیا ہے۔

وَالَّذِينَ هُمْ لِأَمَانَاتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُونَ ○[4]

''اور جو اپنی امانتوں اور عہد کا پاس لحوظ رکھتے ہیں۔''

''اس آیت میں ان تمام امانتوں کا تذکرہ ہے جو خداوند عالم نے یا معاشرے نے، یا افراد نے کسی شخص کے سپرد کی ہوں۔ اور عہد و پیمان میں وہ سارے معاہدے داخل ہیں جو انسان اور خدا کے درمیان، یا انسان اور انسان کے درمیان، یا قوم اور قوم کے درمیان استوار کیے گئے ہوں۔ مومن کی صفت یہ ہے کہ وہ کبھی امانت میں خیانت نہ کرے گا اور کبھی اپنے قول و قرار سے نہ پھرے گا۔''[5]

۲۔ معاملاتی حیثیت سے عہد کی پابندی:

معاشرے میں کسی رسم و رواج یا کسی قانون کی بنا پر مقرر ہونے والے پیمانے کی پابندی بھی خرید و فروخت میں لازمی ہوتی ہے۔ یہ بھی درحقیقت معاشرے کے لوگوں کے درمیان ایک معاملاتی معاہدہ ہی ہوتا ہے۔

وَأَوْفُوا بِالْعَهْدِ إِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُولًا ○ وَأَوْفُوا الْكَيْلَ إِذَا كِلْتُمْ وَزِنُوا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيمِ ذَٰلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلًا ○[6]

---

[1] سیرت النبی ۲۲۲/۶

[2] البقرہ ۲:۱۷۷

[3] معارف القرآن، ۱/ ۴۳۶

[4] المومنون ۲۳:۸

[5] تفہیم القرآن، ۳/ ۲۶۷

[6] بنی اسرائیل ۱۷: ۳۴-۳۵

''اور عہد کو پورا کرو کیونکہ (قیامت میں) عہد کی باز پرس ہوگی اور جب ماپ کرو تو پیمانہ کو پورا بھر دیا کرو اور تول کر دینا ہو تو ڈنڈی سیدھی رکھ کر تولا کرو یہ بہتر (طریقہ) اور اس کا انجام بھی اچھا ہے۔''

۳۔ عہد الٰہی کے ایفاء کی تاکید:

عہدوں میں سب سے زیادہ اہمیت کا حامل وہ فطری معاہدہ ہے جو بندوں نے اپنے رب کے ساتھ عالم ارواح میں کیا تھا جسے وعدہ الست بھی کہا جاتا ہے اس کی پاسداری سب سے زیادہ اہمیت کی حامل ہے۔ باقی تمام عہود بھی جو بندوں کی بابت قول و قرار یا حقوق کے حوالے سے ہوتے ہیں ان کو پورا کرنا بھی چونکہ اللہ کے حکم کی تعمیل میں ہوتا ہے اس لیے وہ معاہدے بھی وعدہ الست میں ایک طرح سے شامل ہی ہوتے ہیں۔

الَّذِيْنَ يُوفُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَلَا يَنقُضُوْنَ الْمِيْثَاقَ ○ وَالَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ مَا أَمَرَ اللّٰهُ بِهٖ أَنْ يُوْصَلَ [1]

''جو اللہ کے ساتھ اپنے عہد کو پورا کرتے ہیں اور اپنے اقرار کو نہیں توڑتے اور خدا نے جن تعلقات کے جوڑنے کا حکم دیا ہے ان کو جوڑے رکھتے ہیں۔''

یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے عہد کو پختہ کرنے کے بعد توڑ دیتے ہیں اللہ تعالیٰ کے اس عہد میں وہ بھی داخل ہے جو ازل میں حق ربوبیت اور واحدانیت کے متعلق تمام پیدا ہونے والی روحوں سے لیا گیا تھا۔ جس کو کفار و مشرکین نے دنیا میں توڑ ڈالا اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ سینکڑوں اور ہزاروں معبود بنا بیٹھے۔ اور وہ تمام عہد بھی داخل ہیں جن کی پابندی عہد لا الہ الا اللہ کے ضمن میں انسان پر لازم ہو جاتی ہے۔ کیونکہ کلمہ طیبہ ''لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ'' دراصل ایک عظیم معاہدہ کا عنوان ہے جس کے تحت اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے بتائے ہوئے تمام احکام کی پابندی اور جن چیزوں سے روکا گیا ہے ان سے پرہیز کا عہد بھی آ جاتا ہے، اس لیے جب کوئی انسان کسی حکم خداوندی یا حکم رسول اللہ ﷺ سے انحراف کرتا ہے تو اس عہد ایمانی کی عہد شکنی کرتا ہے۔[2]

سورہ انعام میں ایک اور عہد الٰہی کے ایفاء کی نصیحت کی گئی ہے:

وَبِعَهْدِ اللّٰهِ أَوْفُوْا ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ○ [3]

''اور اللہ کے عہد کو پورا کرو یہ تمہیں وصیت کی جاتی ہے شاید کہ تم نصیحت پاؤ۔''

مولانا مودودی اس آیت کی تفسیر یوں بیان کرتے ہیں:

''اللہ کے عہد'' سے مراد وہ عہد ہے جو انسان اپنے خدا سے کرے، اور وہ بھی جو خدا کا نام لے کر بندوں سے کرے اور وہ بھی جو انسان اور خدا اور انسان اور انسان کے درمیان اسی وقت آپ سے

---

[1] الرعد ۱۳: ۲۰۔۲۱

[2] سیرۃ النبی، ۶/ ۲۲۵

[3] الانعام ۶: ۱۵۲

آپ بندھ جاتا ہے جس وقت ایک شخص خدا کی زمین میں ایک انسانی سوسائٹی کے اندر پیدا ہوتا ہے ......انسان کا خدا سے اور انسان کا سوسائٹی سے یہ عہد کسی کاغذ پر نہیں لکھا گیا مگر اس کے رونگٹے رونگٹے پر ثبت ہے۔ انسان نے اسے شعور و ارادہ کے ساتھ نہیں باندھا مگر اس کا پورا وجود اسی عہد کا رہین منت ہے۔"[1]

امین احسن اصلاحی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"اب یہ جامع بات فرما دی گئی ہے کہ اللہ کے ہر عہد کو پورا کرو اس میں وہ تمام عہد بھی آ گئے ہیں جو اللہ نے بندوں سے لیے ہیں اور وہ عہد بھی آ گئے ہیں جو ہم آپس میں کسی مقصد صالح کے لیے کرتے ہیں۔ ہر عہد کی عند اللہ ذمہ داری ہے اس وجہ سے ہر عہد "عہد اللہ" ہے، اگر وہ خدا کی حدود کے اندر ہے۔"[2]

اس بات کو سورہ بنی اسرائیل میں عام رکھا گیا ہے کہ:

وَأَوْفُوا بِالْعَهْدِ إِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْؤُولاً ○[3]

"اور عہد کو پورا کرو ہر عہد کی بابت پرسش ہو گی۔"

۴۔ باہمی معاہدوں کی حفاظت کا حکم:

سورہ نحل میں اللہ کے عہد کا مقدس نام اس معاہدہ کو بھی دیا گیا ہے، جو خدا کو حاضر و ناظر بنا کر یا خدا کی قسمیں کھا کھا کر بندے آپس میں کرتے ہیں اور ان کی حفاظت کا حکم دیا۔

وَأَوْفُوا بِعَهْدِ اللَّهِ إِذَا عَاهَدتُّمْ وَلَا تَنقُضُوا الْأَيْمَانَ بَعْدَ تَوْكِيدِهَا وَقَدْ جَعَلْتُمُ اللَّهَ عَلَيْكُمْ كَفِيلاً[4]

"اور اللہ کا نام لے کر جب تم آپس میں ایک دوسرے سے اقرار کرو تو اس کو پورا کرو اور قسموں کو پکی کر کے توڑا نہ کرو اور اللہ کو تم نے اپنے اوپر ضامن ٹھہرایا ہے۔"

اس معاہدہ کے عموم میں صحابہ کرام کے وہ عہد بھی داخل ہیں جو اسلام لاتے وقت انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے کیے اور وہ نیک معاہدے بھی اس میں آ جاتے ہیں جو خدا کا واسطہ دے کر اور خدا کی قسمیں کھا کر بھی مسلمان ایک دوسرے سے کرتے ہیں۔[5]

---

[1] تفہیم القرآن، ج ا، ص ۶۰۱

[2] اصلاحی، امین احسن۔ تدبر قرآن، لاہور، فاران فاؤنڈیشن، ۲۰۳/۴

[3] بنی اسرائیل ۳۴:۱۷

[4] نحل ۹۱:۱۶

[5] سیرۃ النبی، ۲۲۶/۲

عہد کی حفاظت کا حکم دیتے ہوئے نہایت احسن انداز میں مثال کے ذریعے نقضِ عہد کرنے والوں کی مذمت کی گئی ہے:

وَلَا تَكُونُوا كَالَّتِي نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِن بَعْدِ قُوَّةٍ أَنكَاثًا تَتَّخِذُونَ أَيْمَانَكُمْ دَخَلًا بَيْنَكُمْ أَن تَكُونَ أُمَّةٌ هِيَ أَرْبَىٰ مِنْ أُمَّةٍ إِنَّمَا يَبْلُوكُمُ اللَّهُ بِهِ وَلَيُبَيِّنَنَّ لَكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مَا كُنتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ ۝[1]

''اور اس عورت کی طرح نہ ہو جاؤ جس نے اپنا سوت مضبوط کاتنے کے بعد ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا کہ تم اپنی قسموں کو آپس کے مکر کا باعث ٹھہراؤ، اس لیے کہ ایک گروہ دوسرے گروہ سے بڑھا چڑھا ہو جائے۔ بے شک اس عہد سے اللہ تمہیں آزما رہا ہے، یقیناً اللہ تعالیٰ تمہارے لیے قیامت کے دن ہر چیز کو کھول کر بیان کر دے گا جس میں تم اختلاف کر رہے تھے۔''

وہ قسمیں اور عہد و پیمان جو آپس کے معاہدے اور وعدے کے طور پر ہوں ان کا پورا کرنا تو بے حد ضروری ہے اور قسمیں رغبت دلانے یا روکنے کے لیے زبان سے نکل جائیں وہ بے شک کفارہ دے کر توڑ سکتی ہیں۔

مکہ میں ایک عورت تھی جس کی عقل میں فتور تھا۔ سوت کاتنے کے بعد اور اس کے ٹھیک ٹھاک اور مضبوط ہو جانے کے بعد بے وجہ توڑ تاڑ کر پھر ٹکڑے ٹکڑے کر دیتی، یہی اس کی مثال ہے جو عہد کو مضبوط کر کے پھر توڑ ڈالے، گویا اللہ تعالیٰ تاکید کرتا ہے کہ اپنی قسموں کو مکر و فریب کا ذریعہ نہ بناؤ کہ اپنے بڑوں کو اپنی قسموں سے اطمینان دلاؤ اور اپنی ایمانداری اور نیک نیتی کا سکہ بٹھا کر پھر غداری اور بے ایمانی کر جاؤ۔ ان کی کثرت دیکھ کر جھوٹے وعدے کر کے صلح کر لو اور پھر موقع پا کر لڑائی شروع کر دو، ایسا نہ کرو۔ پس جب کہ اس حالت میں بھی عہد شکنی حرام کر دی تو اپنی جمعیت اور کثرت کے وقت بطور اولیٰ حرام ہوئی۔[2]

پیر کرم شاہ لکھتے ہیں:

''تم مکارم اخلاق کے داعی بنا کر بھیجے گئے ہو اگر تم نے اپنی اخلاقی پستی کا ثبوت دیا تو لوگ مکارم اخلاق کا درس کس سے جا کر لیں گے۔ سیرت کی پختگی اور اطوار کی پاکیزگی کا نمونہ انہیں کہاں دستیاب ہوگا اور اس عہد شکنی کو اپنی سیاسی فراست وغیرہ کے الفاظ سے تعبیر کر کے اپنے آپ کو دھوکہ نہ دو، اگر تم نے ایسا کیا تو تمہاری مثال اس احمق عورت کی سی ہوگی جو دن کو سوت کاتتی تھی اور رات کو پارہ پارہ کر دیتی تھی۔ گویا وعدوں کی پابندی سے نبھانا ایک بڑی آزمائش ہے۔ ایفائے عہد کا حکم دے کر اللہ تعالیٰ تمہیں آزمانا چاہتا ہے اور دیکھنا چاہتا ہے کہ اسلام قبول کرنے کے بعد اسلام کے تقاضوں کو کس حد تک پورا کرنے کی ہمت اور جرأت کا ثبوت بہم پہنچاتے ہو۔''[3]

---

[1] النحل ۱۶:۹۲

[2] ابن کثیر، ابوالفداء، عماد الدین، حافظ، تفسیر ابن کثیر، مکتبہ قدوسیہ لاہور، ۱۹۹۳ء، ۳/ ۱۳۹-۱۵۰

[3] پیر محمد کرم شاہ، ضیاء القرآن، ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور، ۱۳۹۸ھ، ۲/ ۵۹۷

سورہ مائدہ میں اسی حوالے سے یوں تاکید کی گئی ہے:

لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ [1]

''اللہ تعالیٰ تمہاری لغو قسموں پر تم سے مواخذہ نہیں فرماتا لیکن مواخذہ اس پر فرماتا ہے کہ تم جن قسموں کو مضبوط کر دو۔''

اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ اپنے بندوں کی غیر ارادی قسموں پر تو کوئی مواخذہ نہیں کرے گا۔ لیکن جو قسمیں دل کے عزم و ارادہ سے ظہور میں آئیں گی جن کے ذریعے کوئی عہد و پیمان بندھے گا، جن سے حقوق و فرائض پر کوئی اثر مرتب ہوگا۔ قسم، قول و قرار، شہادت اور عہد و پیمان نہ صرف تمام معاشرتی، اجتماعی اور سیاسی حقوق و فرائض کی اساس ہے بلکہ اس عہد و پیمان کی اساس بھی ہے جو ہم نے اپنے رب کے ساتھ باندھا ہے۔ اس وجہ سے ضروری ہے کہ اگر وہ خلاف شرع نہ ہو تو پوری کرے اس لیے کہ اس قسم کا آدمی نہ معاشرے کی ذمہ داریوں کا اہل ہے نہ میثاق الٰہی کی ذمہ داریوں کا۔'' [2]

۵۔ عقد پورا کرنے کا حکم:

عقد بھی عہد کا مترادف ہے اسے پورا کرنے کے حوالے سے ارشاد ربانی ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ [3]

''اے ایمان والو اپنے عقدوں کو پورا کرو۔''

اوفوا بالعقود میں ''عقد'' کا لفظ عہد و میثاق کے الفاظ کے مقابل میں عام ہے، اس میں قول و قرار، قسم اور کسی معاملے میں گواہی کی ذمہ داری سے لے کر اس عہد و میثاق تک، جو خدا اور اس کے بندوں کے درمیان ہوا ہے، سب اس میں شامل ہیں۔ [4]

''مذکورہ آیت میں ''یا ایہا الذین آمنوا'' سے سورۃ کا آغاز کر کے اس حقیقت کو یاد کرایا گیا ہے کہ ایمان درحقیقت ایک معاہدہ (التزام) ہے کہ میں دل و جان سے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے تمام احکام کو صحیح اور صادق سمجھ کر ان کو واجب التزام اور لازم العمل تسلیم کرتا ہوں۔ پس یہ التزام ایمان کی حقیقت ہے جس میں حق ربوبیت ادا کرنے کا عہد لیا گیا، گویا ان جملہ حقوق ادا کرنے کا ایک ذریعہ عہد اور اقرار ہے پس معلوم ہوگیا کہ ایمان درحقیقت التزام اطاعت کا اجمالی معاہدہ ہے جسے آج کل کی اصطلاح میں حلف وفاداری کہتے ہیں۔'' [5]

---

[1] المائدہ ۵:۸۹

[2] تدبر قرآن، ج ۲، ص ۵۸۹

[3] المائدہ ۵:۱

[4] تدبر قرآن، ۲/ ۴۵۲

[5] کاندھلوی، ادریس، مولانا، معارف القرآن، مکتبہ عثمانیہ، لاہور، ۱۹۸۲ء، ۳/ ۱۲

عہد کو پورا کرنے میں اللہ کے حلال کو حلال جاننا، اس کے حرام کو حرام جاننا، اس کے فرائض کی پابندی کرنا، اس کی حد بندی کرنا، اس کی حد بندی کی نگہداشت کرنا بھی ہے۔ کسی بات کے خلاف نہ کرو، حد نہ توڑو، کسی حرام کام کو نہ کرو، اس پر بہت سختی ہے۔[1]

"زندگی گزارنے کے لیے کچھ ضوابط ناگزیر ہیں تاکہ خاندانی و اجتماعی تعلقات صحیح خطوط پر استوار ہو سکیں، اور انسانوں کے انسانوں سے روابط درست ہو سکیں۔ اور جو اشیاء انسان کے گردو پیش اس کے لیے مسخر کر دی گئی ہیں نیز یہ کہ انسانوں کا اپنے خالق و مولیٰ سے رشتہ صحیح بنیادوں پر استوار ہو۔ اسلام انسانوں کے ان ہمہ پہلو تعلقات و روابط کو درست کرتا ہے اور ان تمام روابط کو اللہ سبحانہ تعالیٰ کی ذات سے وابستہ کر دیتا ہے تاکہ تمام روابط و تعلقات میں احترام کی روح سرایت کر جائے اور انسانی روابط وقتی جذبات اور لمحاتی میلانات کی نظر ہو کر نہ رہ جائیں۔ اور یہ نہ ہو کہ جب انسان کے سامنے مصالح اور مفادات ہوں تو تعلقات بہتر ہو گئے اور جب مفادات ختم ہو گئے تو روابط بھی منقطع ہو گئے۔ اسلام کی رو سے جملہ انسانی روابط اللہ کے استوار کردہ ہیں۔ انسانیت کی ہمہ گیر مصلحت پر حاوی ہیں اور ادب کا شیوہ یہ ہے کہ انسان اللہ کے مقرر کردہ ضوابط کی تسلیم و رضا کے ساتھ پابندی کرے۔ ان تمام ضوابط کا اجمالی نام "عقود" ہے اور اللہ نے ان جملہ عقود کو پورا کرنے کا حکم دیا ہے۔"[2]

۶۔ وفائے عہد پر جزا:

جو اقوام اپنے معاہدات کا احترام کرتی ہیں وہ معاشرے کے لیے اعلیٰ نمونہ ہوتی ہیں۔

قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے:

بَلٰى مَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ وَاتَّقٰى فَاِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ○[3]

"البتہ جو شخص اپنا قرار پورا کرے اور پرہیزگاری کرے تو اللہ تعالیٰ بھی ایسے پرہیزگاروں کو دوست رکھتا ہے۔"

جو شخص اپنے عہد کو پورا کرے اور اہل کتاب ہو کر ڈرتا رہے پھر اپنی کتاب کی ہدایت کے مطابق آنحضرت ﷺ پر ایمان لائے، اس عہد کے مطابق جو تمام انبیاء سے بھی ہو چکا ہے اور جس کی پابندی ان کی امتوں پر بھی لازم ہے، اللہ کی حرام کردہ چیزوں سے اجتناب کرے، اس کی شریعت کی اطاعت کرے۔ رسولوں کے خاتم اور انبیاء کے سردار حضرت محمد ﷺ کی پوری تابعداری کرے وہ متقی ہے اور متقی اللہ کے دوست ہیں۔[4]

---

[1] تفسیر ابن کثیر ۱/۲۰۷

[2] سید قطب شہید، فی ظلال القرآن، اسلامی اکادمی لاہور، ۱۹۸۹ء، ۳۶۶/۳

[3] آل عمران ۳:۷۶

[4] تفسیر ابن کثیر، ۱/۳۳۰

۷۔ بدعہدوں کے لیے وعید:

عہد شکنی کی قرآن وسنت میں بہت سخت وعید آئی ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ يَشْتَرُونَ بِعَهْدِ اللَّهِ وَأَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيلًا أُولَٰئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللَّهُ وَلَا يَنظُرُ إِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا يُزَكِّيهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝[1]

"بے شک جو لوگ اللہ تعالیٰ کے عہد اور اپنی قسموں کو تھوڑی قیمت پر بیچ ڈالتے ہیں ان کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں اللہ تعالیٰ نہ تو ان سے بات چیت کرے گا نہ ان کی طرف قیامت کے دن دیکھے گا، نہ انہیں پاک صاف کرے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔"

آیت مذکورہ میں عہد کی خلاف ورزی کرنے والے پر پانچ وعیدیں مذکور ہیں:

۱۔ ان کے لیے جنت کی نعمتوں سے کوئی حصہ نہیں ملے گا، ایک حدیث میں رسول کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس آدمی نے جھوٹی قسم کے ذریعے کسی مسلمان کا حق دبایا تو اس نے اپنے لیے آگ کو واجب کر دیا۔ راوی نے عرض کیا کہ اگر وہ چیز معمولی سی ہو تب بھی اس کے لیے آگ واجب ہو گی؟ آپ ﷺ نے جواب میں فرمایا، اگرچہ وہ درخت کی سبز ٹہنی ہی کیوں نہ ہو۔

۲۔ اللہ تعالیٰ ان سے خوش کن بات نہیں کریں گے۔

۳۔ اللہ تعالیٰ ان کی طرف قیامت کے دن رحمت کی نظر سے نہیں دیکھیں گے۔

۴۔ اور اللہ تعالیٰ ان کے گناہ کو معاف نہیں کریں گے، کیونکہ عہد کے خلاف کرنے کی وجہ سے عہد کا حق تلف ہوا ہے اور حق العبد کو اللہ تعالیٰ معاف نہیں کریں گے۔

۵۔ اور ان کے لیے دردناک عذاب ہو گا۔[2]

گویا ایسے لوگ جو اپنے معاہدات کی پابندی نہیں کرتے ان کے لیے سخت ترین سزائیں تجویز کی گئی ہیں۔

جو لوگ اللہ کے عہد کو پورا کریں اور حدود الٰہی کی حفاظت کریں تو وہ لوگ متقی ہیں اور اللہ متقیوں کو دوست رکھتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہود کا یہ خیال بالکل غلط ہے کہ ان کے لیے خدا کے ہاں کوئی خاص مرتبہ و مقام ہے۔ جس کے سبب سے وہ دوسروں سے بالاتر اور امیوں کے معاملے میں ذمہ داریوں سے بری ہیں۔ اصل یہ ہے کہ اللہ کے ہاں جو مرتبہ و مقام بھی ہے وہ ان لوگوں کے لیے ہے جو خدا سے باندھے ہوئے عہد کو پورا کریں اور ہر طرح کے حالات میں اس عہد کے تحت قائم کردہ حدود کی نگہداشت کریں۔ جن لوگوں کی روش یہ ہو گی وہ اللہ کے نزدیک متقی ہیں اور اللہ اسے متقی بندوں کو دوست رکھتا ہے جو خدا کے عہد اور اس کے حدود کو توڑنے میں بے باک ہیں اور اس کے باوجود تقویٰ کی اور محبوب الٰہی ہونے کے مدعی ہیں وہ محض خیالی پلاؤ پکار ہے ہیں۔[3]

۱۔ آل عمران ۳:۷۷

۲۔ مفتی محمد شفیع، معارف القرآن، ۲، ۹۳

۳۔ تدبر قرآن، ۲، ۱۲۴

جو لوگ اللہ کے عہد اور اپنے قول و قرار کو اس طرح خرید نی و فروختنی چیز بنائے ہوئے ہیں اور اپنے دنیوی مفادات پر ان کو اس بے دردی سے قربان کر رہے ہیں ان کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں [۱]

۸۔ زمین کی بدترین مخلوق۔ وعدہ خلاف کفار:

ارشاد ربانی ہے:

الَّذِينَ عَاهَدتَّ مِنْهُمْ ثُمَّ يَنقُضُونَ عَهْدَهُمْ [۲]

''جن سے آپ نے عہد و پیان کر لیا ہے پھر وہ اپنے عہد و پیان کو توڑ دیتے ہیں۔''

حافظ عماد الدین ابن کثیر بیان فرماتے ہیں:

''زمین پر جتنے بھی چلتے پھرتے ہیں ان میں سے بدتر اللہ کے نزدیک بے ایمان کافر ہیں جو عہد کر کے توڑ دیتے ہیں۔ ادھر قول و قرار کیا ادھر پھر گئے، ادھر قسمیں کھائیں ادھر توڑ دیں، نہ اللہ کا خوف نہ گناہ کا کھٹکا۔ پس جوان پر لڑائی میں غالب آ جائے تو ایسی سزا دے کہ بعد آنے والوں کو بھی عبرت حاصل ہو، وہ بھی خوف زدہ ہو جائیں، پھر ممکن ہے کہ اپنے ایسے کرتوت سے باز رہیں۔'' [۳]

یہود اور ان کے قبائل سے مدینہ ہجرت فرمانے کے بعد نبی ﷺ نے ناطرفداری کے معاہدے کر لیے تھے مثلاً جہینہ، بنی ضمرہ، بنی مدلج وغیرہ۔ نبی ﷺ نے اپنے کیے ہوئے معاہدے کا برابر احترام باقی رکھا لیکن یہود نے ایک دن بھی اس کا احترام نہ کیا اور قبائل بھی یہود کی انگیخت یا قریش کے دباؤ سے برابر معاہدے کی خفیہ یا اعلانیہ خلاف ورزیاں کرتے رہے۔

ان لوگوں کا یہ حال یہ ہے کہ انہوں نے معاہدہ تو کر لیا تھا لیکن اس کو وفاداری کے ساتھ نبھایا ایک دن بھی نہیں، اور جب بھی موقع امتحان آتا تو مسلمانوں کو نقصان پہنچانے سے باز نہ آتے، ان کی ہمدردیاں برابر قریش کے ساتھ رہیں۔'' [۴]

۹۔ بد عہدوں سے اظہار برأت:

قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے:

إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْخَائِنِينَ [۵]

یہ اظہار برأت کا کلمہ ہے یعنی اللہ کا ایسے بد عہدوں سے کوئی تعلق نہیں ہے اور جب اللہ کا ان سے کوئی تعلق نہیں تو اہل ایمان کوئی تعلق ایسے لوگوں سے کیسے رکھ سکتے ہیں۔ اس میں یہ بھی اشارہ ہے کہ اہل ایمان ان سے نبھائیں تو گویا وہ ان سے نبھائیں گے جن سے خدا کو نفرت ہے۔ [۶]

۱۔ تدبر قرآن، ۲/ ۱۲۷

۲۔ انفال ۸:۵۶

۳۔ تفسیر ابن کثیر، ۲/ ۳۰۷

۴۔ تدبر قرآن، ۳/ ۴۹۸۔۴۹۹

۵۔ انفال ۸:۵۸

۶۔ تدبر قرآن، ۳/ ۴۹۹

اس آیت میں ارشاد ربانی ہے کہ اے نبی اگر کسی سے تمہارا عہد و پیمان ہوا ہو اور تمہیں خوف ہو کہ یہ بدعہدی اور وعدہ خلافی کریں گے تو تمہیں اختیار ہے کہ برابری کی حالت میں عہد نامہ توڑ دو اور انہیں اطلاع کر دو، تا کہ وہ بھی صلح کے خیال میں نہ رہیں، کیونکہ اللہ خیانت کو ناپسند فرماتا ہے۔ گویا کافروں سے بھی تم خیانت نہ کرو۔[1]

۱۰۔ مسلمانوں کو ایفائے عہد کی تاکید:

صلح حدیبیہ کے بعد کفار کی قوت مسلسل کم ہوتی اور اسلام کی قوت بڑھتی گئی۔ اس حالت میں اس معاہدہ کو توڑ دینا کیا مشکل تھا۔ مگر یہی وہ وقت تھا جس میں مسلمانوں کے مذہبی اخلاق کی آزمائش کی جا سکتی تھی کہ اپنی قوت اور دشمنوں کی کمزوری کے باوجود وہ کہاں تک اپنے معاہدہ پر قائم رہتے ہیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے بار بار اس معاہدہ کی استواری اور پابندی کی یاد دلائی اور فرمایا کہ تم اپنی طرف سے کسی حال میں اس معاہدہ کی خلاف ورزی نہ کرو، جن مشرکوں نے اس معاہدہ کو توڑا تھا ان سے لڑنے کی گو اجازت دے دی گئی تھی اور مکہ فتح بھی ہو چکا تھا، پھر بھی یہ حکم ہوا کہ ان کو چار ماہ کی مہلت دو۔

بَرَاءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖۤ اِلَى الَّذِيْنَ عَاهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ○ فَسِيْحُوْا فِى الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّاعْلَمُوْۤا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِى اللّٰهِ[2]

''اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف سے ان مشرکوں کو پورا جواب، جن سے تم نے معاہدہ کیا تھا، تو پھر لواے مشرکو! ملک میں چار مہینے اور یقین مانو کہ تم اللہ کو تھکا نہیں سکتے۔''

جب ان مشرکوں اور مسلمانوں کے درمیان کسی قسم کے معاہدہ کی ذمہ داری نہیں رہی تو ساتھ ہی ان مشرکوں کے ساتھ ایفائے عہد کی تاکید کی گئی جنھوں نے حدیبیہ کے معاہدہ کی حرمت کو قائم رکھا تھا۔ فرمایا:

اِلَّا الَّذِيْنَ عَاهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ شَيْــًٔا وَّلَمْ يُظَاهِرُوْا عَلَيْكُمْ اَحَدًا فَاَتِمُّوْۤا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ○[3]

''مگر جن مشرکوں سے تم نے عہد کیا تھا پھر انہوں نے تم سے کچھ کمی نہیں کی اور نہ تمہارے خلاف کسی کو مدد دی تو ان سے ان کے عہد کو ان کی مقررہ مدت تک پورا کرو بے شک اللہ تقویٰ والوں کو پسند کرتا ہے۔''

۱۱۔ ایفائے عہد کرنے والا ''متقی'':

مشرکوں کے ساتھ ایفائے عہد کو اللہ تعالیٰ نے تقویٰ بتایا ہے اور جو اس عہد کو پورا کریں ان کو متقی فرمایا اور ان سے اپنی محبت اور خوشی کا اظہار فرمایا:

كَيْفَ يَكُوْنُ لِلْمُشْرِكِيْنَ عَهْدٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَعِنْدَ رَسُوْلِهٖۤ اِلَّا الَّذِيْنَ عَاهَدْتُّمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ

---

[1] تفسیر ابن کثیر، ۲/ ۳۰۷

[2] توبہ ۹: ۱۔۲

[3] ایضاً: ۴

الْحَرَامِ فَمَا اسْتَقَامُوا لَكُمْ فَاسْتَقِيمُوا لَهُمْ إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ ۝ ؎۱

''مشرکوں کے لیے اللہ کے پاس اور اس کے رسول ﷺ کے پاس کوئی عہد ہو؟ مگر وہ جن سے تم نے مسجد حرام کے نزدیک معاہدہ کیا جب تک وہ تم سے سیدھے رہیں تم ان سے سیدھے رہو، بے شک اللہ کو تقویٰ والے خوش آتے ہیں۔''

''سیدھے رہنے'' کا مطلب یہ ہے کہ جب تک وہ اپنے عہد پر قائم رہیں تم بھی اس عہد کو پورا کرتے رہو اور جو لوگ اپنے عہد کو اس احتیاط سے پورا کریں ان کا شمار تقویٰ والوں میں ہے۔ ؎۲

اس آیت نے سابقہ حکم کی وضاحت کر دی کہ صرف ان قبائل کے معاہدوں کو منسوخ کیا جا رہا ہے جنہوں نے خود پہلے خلاف ورزی کی اور ان کا احترام کیا لیکن جو اپنے معاہدوں کے پابند ہیں نہ کھلے طور پر اسلام کا مقابلہ کرتے ہیں اور نہ پوشیدہ طور پر مسلمانوں کے دشمنوں کی امداد کرتے ہیں، ان کے ساتھ جو معاہدے ہو چکے ہیں ان کی پابندی لازمی ہے۔ گویا عہد کو پورا کرنا بھی تقویٰ کے لوازمات میں سے ہے اور متقین کا شعار ہے۔ ؎۳

مذکورہ بالا آیت نے اللہ تعالیٰ کے نزدیک معاہدوں کی پابندی کی اہمیت کو بالکل واضح کر دیا ہے۔

وعدہ خلافی:

وعدہ کر کے اس کے خلاف کرنا بہت بڑی برائی ہے اور یہ جھوٹ کی ایک قسم ہے، کسی قوم اور اس کے افراد کی عزت کا دارومدار بہت کچھ اس پر ہے کہ وہ اپنے وعدوں کے کتنے سچے اور اپنی بات کے کیسے پکے ہیں جب کوئی شخص وعدہ کر لیتا ہے تو اپنے اوپر ایک ذمہ داری اوڑھ لیتا ہے۔ فرمایا:

إِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُولًا ۝ ؎۴

''بے شک وعدے کے بارے میں پوچھا جائے گا۔''

اور جس کی باز خدا فرمائے اس کی اہمیت کتنی بڑی ہوگی۔ قرآن پاک میں منافقوں کے سلسلہ میں ان کی بدعہدی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے دل میں نفاق پیدا ہو گیا۔ فرمایا:

فَأَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِي قُلُوبِهِمْ إِلَىٰ يَوْمِ يَلْقَوْنَهُ بِمَا أَخْلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوهُ وَبِمَا كَانُوا يَكْذِبُونَ ۝ ؎۵

''پس اس کا اثر ان کے دل میں خدا نے نفاق رکھا، اس دن تک جب وہ اس سے ملیں گے اس لیے کہ انھوں نے خدا سے وعدہ کر کے خلاف کیا اور اس لیے کہ وہ جھوٹ بولتے تھے۔''

---

۱ توبہ:۷
۲ سیرۃ النبی، ۶/ ۲۲۷
۳ ضیاء القرآن ۲/ ۱۸۰
۴ بنی اسرائیل ۱۷:۳۴
۵ توبہ ۹:۷۷

معاہدات کی اہمیت از روئے حدیث

قرآن کریم کی طرح احادیث نبوی ﷺ میں بھی عہد کی پابندی اور معاہدوں کا احترام جابجا ملتا ہے۔

ایفائے عہد آنحضور ﷺ کی خصوصیت:

حضرت محمد ﷺ کے ایفائے عہد کے تو دشمن بھی معترف تھے۔ دعویٰ نبوت سے پہلے ہی اہل مکہ آپ کو صادق اور امین کا لقب دے چکے تھے۔ آپ ﷺ امانتوں کی حفاظت کے ساتھ ساتھ قول و فعل کے معاہدات کے بھی پاسبان تھے۔ نبوت سے پہلے کا واقعہ ہے کہ عبداللہ بن ابی الحمساء نے آنحضرت ﷺ سے کچھ معاملہ کیا اور آپ کو بٹھا کر چلے گئے کہ آ کر حساب دیتا ہوں۔ اتفاق سے ان کو خیال نہ رہا۔ تین دن کے بعد آئے تو آنحضرت ﷺ اسی جگہ تشریف رکھتے تھے۔ ان کو دیکھ کر فرمایا، میں تین دن سے یہاں تمہارے انتظار میں بیٹھا ہوں۔ جس پر وہ شرمندہ ہوا۔[1]

رسول برحق نے تو غیر ملحوظ سمجھوتوں کا بھی شدید احترام فرمایا۔ واقعہ نخلہ میں مسلمانوں کے ایک گروہ کے سردار واقد بن عبداللہ کے تیر سے عمرو بن الحضرمی مقتول ہوا۔ مغالطہ یہ ہوا کہ مسلمان سمجھے کہ ممنوع القتال مہینہ، ماہ رجب ختم ہو کر شعبان شروع ہو گیا لیکن درحقیقت وہ ماہ حرام کی آخری تاریخ تھی۔ حضور ﷺ نے اس کارروائی کو ناپسند فرمایا اور حرام مہینوں کی تسلیم شدہ حرمت کے تحت مقتول کا خون بہا دشمنوں کو از خود بھجوا دیا۔[2]

ابو رافع ایک غلام تھے، حالت کفر میں قریش کی طرف سے سفیر بن کر مدینہ منورہ آئے۔ روئے اقدس پر نظر پڑی تو بے اختیار اسلام کی صداقت ان کے دل میں جاگزیں ہوگئی۔ عرض کی یا رسول اللہ! اب میں بھی کافروں کے پاس لوٹ کر نہ جاؤں گا۔ ارشاد ہوا نہ میں عہد شکنی کر سکتا ہوں اور نہ قاصدوں کو اپنے پاس روک سکتا ہوں۔ فرمایا کہ تم اس وقت واپس جاؤ، اگر وہاں پہنچ کر بھی تمہارے دل کی یہی کیفیت باقی رہے تو آ جانا۔ چنانچہ وہ اس وقت واپس گئے اور پھر اسلام آئے۔[3]

آپ ﷺ کی اس خصوصیت کا دشمنوں نے بھی اعتراف کیا۔ چنانچہ قیصر روم نے اپنے دربار میں آپ ﷺ کے متعلق ابوسفیان سے جو سوالات کیے، ان میں ایک یہ بھی تھا کہ کیا کبھی محمد (ﷺ) نے بدعہدی بھی کی ہے؟ ابوسفیان کو مجبوراً یہ جواب دینا پڑا ''کہ نہیں''۔[4]

غزوہ بدر میں کافروں کے مقابلے میں مسلمانوں کی تعداد ایک ثلث سے بھی کم تھی۔ ایسے موقع پر آنحضرت ﷺ کی قدرتی خواہش یہ ہونی چاہیے تھی کہ جس قدر آدمی بڑھ سکیں بہتر ہے۔ لیکن آپ اس وقت بھی ہمہ تن وفا تھے۔

---

[1] سنن ابوداؤد، کتاب الادب، باب فی العدۃ، (۴۹۹۶) کتب السنۃ، ۱۵۷۹ھ

[2] نعیم صدیقی، اوفوا بالعقود، ص ۱۱۳

[3] سیرۃ النبی، ۲/ ۳۲۹

[4] الجامع الصحیح للبخاری، کتاب بدء الوحی، باب: بدء الوحی (۸) الکتب الستۃ، ص ۱

حذیفہؓ بن الیمان اور حسیلؓ دو صحابی مکہ سے آ رہے تھے، راہ میں کفار نے ان کو روکا کہ محمد کے پاس جا رہے ہو۔ انھوں نے انکار کیا آخر اس شرط پر ان کو رہائی ملی کہ وہ جنگ میں آپ کا ساتھ نہ دیں گے۔ یہ دونوں صاحب آنحضرت ﷺ کے پاس آئے تو صورت حال عرض کی۔ فرمایا تم دونوں واپس جاؤ ہم ہر حال میں وعدہ وفا کریں گے، ہم کو صرف خدا کی مدد درکار ہے۔[۱]

صلح حدیبیہ میں ایک شرط یہ تھی کہ مکہ سے جو مسلمان ہو کر مدینہ جائے گا وہ اہل مکہ کے مطالبے پر واپس کر دیا جائے گا۔ عین اس وقت جب معاہدہ کی یہ شرطیں زیر تحریر تھیں، ابو جندل پابہ زنجیر اہل مکہ کی قید سے بھاگ کر آئے اور رسول اللہ ﷺ سے فریادی ہوئے۔ تمام مسلمان اس دردانگیز منظر کو دیکھ کر تڑپ اٹھے۔ لیکن آنحضرت ﷺ نے باطمینان تمام ان کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا:

> ''اے ابو جندل، صبر کرو۔ ہم بد عہدی نہیں کر سکتے۔ اللہ تعالیٰ عنقریب تمہارے لیے کوئی راستہ نکالے گا''۔[۲]

سب سے بڑھ کر رسول اللہ ﷺ کا امت پر یہ احسان ہوا کہ آپ ﷺ نے لین دین، بیع وشریٰ، قرض اور ملازمت اور شرکت ومضاربت کے معاہدوں کے لیے خاص خاص قاعدے مقرر فرما دیے۔ اور فریقین کے درمیان حقوق وفرائض کا توازن قائم کر دیا۔[۳]

بد عہدی کی ممانعت کے متعلق احادیث:

بد عہدی بدترین جرم ہے، غدر، نقض عہد اور معاہدین پر دست درازی کرنے کی برائی میں بے شمار احادیث آئی ہیں جن کی بنا پر یہ فعل اسلام میں بدترین گناہ قرار دیا گیا ہے:

> عن عبداللہ بن عمرو قال قال رسول اللہ ﷺ من قتل معاھدا لم یرح رائحۃ الجنۃ و ان ریحھا لتوجد من مسیرۃ اربعین عاما۔[۴]
>
> ''جو کوئی معاہد کو قتل کرے گا اسے جنت کی بُو تک نہ نصیب ہو گی حالانکہ اس کی خوشبو چالیس برس کی مسافت سے بھی محسوس ہوتی ہے۔''
>
> عن عبداللہ بن عمرو قال قال رسول اللہ اربع خصال من کن فیہ کان منافقاً خالصاً من اذا حدث کذب و اذا وعد خلف و اذا عاھد غدر و اذا خاصم فجر۔[۵]
>
> ''عبداللہ بن عمر کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، چار خصلتیں ایسی ہیں کہ جس میں پائی جائیں

---

[۱] سیرۃ النبی، ج۲، ص ۳۲۹

[۲] الجامع الصحیح للبخاری، کتاب الشروط، باب الشروط فی الجہاد والمصالحۃ مع اہل الحرب وکتابۃ الشروط (۲۷۳۱) کتب الستۃ، ص ۲۱۷

[۳] نعیم صدیقی، اوفوا بالعقود، ص ۱۱۴

[۴] ابن ماجہ، کتاب الدیات، باب من قتل معاھدا، (۲۶۸۶) الکتب الستۃ، ص ۲۶۳۸

[۵] الجامع الصحیح للبخاری، کتاب الایمان، باب علامات المنافق (۳۴) الکتب الستۃ، ص ۵

گی وہ خالص منافق ہوگا۔ ایک یہ کہ جب بولے تو جھوٹ بولے، دوسرے یہ کہ جب وعدہ کرے تو اس کی خلاف ورزی کرے، تیسرے یہ کہ جب معاہدہ کرے تو اس کو توڑ دے اور چوتھے یہ کہ جب جھگڑے تو گالیاں دے۔"

لکل غادر لواء یوم القیمة یرفع له بقدر غدره الا و لا غادر اعظم غدرا من امیر عامه[1]

"ہر غدار عہد شکن کی بے ایمانی کا اعلان کرنے کے لیے قیامت کے دن ایک جھنڈا ہوگا جو اس کے غدر کے ہم قدر ہوگا اور یاد رکھو کہ جو سردار قوم غدر کرے گا اس سے بڑا کوئی غدار نہیں۔"

ایک مرتبہ امیر معاویہؓ بلادِ روم پر حملہ کرنے کے لیے جا رہے تھے، حالانکہ ابھی معاہدہ صلح کی مدت ختم نہ ہوئی تھی۔ امیر معاویہؓ کا ارادہ تھا کہ مدت ختم ہوتے ہی حملہ کر دیں مگر ایک صحابی عمرو بن عنبسہؓ نے زمانہ صلح میں جنگ کی تیاری اور سرحدوں کی طرف فوج کی روانگی کو بھی بدعہدی سے تعبیر کیا اور امیر کے پاس دوڑتے ہوئے اور یہ پکارتے ہوئے پہنچے کہ "الله اکبر وفاء ولا غدر" امیر معاویہ نے سبب پوچھا تو کہا میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ:

من کان بینه و بین قوم عهد فلا یشد عقدة ولا یحلها حتی ینقضی امدها او ینبذ الیهم علی سواء.[2]

"جس کا کسی قوم سے معاہدہ ہو اس میں کوئی تغیر و تبدل نہ کرے تاوقتیکہ اس کی مدت گزر نہ جائے یا پھر اگر خیانت کا خوف ہو تو برابری کو ملحوظ رکھ کر اس کو ختم معاہدہ کا نوٹس دے دے۔"

عن علی قال ما کتبنا عن النبی ﷺ الا القرآن ...... فمن اخفر مسلما فعلیه لعنة الله والملائکة والناس اجمعین لا یقبل منه صرف ولا عدل.[3]

"حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ ہم نے حضور اکرم ﷺ سے بس یہی قرآن لکھا جو اس ورق میں ہے یعنی حضور اکرم ﷺ نے فرمایا جو کوئی مسلمان کا کیا ہوا عہد توڑ ڈالے اس پر اللہ اور فرشتوں اور سب لوگوں کی پھٹکار ہے اس کا نفل قبول نہ ہوگا، اور نہ فرض۔"

ابوداؤد کی روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

"خبردار جو بھی کسی معاہدہ کرنے والے پر ظلم کرے گا یا اس کے پورا کرنے میں کوتاہی کرے گا یا اس کی طاقت سے زیادہ اس پر بوجھ ڈالے گا یا اس کی مرضی کے بغیر اس سے کوئی چیز لے گا تو میں قیامت کے دن مظلوم کی طرف سے اس کا مطالبہ کروں گا۔"[4]

---

[1] "مسلم" کتاب الجہاد، باب: تحریم الغدر، (۴۵۳۸) الکتب الستۃ، ص ۹۸۶

[2] سنن ابی داؤد، کتاب الجہاد، باب فی الامام یکون بینہ و بین العدو عہد فیسیر نحوہ، (۲۷۵۹) الکتب الستۃ، ص ۱۴۲۹

[3] الجامع الصحیح للبخاری، کتاب الجزیة و الموادعة، باب: اثم من عاهد ثم غدر، (۳۱۷۹) الکتب الستۃ، ص ۲۵۷

[4] ابوداؤد۔ کتاب الامارة، باب فی تشعیر اهل الذمة اذا اختلفوا بالتجارة، موسوعة الحدیث، ص ۱۴۵۳)

اگر اس حدیث نبوی ﷺ کی روشنی میں موجودہ دور کے معاہدوں پر غور کیا جائے تو نظر آئے گا کہ بڑی طاقتیں جو معاہدہ کمزور طاقتوں سے کرتی ہیں وہ ہمیشہ ان پر اپنے معاہدوں کو جبراً تھوپتی ہیں اور جس جنگی جرم میں وہ برابر کی شریک ہیں، اس کا سارا بوجھ اور تاوان کمزور قوموں پر ڈالتی ہیں۔ پچھلی جنگ عظیم کے موقع پر جرمنی نے فرانس اور پولینڈ وغیرہ کے ساتھ یہی کیا اور جنگ ختم ہونے کے بعد امریکہ اور روس نے جرمنی اور جاپان کے ساتھ یہی کیا۔ جرمنی کو جنگ چھیڑنے کے جرم میں دو حصوں میں بانٹ دیا گیا اور جاپان کو ہمیشہ کے لیے اسلحہ نہ بنانے کا پابند کر دیا گیا۔ لیکن امریکہ نے خود جنگ میں اور جنگ کے بعد ویت نام اور روس و امریکہ دونوں نے کوریا میں لاکھوں آدمیوں کا خون بہایا اور اس میں سینکڑوں آبادیوں کو ملیا میٹ کر دیا تو اس پر کوئی تاوان عائد نہ ہو سکا۔ روس نے مشرقی یورپ کی ریاستوں میں ہزاروں آدمیوں کا خون بہا کر ان کو اپنا غلام بنالیا اور افغانستان میں لاکھوں بے گناہوں کو بمباری کا نشانہ بنایا تو اس پر کوئی جنگی تاوان نہیں لگ سکا، اس لیے کہ یہ فاتح تھے اور وہ مفتوح[1]

---

[1] اسلام کے بین الاقوامی تصورات، ص ۴۷

باب سوم

مکی دور میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے تعلقات / سفارتی مہمات

فصل اول

مکی دور کا پس منظر (تاریخی، معاشی، سیاسی، فکری و مذہبی)

فصل دوم

مکہ میں مسلمانوں کا پر امن رویہ

فصل سوم

کفار مکہ کا طرز عمل اور مزاحمتی تدابیر

فصل اول

مکی دور کا پس منظر

نبی کریم ﷺ کی نبوی زندگی کا آغاز 610ء میں غارِ حرا میں پہلی وحی کے نزول سے ہوا۔ آپ کی زمانہ نبوت کی زندگی کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے، مکی دور اور مدنی دور۔

مکی دور میں آپ کا طریقہ دعوت اور نہ ماننے والوں کے ساتھ تعلقات کا مطالعہ کرنے سے پہلے ہمیں مکہ شہر اور عرب جس میں یہ شہر واقع ہے اس کی تاریخی، معاشی، سیاسی اور مذہبی حالت کا معلوم ہونا بہت ضروری ہے۔ مکہ ناف زمین پر واقع عرب کا ایک انتہائی اہم شہر رہا ہے۔

ذیل میں عرب اور مکہ کا تاریخی، معاشی، سیاسی اور مذہبی پس منظر کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔

تاریخی:

عرب اور اعراب کے معنی فصاحت اور زبان آوری کے ہیں [۱]

اہل عرب چونکہ اپنی زبان دانی کے سامنے تمام دنیا کو ہیچ سمجھتے ہیں اس لیے انہوں نے اپنے آپ کو "عرب" اور دنیا کی دیگر تمام اقوام کو عجم کہہ کر پکارا [۲]

عرب کا حدودِ اربعہ:

عرب ایک جزیرہ نما ہے جو براعظم ایشیا کے جنوب مغرب میں واقع ہے۔ شمال میں شام کی حدود سے اس کی حدیں ملتی ہیں۔ مشرق میں دریائے فرات اور بحر ہند واقع ہے۔ جنوب میں بھی بحر ہند نے اس کو گھیر رکھا ہے اور مغرب میں بحیرہ احمر ہے۔ اس جزیرہ نما کو جبل سراۃ جس کا سلسلہ یمن سے شام تک پھیلا ہوا ہے دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔ (۱) مغربی حصہ (۲) مشرقی حصہ۔

(۱) مغربی حصہ دامن کوہ سے لے کر ساحل بحیرہ احمر تک نشیبی ہے اور اسی لیے یہ علاقہ "غور" (نشیب) یا گرمی زیادہ ہونے کی وجہ سے تھامہ [۳] کہلاتا ہے۔

(۲) مشرقی حصہ ابھرتا ہوا عراق وسماوہ تک پھیل گیا ہے۔ مرتفع ہونے کی وجہ سے اس علاقہ کو نجد کہا جاتا ہے۔ ان دونوں حصوں کے درمیان جو علاقہ واقع ہے وہ حجاز کہلاتا ہے۔ اس لیے کہ یہ دونوں حصوں کے درمیان حد فاصل ہے۔ وہ حصہ جو مشرق میں نجد کو لیتے ہوئے یمامہ، بحرین، عمان کو اپنے اندر شامل کرتا ہے عروض کہلاتا ہے۔ اس لیے کہ یہ یمن اور نجد کے درمیان چوڑائی میں پھیلا ہوا ہے۔ حجاز سے جنوبی جانب جو میدانی علاقہ ہے وہ یمن کہلاتا ہے۔ [۴]

۱۔ آلوسی محمود، بلوغ الارب فی معرفۃ احوال العرب، مصر المطبعہ الرحمانیہ، ۱۹۲۳ء، ۸/۱

۲۔ سید سلیمان ندوی، تاریخ ارض القرآن، معارف پریس اعظم گڑھ، ۱۹۵۵ء، ۵۱/۱

۳۔ حسن احمد زیات، تاریخ الادب العربی، مکتبہ نھضہ مصر، س ن، ص ۶

۴۔ ایضاً

ملک عرب کے تمام باشندے دو طبقوں میں منقسم تھے۔ ایک اہل مدر اور دوسرے اہل وبر۔[1]

اہل مدر: وہ لوگ تھے جو آبادیوں میں رہتے تھے۔ ان کے پاس کھیتی باڑی، نخلستان، میوے، بھیڑ، بکری، اونٹ، تجارت غرضیکہ کسب ومعیشت کے معقول ذرائع تھے اور وہ اپنے دور کے تمدن کی زندگی بسر کرتے تھے۔[2]

اہل وبر: وہ لوگ تھے جو صحراؤں اور ریگستانوں میں بے گھر بار کی زندگی بسر کرتے تھے، ان خانہ بدوش لوگوں کا سہارا اونٹ تھا یہ لوگ پورے سال پانی کے چشموں اور چارہ گھاس کی تلاش میں رہا کرتے تھے۔ گرمی کے ایام صحراؤں اور ریگستانوں میں اچھی طرح بسر کر لیتے تھے۔ مگر جاڑے میں عراق اور شام کی حدود میں چلے جاتے تھے یا دیگر بستوں کے آس پاس جا کر بڑی تنگ دستی اور عسرت کی زندگی بسر کرتے تھے۔[3]

عربی اقوام کے مختلف قبائل اور خاندان:

مؤرخین عربی قبائل کو مندرجہ ذیل تین حصوں میں تقسیم کرتے ہیں:

(۱) بائدہ (۲) عاربہ (۳) مستعربہ

(۱) بائدہ: یہ وہ اقوام ہیں جن کے حالات نامعلوم اور آثار ناپید ہو چکے ہیں۔ تاریخ ان کے بارے میں زیادہ وضاحت نہیں کرتی جس سے نہ تو حقیقت پر روشنی پڑتی ہے اور نہ ہی طرح طرح کے خیالات کی تردید ہوتی ہے۔ ان کے مشہور قبیلے عاد، ثمود، طسم اور جدیس ہیں۔[4]

قرآن کریم ان کے بارے میں یہ بیان کرتا ہے کہ:

فَأَمَّا ثَمُودُ فَأُهْلِكُوا بِالطَّاغِيَةِ ۝ وَأَمَّا عَادٌ فَأُهْلِكُوا بِرِيحٍ صَرْصَرٍ عَاتِيَةٍ ۝[5]

''قوم ثمود سخت کڑک کے ذریعے ہلاک کردی گئی۔ اور قوم عاد تند و تیز باد صرصر کے ذریعہ تباہ ہوگئی۔''

طسم اور جدیس کے متعلق یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ کسی زنانہ افسانوی واقعہ کی بنا پر آپس میں کٹ مرے۔[6]

(۲) عاربہ: یہ وہ یمنی باشندے ہیں جن کا نسب یعرب بن قحطان سے ملتا ہے۔

انہی یمنیوں میں حمیر کے گھرانے ہیں جن میں زید الجمہور، قضاعہ، سکاسک قابل ذکر ہیں نیز قبائل کہلان جن میں ہمدان، طئی، مدحج، کندہ، لخم مشہور ہیں۔ لخم کی اولاد میں منذر اور اس کے بیٹے حیرہ ہیں ازد سے اوس وخزرج مدینہ میں اور قساسنہ

---

[1] صاعد بن احمد بن صاعد الاندلسی، طبقات الامم، مطبع السعادۃ، س ن، ص ۶۵

[2] ایضاً

[3] ایضاً، ص ۶۶

[4] تاریخ الادب العربی، ص ۷

[5] الحاقۃ ۶۹: ۵، ۶

[6] تاریخ الادب العربی، ص ۷

شام میں سکونت پذیر ہوئے۔ یمن میں حمیر کی حکمرانی تھی اور انہی میں سے نواب اور بادشاہ بنتے تھے۔[۱]

(۳) مستعربہ: یہ اسماعیل علیہ السلام کی اولاد ہیں جو تقریباً انیسویں صدی قبل مسیح حجاز آ کر آباد ہوئی اور شاہان جرہم سے دامادی کا رشتہ جوڑ کر وہاں مستقل سکونت اختیار کر لی۔[۲]

یہاں ان کی نسل کثرت سے پھیلی لیکن ان کے حالات اس قدر پردہ اخفا میں ہیں کہ اب تاریخ میں بھی عدنان سے اوپر کوئی صحیح نسب نامہ کا پتہ نہیں چلتا۔ چنانچہ عربی نسل کا صحیح سلسلہ نسب عدنان پر ہی ختم ہو جاتا ہے۔

اس سلسلے کے مشہور قبائل ربیعہ، مضر، انمار اور ایاد ہیں۔ ربیعہ سے عبد القیس اور عبد القیس سے وائل کے دونوں بیٹوں بکر اور تغلب کی نسل چلی۔[۳]

مضر سے قیس عیلان اور یاس بن مضر کے قبائل نے جنم لیا۔ قیس عیلان کے مشہور قبیلے ہوازن اور غطفان ہیں۔ غطفان سے بغیض کے دو بیٹے عبس اور ذبیان کی نسل جاری ہوئی۔ یاس کی اولاد تمیم بن مرہ، ھذیل بن مدرکہ اسد بن خزیمہ اور کنانہ بن خذیمہ کے خاندان ہیں اور کنانہ سے خاندان قریش چلتا ہے۔[۴]

پھر قریش کے متفرق گھرانے جمع، سہم، مخزوم، تیم، عبدالدار اور عبد مناف ہیں، عبد مناف کے چار بیٹے تھے عبد شمس، نوفل، مطلب اور ہاشم۔ ہاشم سے عبدالمطلب پیدا ہوئے اور عبدالمطلب کے دس بچے تھے۔ آنحضرت ﷺ کے والد عبداللہ، ابوطالب اور حضرت عباس انہی کی اولاد ہیں۔[۵]

معاشی:

عرب کے ذرائع معاش میں سب سے اہم ذریعہ تجارت ہی تھا ان کی زمین بنجر اور خشک تھی دیہاتی عرب خانہ بدوشانہ زندگی گزارتے تھے جانوروں کے لیے جہاں پانی اور سبزہ میسر ہوتا نقل مکانی کرتے رہتے تھے البتہ کچھ علاقوں میں زراعت اور باغات بھی تھے۔ شہری باشندوں کے لیے تجارت کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

ڈاکٹر حمید اللہ لکھتے ہیں:

> ''عرب ایک صحرائے اعظم تھا، باہر والے ان لق و دق ملک میں کیا آتے؟ انہی کو حاجت تھی کہ باہر جایا کریں۔ ہندوستان کے برابر بڑے صحرائی براعظم کی پوری داخلی و خارجی تجارت کو قریش ہی نے منظم کیا اور اپنے کو اس کا مرکز و محور بنا دیا تھا۔''[۶]

۱۔ تاریخ الادب العربی، ص ۷

۲۔ ایضاً

۳۔ ایضاً، ص ۸

۴۔ ایضاً

۵۔ ایضاً

۶۔ حمید اللہ، ڈاکٹر۔ رسول اکرم کی سیاسی زندگی، دارالاشاعت کراچی، ۱۳۸۰ھ، ص ۳۶

وادی غیر ذی زرع کے باشندوں کے لیے تجارت کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ ان کے پاس صنعت و حرفت کے لیے خام مواد بھی نہ تھا۔ اس طرح یکسو ہو کر انہوں نے اپنی قابلیتوں کو تجارت پر مرکوز کر دیا تو نتائج اس زمانے کا خیال کرتے ہوئے حیرت ناک معلوم ہوتے ہیں۔

قریش اور قحطانی قبیلے کے لوگ شہری زندگی گزارنے والے تھے۔ قحطانی زیادہ تر خانہ جنگیوں میں مصروف رہتے تھے جس کی وجہ سے ان کا کوئی تمدن نہ بن سکا۔ ان کی زندگی شورش اور ہنگامہ کی نظر ہی رہی البتہ قریش نے تجارت میں خوب ترقی کر لی تھی۔ اس سلسلے میں انہیں کعبہ کی تولیت کا فائدہ بھی حاصل تھا۔

حسن احمد زیات رقمطراز ہیں:

> ''قریش کو خانہ کعبہ کی تولیت کا شرف حاصل تھا۔ اس وجہ سے یمن اور شام کے تجارتی سفروں میں ان سے کوئی تعرض نہیں کرتا تھا۔ البتہ قحطانی خانہ جنگیوں میں مصروف رہتے تھے۔ آپس میں دشمنی، مسلسل جنگ، ہمیشہ کی شورش و ہنگامہ ان کی زندگی کا لائحہ عمل بنے ہوئے تھے۔ ان کا اپنا کوئی تمدن نہ تھا نہ سیاسی حکومت تھی نہ فوجی نظام۔''[1]

عرب کے لوگ اس حقیقت کو جان چکے تھے کہ غیر ممالک کے لوگوں سے میل جول پیدا کر کے تجارت کو فروغ دینا ان کے لیے اپنی زندگی بہتر بنانے کے لیے نہایت ضروری ہے۔ یمن اور عدن مشرقی دنیا کے تجارتی مال کی قدیم منڈی تھے جہاں سے دوسرے ممالک میں عرب تاجروں کے ذریعہ مال جایا کرتا تھا۔ مگر بعد میں ایرانیوں اور رومیوں کے عمل دخل کی وجہ سے یہاں کی تجارت پر زوال آ گیا۔ بحر احمر پر رومیوں کے غلبہ کے بعد جب یمنیوں کی تجارت کمزور پڑنے لگی تو اہل یمن نے بحری راستہ کی بجائے اندرون عرب کے بری راستوں سے غیر ملکوں کا تجارتی سفر شروع کیا۔ یہ راستہ حضرموت سے شروع ہوتا تھا اور بحر احمر کے اوپر صحرائے نجد سے بچتا ہوا مکہ مکرمہ تک جاتا تھا۔ جس کی وجہ سے مصر و شام اور یمن کے درمیان مکہ بہت بڑی منڈی بن گیا۔ اور حجازیوں میں تجارت خوب چلی۔ خاص طور سے قریش نے جنوب میں یمن کا اور شمال میں شام کا تجارتی سفر شروع کیا۔ قرآن مجید میں رِحْلَةَ الشِّتَاءِ وَالصَّيْفِ[2] میں انہیں تجارتی اسفار کو بیان کیا ہے۔

اطراف عرب سے لوگ حجاز کے تجارتی اور مرکزی شہر مکہ میں آتے اور ہر قسم کے ملکی اور غیر ملکی سامان آسانی سے حاصل کرتے۔ مکہ کا سب سے بڑا سالانہ بازار عکاظ میں ہوتا تھا جو طائف کے راستہ میں ایام حج کے قریب لگتا تھا۔[3] ایام حج میں اس کے قریب ذوالمجاز کا بازار لگتا تھا اور مکہ سے بڑے بڑے تجارتی قافلے باہر جاتے تھے۔ ان قافلوں کی وسعت کے حوالے سے طبری لکھتے ہیں:

---

[1] تاریخ ادب العربی، ص ۸

[2] القریش ۱۰۶:۲

[3] المرزوقی کتاب الازمنة والامکنة، حیدرآباد، مطبعہ مجلس دائرۃ المعارف، ۱۳۳۲ھ، جلد ۲، ص ۱۶۵

''بعض اوقات ان قافلوں میں ۲۵۰۰ بار بردار اونٹ ہوا کرتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ بھی بعض اوقات ان تجارتی قافلوں میں نکلتے تھے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے پہلی مرتبہ بارہ سال کی عمر میں اور دوسری مرتبہ ۲۵ سال کی عمر میں ملک شام کا تجارتی سفر فرمایا۔''[1]

تجارت کو بہتر بنانے کے لیے ضروری ہے کہ ملک میں امن وامان ہو اور دوسرے ممالک میں بھی تحفظ حاصل ہو۔ اس سلسلے میں عبد مناف کی اولاد کی مساعی قابل داد ہے۔ ڈاکٹر عمر فروخ لکھتے ہیں:

''عبد مناف کی اولاد نے اپنے عنفوان شباب ہی میں محسوس کر لیا کہ مکہ مکرمہ تجارتی قافلوں کا ہیڈ کوارٹر ہے اور مختلف علاقوں کے مابین معاش کی تلاش اور تجارت کی غرض سے جانے کے لیے یہی ایک راستہ ہے۔ اور تجارت کا معاملہ داخلی امن کا محتاج ہوتا ہے اور ہمسایہ ملکوں کے ساتھ میل جول رکھنے کے لیے امن وحفاظت کی بہت ضرورت ہوتی ہے۔ اس وجہ سے انہوں نے اپنے لوگوں کے لیے چوکی پہروں کا انتظام کیا اور دیگر حکومتوں سے عہد و پیمان لیا تاکہ انہیں مضبوط و طاقتور ممالک میں قافلوں کو تجارت کی غرض سے لے جانے کا حق حاصل ہو جائے۔''[2]

''عبد مناف کے چار بیٹے ہاشم، عبد شمس، نوفل اور مطلب اپنے باپ کے بعد قوم کے سردار بنے تو ان چاروں نے اپنے ملک اور قوم کے لیے بیرونی ممالک سے خصوصی مراعات حاصل کیں۔''[3]

رسول اللہ ﷺ کے پردادا ہاشم چونکہ غریب پرور اور سیر چشم تھے اس لیے ان کو عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ یعقوبی نے لکھا ہے کہ:

''چونکہ قریش تنگی کی حالت میں تھے اور ان کا کاروبار مکے سے آگے نہ بڑھتا تھا اس لیے ہاشم نے شام کا سفر کیا وہاں ان کی سیر چشمی وغیرہ کی خبر قیصر تک پہنچی تو انہیں باریابی کا موقعہ دیا گیا اور اجازت دی کہ حجازی چمڑا اور کپڑے وہاں لا کر فروخت کیا کریں۔''[4]

ابن سعد نے اس پر مزید لکھا ہے کہ:

''قیصر روم نے ہاشم کو نجاشی کے نام سفارتی خط دیا تھا اسے دیکھ کر نجاشی نے ان لوگوں کو اپنے علاقے میں تجارت کے لیے آمد ورفت کا عام پروانہ عطا کیا۔''[5]

---

[1] ابن سید الناس، عیون الاثر، القاہرہ، مکتبۃ القدسی ۱۳۵۰ھ، ص ۳۰

[2] عمر فروخ الدکتور، تاریخ الجاھلیہ، بیروت، دار المسلم ۱۳۸۲ھ، ص ۱۱۳۔۱۱۴

[3] الطبری محمد ابن جریر۔ تاریخ الامم والملوک، القاہرہ، مکتبۃ الحسینیہ المصریہ، ۱۳۳۲ھ، ۲/ ۱۸۰

[4] احمد بن ابی یعقوب، تاریخ یعقوبی، بیروت، مطبع دار البیروت، ۱۹۶۰، ۱/ ۲۰۱

[5] طبقات ابن سعد، ۱/ ۷۸

اب تجارت کے فروغ کے لیے امن وامان کے حوالے سے صرف درمیانی قبائل سے خطرہ تھا چنانچہ واپسی پر ہاشم نے ان قبائل کے ساتھ بھی پرامن گزرنے کے لیے معاہدے کیے۔ یعقوبی بھی ان معاہدوں کی تصدیق کرتا ہے:

"واپسی میں ہاشم نے درمیانی قبائل سے پرامن گزرنے کے لیے معاہدے کیے۔"[۱]

تجارت کے کاروبار کے لیے ہاشم کی کوششیں قابل داد ہیں۔ "ہاشم نے راستے کے عرب قبائل سے یہ معاہدہ بھی کیا تھا کہ کاروانوں کو پرامن گزرنے دیا جائے تو اس کے بدلے میں قریش ان کا سامان بغیر کرائے کے تجارت کے لیے لے جایا کریں گے۔"[۲]

ہاشم کی مذکورہ کوششوں کے نتیجہ میں عربوں کے تجارتی قوافل کا شام اور حبشہ میں آنا جانا لگا رہتا تھا۔ چنانچہ جب رسول اللہ ﷺ نے دعوتی اور تبلیغی خطوط شاہان عالم کے نام روانہ کیے تو ان میں ایک خط قیصر روم کے نام بھی تھا۔ جب مسلمان سفیر خط لے کر بیت المقدس پہنچا تو وہاں قریش کے سوداگر موجود تھے۔[۳]

عرب میں تجارت کا مرکزی شہر مکہ تھا جہاں اطراف عالم سے لوگ حج کے لیے آتے تھے اور ساتھ ساتھ تجارت کا بازار بھی خوب گرم ہوتا تھا۔ عرب کا شمال، جنوب، مشرق ومغرب اور وسط ہر حصہ قریشی ایلاف کی زنجیروں سے جکڑا ہوا تھا ان کے میلے اور ان کے کارواں معاشی حالت کو سدھارنے میں جتنے مفید ہوتے ان کا ذکر قرآن مجید نے دو معجزہ نما لفظوں میں یوں یاد دلایا ہے:

أَطْعَمَهُم مِّن جُوعٍ وَآمَنَهُم مِّنْ خَوْفٍ ۝[۴]

الغرض وادی غیر ذی زرع کی حالت دعویٰ نبوت سے قبل معاشی طور پر کافی بہتر ہو چکی تھی جس میں مرکزی کردار قریش کی تجارت اور اس کے لیے ہونے والے معاہدے تھے۔ نیز کعبہ کی جو عام عظمت اہل عرب کے دل میں تھی اس کی بنا پر قریش "جیران اللہ" (خدا کے پڑوسی) سمجھے جاتے تھے۔ لوگ ان کا خیال رکھتے تھے اور انہیں خصوصی اہمیت دیتے تھے۔

سیاسی:

مکہ میں آبادی کا آغاز حضرت اسماعیل علیہ السلام سے ہوا آپ نے ۱۳۷ سال کی عمر پائی۔[۵]

حضرت اسماعیل علیہ السلام تا حیات مکہ کے سربراہ اور بیت اللہ کے متولی رہے۔[۶] آپ کے بعد آپ کے دو صاحبزادگان نابت پھر قیدار یکے بعد دیگرے مکہ کے والی ہوئے۔ ان کے بعد ان کا نانا مضاض بن عمرو جرہمی نے زمام کار اپنے ہاتھ میں لے لی اور اس طرح مکہ کی سربراہی بنو جرہم کی طرف منتقل ہو گئی اور ایک عرصے تک انہیں کے ہاتھ میں رہی۔

۱۔ تاریخ یعقوبی، ۱/ ۲۰۱

۲۔ طبقات ابن سعد، ۱/ ۷۸

۳۔ الجامع الصحیح البخاری، ۱/۳۰، ۴

۴۔ القریش ۱۰۶: ۴

۴۔ کتاب مقدس، پیدائش، ص ۲۵۰

۵۔ قواد وحزہ، قلب جزیرۃ العرب، المطبعۃ السلفیہ مصر، ۱۳۵۲ھ، ص ۲۳۰، ۲۳۷

حضرت اسماعیل علیہ السلام چونکہ بیت اللہ کے (اپنے والد کے ساتھ مل کر) معمار اور بانی تھے اس لیے ان کی اولاد کو ایک باوقار مقام ضرور حاصل رہا، لیکن اقتدار و اختیار میں ان کا کوئی حصہ نہ تھا۔[۱]

ایک عرصہ تک حضرت اسماعیل کی اولاد گوشہ گمنامی میں چلی گئی۔ اس گمنامی سے اس کا اخراج بخت نصر کے دور میں ہوا۔ جب بنو جرہم کی طاقت کمزور پڑ گئی تھی اور مکہ میں عدنان کا سیاسی ستارہ جگمگانے لگا تھا۔ بخت نصر نے ذات عرق میں عربوں سے جو معرکہ آرائی کی تھی اس میں عرب فوج کا کمانڈر جرہمی نہ تھا۔[۲]

بخت نصر نے جب ۵۸۷ ق م میں دوسرا حملہ کیا تو بنو عدنان بھاگ کر یمن چلے گئے۔ اس وقت بنو اسرائیل کے نبی حضرت یرمیاہ تھے وہ عدنان کے بیٹے معد کو اپنے ساتھ ملک شام لے گئے اور جب بخت نصر کا زور ختم ہوا اور معد مکہ آئے تو انہیں مکہ میں قبیلہ جرہم کا صرف ایک شخص جرشم بن جلہمہ ملا۔ معد نے اس کی لڑکی معانہ سے شادی کی اور اسی کے بطن سے نزار پیدا ہوا۔[۳]

اس کے بعد بنو جرہم تنگ دستی کا شکار ہوئے انہوں نے زائرین پر زیادتیاں اور خانہ کعبہ کا مال ناحق کھانا شروع کر دیا۔ بنو عدنان ان کی ان حرکتوں پر کڑھتے رہے اور ان سے نفرت کرنے لگے تو بنو خزاعہ نے اس موقعہ سے فائدہ اٹھایا۔ بنو خزاعہ نے ایک عدنانی قبیلے (بنو بکر بن عبد مناف بن کنانہ) کو ساتھ لے کر بنو جرہم کے خلاف جنگ چھیڑ دی اور انہیں مکہ سے نکال کر اقتدار پر خود قبضہ کر لیا۔ یہ واقعہ دوسری صدی عیسوی کے وسط کا ہے۔[۴]

بنو جرہم نے مکہ چھوڑتے وقت زمزم کا کنواں پاٹ دیا اور کوئی تاریخی چیزیں دفن کر کے ان کے نشانات بھی مٹا دیے۔[۵]

بنو خزاعہ نے مکہ پر قبضہ کرنے کے بعد بنو بکر کو شامل کیے بغیر تنہا اپنی حکومت قائم کی۔ البتہ تین اہم اور امتیازی مناصب ایسے تھے جو مضری قبائل کے حصے میں آئے۔

۱۔ حاجیوں کو عرفات سے مزدلفہ لے جانا اور یوم النفر ۱۳ ذی الحجہ کو جو کہ حج کے سلسلہ کا آخری دن ہے، منیٰ سے روانگی کا پروانہ دینا۔ یہ اعزاز الیاس بن مضر کے خاندان بنو غوث بن مرہ کو حاصل تھا۔ جو صوفہ کہلاتے تھے۔

۲۔ ۱۰ ذی الحجہ کی صبح کو مزدلفہ سے منیٰ کی جانب افاضہ (روانگی) یہ اعزاز بنو عدوان کو حاصل تھا۔

۳۔ حرام مہینوں کو آگے پیچھے کرنا۔ یہ اعزاز بنو کنانہ کی ایک شاخ بنو تمیم بن عدی کو حاصل تھا۔[۶]

مکہ پر بنو خزاعہ کا اقتدار کوئی تین سو برس تک رہا۔[۷] یہی زمانہ تھا جب عدنانی قبائل مکہ اور حجاز سے نکل کر نجد، اطراف

۱۔ قلب جزیرۃ العرب، ص ۲۳۷

۲۔ ایضاً، ص ۲۳۰

۳۔ رحمۃ للعالمین، ۲/ ۴۸

۴۔ الرحیق المختوم، ص ۲۰

۵۔ ایضاً

۶۔ ابن ہشام ۱/ ۴۴، ۱۱۹۔ ۱۲۲

۷۔ الحموی، یاقوت بن عبداللہ، معجم البلدان، مطبعہ السعادہ، مصر، ۱۹۰۶ء، مادہ مکہ

عراق اور بحرین وغیرہ میں پھیلے اور مکہ کے اطراف میں صرف قریش کی چند شاخیں باقی رہیں جو خانہ بدوش تھیں۔ ان کی الگ الگ ٹولیاں تھیں اور بنو کنانہ میں ان کے چند متفرق گھرانے تھے۔ مگر مکہ کی حکومت اور بیت اللہ کی تولیت میں ان کا کوئی حصہ نہ تھا۔ یہاں تک کہ قصی بن کلاب کا ظہور ہوا۔[1]

قصی ابھی گود ہی میں تھا کہ اس کے والد کا انتقال ہو گیا۔ اس کی والدہ نے بنو عذرہ کے ایک شخص ربیعہ بن حرام سے شادی کر لی جو ملک شام کے اطراف میں رہتا تھا اس لیے قصی کی والدہ اسے ساتھ لے کر شام چلی گئی۔ قصی جوان ہو کر واپس مکہ لوٹا تو اس نے مکہ کے والی خلیل بن حبشیہ خزاعی کی بیٹی سے شادی کی۔[2]

خلیل کے انتقال پر خزاعہ اور قریش کے درمیان تولیت کعبہ کے حوالے سے جنگ ہوگئی اور اس کے نتیجے میں مکہ اور بیت اللہ پر قصی کا اقتدار قائم ہو گیا۔ "جب قصی بیت اللہ کا دینی سربراہ بنا تو اس کی زیارت کے لیے عرب کے گوشے گوشے سے آنے والوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ مکہ پر قصی کے تسلط کا یہ واقعہ پانچویں صدی عیسوی کے وسط یعنی ۴۴۰ء کا ہے۔"[3]

قصی نے مکہ کا بندوبست بڑے احسن طریقے سے کیا اس نے اطراف مکہ سے تمام قریش کو بلا کر پورا شہر ذمہ داریوں کے لحاظ سے ان پر تقسیم کر دیا۔ ابن ہشام لکھتے ہیں:

> "قصی نے مکہ کا بندوبست اس طرح کیا کہ قریش کو اطراف مکہ سے بلا کر پورا شہر ان پر تقسیم کر دیا اور ہر خاندان کی بود و باش کا ٹھکانہ مقرر کر دیا، البتہ مہینے آگے پیچھے کرنے والوں کو، نیز آل صفوان، بنو عدوان اور بنو مرہ بن عوف کو ان کے مناصب پر برقرار رکھا کیونکہ قصی سمجھتا تھا کہ یہ بھی دین ہے جس میں رد و بدل کرنا درست نہیں۔"[4]

قصی سے قبل اہم قومی امور کی انجام دہی اور مشاورت کے لیے کوئی باقاعدہ عمارت نہ تھی۔ قصی نے یہ کارنامہ انجام دیا۔

> "اس نے حرم کعبہ کے شمال میں دار الندوہ تعمیر کیا۔ دار الندوہ درحقیقت قریش کی پارلیمنٹ تھی جہاں تمام بڑے بڑے اور اہم معاملات کے فیصلے ہوتے تھے۔ قریش پر دار الندوہ کے بڑے احسانات ہیں کیونکہ یہ ان کی وحدت کا ضامن تھا اور یہیں ان کے الجھے ہوئے مسائل بحسن و خوبی طے ہوتے تھے۔"[5]

مکہ ایک خود مختار شہری مملکت تھا۔ بستی کا رقبہ تو چند مربع میل سے زائد نہیں لیکن اس کے اطراف کا وہ حصہ جہاں تک اس کا موثر تسلط تھا اور جسے وہ حرم کہتے تھے تقریباً سوا سو مربع میل پر مشتمل تھا۔ یہاں مختلف زمانوں میں مختلف قبائل کی حکمرانی رہی۔

---

[1] ابن ہشام ۱/۱۱۷

[2] ابن ہشام ۱/۱۱۸، ۱۱۷

[3] قلب جزیرۃ العرب ص ۲۳۲

[4] ابن ہشام ۱/۱۲۴، ۱۲۵

[5] ابن ہشام ۱/۱۲۵

سرورِ کائنات کی ولادت کے وقت یہاں آپ ہی کے خاندان قریش کو سرکردگی حاصل تھی اگر دیگر لوگ بھی بستے تھے لیکن فردی حکومت کا وجود نہ تھا۔ آنحضرتؐ کے پرداداکے پردادا قصی نے تقریباً بادشاہ کی سی حیثیت حاصل کر لی تھی۔[1]

تمام اہم عہدے اور اختیارات قصی کے پاس تھے مثلاً دار الندوہ کی صدارت، لواء، حجابت، سقایہ اور رفادہ۔

قصی کا بڑا بیٹا عبدالدار تھا اور دوسرا بیٹا عبد مناف تھا۔ عبد مناف قصی کی زندگی میں ہی شرف و سیادت کے مقام کو پہنچ گیا تھا۔ قصی نے عبدالدار کو عبد مناف کے ہم پلہ کرنے کے لیے اپنے تمام عہدوں کے لیے اس کے بارے میں وصیت کر دی تھی جسے اس کے جانشینوں نے قبول کر لیا تھا۔ اس طرح یہ عہدے قصی کے بعد عبدالدار کے حصے میں آئے۔

دار الندوہ کی ریاست، خانہ کعبہ کی حجابت، لواء، سقایت اور رفادہ سب کچھ عبدالدار کو دے دیا، چونکہ کسی کام میں قصی کی مخالفت نہیں کی جاتی تھی اور نہ اس کی کوئی بات مسترد کی جاتی تھی، بلکہ اس کا ہر اقدام اس کی زندگی میں بھی اور اس کی موت کے بعد بھی واجب الاتباع دین سمجھا جاتا تھا۔ اس لیے اس کی وفات کے بعد اس کے بیٹوں نے کسی نزاع کے بغیر اس کی وصیت قائم رکھی لیکن جب عبد مناف کی وفات ہو گئی تو اس کے بیٹوں نے ان مناصب کے سلسلے میں اپنے چچیرے بھائیوں یعنی عبدالدار کی اولاد سے تنافس کیا۔ اس کے نتیجے میں قریش دو گروہوں میں بٹ گئے اور قریب تھا کہ دونوں میں جنگ ہو جاتی مگر پھر انہوں نے صلح کی آواز بلند کی اور ان مناصب کو باہم تقسیم کر لیا۔ چنانچہ سقایت اور رفادہ کے مناصب بنو عبد مناف کو دیے گئے اور دار الندوہ کی سربراہی لواء اور حجابت بنو عبدالدار کے ہاتھ میں رہی۔ پھر بنو عبد مناف نے اپنے حاصل شدہ مناصب کے لیے قرعہ ڈالا تو قرعہ ہاشم بن عبد مناف کے نام نکلا۔ لہٰذا ہاشم ہی نے اپنی زندگی بھر سقایہ و رفادہ کا انتظام کیا۔ جب ہاشم کا انتقال ہو گیا تو ان کے بھائی مطلب نے ان کی جانشینی کی، مطلب کے بعد ان کے بھتیجے عبدالمطلب بن ہاشم نے جو رسول اللہ ﷺ کے دادا تھے یہ منصب سنبھال لیا اور ان کے بعد ان کی اولاد ان کی جانشین ہوئی یہاں تک کہ جب اسلام کا دور آیا تو حضرت عباس بن عبدالمطلب اس منصب پر فائز تھے۔[2]

قصی کے اعزازات اور عہدوں کے علاوہ کچھ اور مناصب بھی جنہیں قریش نے باہم تقسیم کر رکھا تھا ان مناصب کا خاکہ حسب ذیل ہے:

۱۔ الیسار یعنی فال گیری یہ منصب بنو جمح کو حاصل تھا۔

۲۔ مالیات کا نظم۔ یعنی بتوں کے تقرب کے لیے جو نذرانے اور قربانیاں پیش کی جاتی تھیں ان کا انتظام کرنا نیز جھگڑے اور مقدمات کا فیصلہ کرنا یہ کام بنو سہم کو سونپا گیا۔

۳۔ شوریٰ۔ یہ اعزاز بنو اسد کو حاصل تھا۔

۴۔ اشناق۔ یعنی دیت اور جرمانوں کا نظم اس منصب پر بنو تیم فائز تھے۔

۵۔ عقاب۔ یعنی قومی پرچم کی علمبرداری۔ یہ بنو امیہ کا کام تھا۔

---

[1] رسول اکرم کی سیاسی زندگی، ص ۳۳

[2] ابن ہشام ج ۱، ص ۱۲۹۔۱۳۲، ۱۳۷، ۱۴۲، ۱۷۸، ۱۷۹

۶۔ قبہ۔ یعنی فوجی کیمپ کا انتظام اور شہسواروں کی قیادت۔ یہ بنومخزوم کے حصے میں آیا تھا۔

۷۔ سفارت۔ بنوعدی کا منصب تھا[1]

قریش کے اس سیاسی مناصب کی تقسیم اور تفویض کے علاوہ ایک رضاکارانہ نظام مختلف معاہدات اور پناہ کی صورت میں بھی وہاں موجود تھا جس کی وجہ سے بسا اوقات کمزور ضعیف اور مسافروں کو اپنا حق مل جاتا تھا۔ ایسا ہی ایک معاہدہ حلف الفضول ہے جس میں دعویٰ نبوت سے قبل آپ ﷺ کا شامل ہونا اور اسے بہت پسند کرنا ثابت ہے۔ حلف الفضول کا متن یہ تھا۔ حلف الفضول کے شرکاء نے جو حلف لیا وہ یہ تھا:

> لیکونن یدا واحدۃ مع المظلوم علی الظالم حتی یؤدی الیہ حقہ، ما بل بحر صوفۃ وما رسی حراء و ثبیر مکانھما و علی التاسی فی المعاش[2]
>
> ''ہم سب مل کر مظلوم کے ساتھ ایک ہاتھ بن جائیں گے۔ جب تک کہ ظالم اسے اس کا حق ادا نہیں کر دیتا اور ہمارا یہ معاہدہ اس وقت تک برقرار رہے گا جب تک سمندر گھونگوں کو بھگوتا رہے جب تک حرا اور ثبیر نامی پہاڑ اپنی جگہ پر قائم ہیں نیز ہماری معیشت میں مساوات رہے گی۔

حجاز کے علاوہ جزیرۃ العرب کے تینوں سرحدی علاقے جو غیر ممالک کے پڑوس میں تھے ان کی سیاسی حالت سخت اضطراب وانتشار اور انتہائی زوال وانحطاط کا شکار تھی۔

مذہبی:

عرب کے لوگ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی تبلیغی مساعی کے نتیجے میں دین ابراہیمی کے پیروکار تھے۔ وہ ایک عرصے تک اللہ کی عبادت اور توحید پر کاربند رہے۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان میں شرک اور بت پرستی داخل ہوگئی۔ البتہ پھر بھی دین ابراہیمی اور شعائر ابراہیمی کے کچھ آثار ان میں باقی رہے اور ملت ابراہیمی کا دعویٰ بھی یہ لوگ کرتے تھے جو بت پرستی اور شرک کی موجودگی میں بے معنی ہوگیا تھا۔

عرب میں بت پرستی کو متعارف کرانے والا شخص بنوخزاعہ کا سردار عمرو بن لحی تھا۔

علامہ شبلی لکھتے ہیں عرب میں بت پرستی کا بانی ایک شخص عمرو بن لحی تھا اس کا اصل نام ربیعہ بن حارثہ تھا عرب کا مشہور قبیلہ خزاعہ اسی کی نسل سے ہے[3]

عرب میں جب مکہ کے متولیوں نے باقاعدہ بت ہبل خانہ کعبہ میں رکھ دیا تو پھر سارے عرب میں بت پرستی ایک پسندیدہ عمل کی حیثیت اختیار کر گئی اور لات، منات، اور عزیٰ کی تنصیب عمل میں آئی۔ اور پھر ایک وقت ایسا آیا کہ خانہ کعبہ میں 360 بت موجود تھے۔

---

[1] سلیمان ندوی، سید، تاریخ ارض القرآن، معارف پریس اعظم گڑھ، ۱۹۵۵ء، ج ۲ ۱۰۳تا۱۰۶

[2] تاریخ الکامل ۲/ ۱۳۱

[3] سیرت النبی ۱/ ۹۷

صفا مروہ پر نیز خود کعبے کی کوٹھڑی کے اندر علاوہ دیگر تصاویر و اصنام کے حضرت ابراہیم بی بی مریم کی تصویریں بھی تھیں [۱]

مشرکین بتوں کے حوالے سے درج ذیل خاص عقائد اور تصورات رکھتے تھے:

وہ بتوں کے سامنے مجاور بن کر بیٹھتے تھے۔ ان کی پناہ ڈھونڈتے تھے۔ انہیں زور زور سے پکارتے تھے۔ حاجت روی و مشکل کشائی کے لیے ان سے فریاد اور التجائیں کرتے اور سمجھتے تھے کہ وہ اللہ سے سفارش کر کے ہماری مراد پوری کرا دیں گے۔ قرآن مجید نے ان کی منظر کشی اور مذمت یوں کی ہے:

مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَآ إِلَى اللّٰهِ زُلْفَىٰ [۲]

''ہم ان کی عبادت اس لیے کر رہے ہیں کہ وہ ہمیں اللہ کے قریب کر دیں۔''

وَيَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنفَعُهُمْ وَيَقُولُونَ هَٰؤُلَاءِ شُفَعَاؤُنَا عِندَ اللّٰهِ [۳]

''یہ مشرکین اللہ کے سوا ان کی عبادت کرتے ہیں جو انہیں نہ نفع پہنچا سکیں نہ نقصان اور کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے پاس ہمارے سفارشی ہیں''۔

مشرکین بتوں کا حج و طواف کرتے تھے۔ صفا اور مروہ پر انہوں نے بتوں کے استھان بنا لیے تھے۔ مولانا مودودی لکھتے ہیں:

''صفا اور مروہ مسجد حرام کے قریب دو پہاڑیاں ہیں جن کے درمیان دوڑنا منجملہ ان مناسک کے تھا جو اللہ تعالیٰ نے حج کے لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو سکھائے تھے۔ بعد میں جب مکے اور آس پاس کے تمام علاقوں میں مشرکانہ جاہلیت پھیل گئی تو صفا پر ''اساف'' اور مروہ پر ''نائلہ'' کے استھان بنا لیے گئے اور ان کے گرد طواف ہونے لگا۔'' [۴]

مشرکین بتوں کے لیے نذرانے اور قربانیاں پیش کرتے اور قربانی کے ان جانوروں کو کبھی بتوں کے آستانے پر لے جا کر ذبح کرتے تھے اور کبھی کسی بھی جگہ ذبح کر لیتے تھے مگر بتوں کے نام پر ذبح کرتے تھے۔ ذبح کی ان دونوں صورتوں کا ذکر اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں کیا ہے۔

وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ [۵]

''یعنی وہ جانور بھی حرام ہیں جو آستانوں پر ذبح کیے گئے ہوں''

۱۔ الجامع الصحیح للبخاری کتاب الانبیاء باب قول تعالیٰ واتخذ اللہ ابراھیم خلیلا۔ (۳۳۵۱) الکتب الستۃ، ص ۲۷۱

۲۔ سورہ الزمر ۳۹:۳

۳۔ سورہ یونس ۱۰:۱۸

۴۔ تفہیم القرآن، ۱/ ۱۲۷

۵۔ المائدہ ۵:۳

دوسری جگہ ارشاد ہے:

وَلَا تَأْكُلُوا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ[1]

"اس جانور کا گوشت مت کھاؤ جس پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو۔"

مشرکین عرب بتوں کے تقرب کے لیے کھیتی اور چوپائے کے اندر مختلف قسم کی نذریں مانتے تھے۔ جس کے تذکرہ میں بھی کہا گیا ہے:

وَقَالُوا هٰذِهٖ اَنْعَامٌ وَّحَرْثٌ حِجْرٌ لَّا يَطْعَمُهَا اِلَّا مَنْ نَّشَاءُ بِزَعْمِهِمْ وَاَنْعَامٌ حُرِّمَتْ ظُهُوْرُهَا وَاَنْعَامٌ لَّا يَذْكُرُوْنَ اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا افْتِرَاءً عَلَيْهِ[2]

"ان مشرکین نے کہا کہ یہ چوپائے اور کھیتیاں ممنوع ہیں، انہیں وہی کھا سکتا ہے جسے ہم چاہیں۔ ان کے خیال میں اور یہ وہ چوپائے ہیں جن کی پیٹھ حرام کی گئی ہے اور کچھ چوپائے ایسے ہیں جن پر یہ لوگ اللہ پر افترا کرتے ہوئے اللہ کا نام نہیں لیتے۔"

مشرکین نے جن جانوروں پر مختلف قیود لگا رکھی تھیں ان میں سے بحیرہ، سائبہ، وصیلہ اور حامی تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان جانوروں سے متعلق ان کے افتراء سے براءت کا یوں اظہار فرمایا ہے:

مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْ بَحِيْرَةٍ وَّلَا سَآئِبَةٍ وَّلَا وَصِيْلَةٍ وَّلَا حَامٍ وَّلٰكِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَاَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ[3]

"اللہ نے نہ کوئی بحیرہ، نہ کوئی سائبہ نہ کوئی وصیلہ اور نہ کوئی حامی بنایا ہے لیکن جن لوگوں نے کفر کیا وہ اللہ پر جھوٹ گھڑتے ہیں اور ان میں سے اکثر عقل نہیں رکھتے۔"

مشرکین عرب ازلام یعنی فال کے تیر بھی استعمال کرتے تھے۔ فال گیری کے لیے استعمال ہونے والے یہ تیر تین قسم کے ہوتے تھے۔ ایک وہ جن پر صرف ہاں یا نہیں لکھا ہوتا تھا۔ اس قسم کے تیر سفر اور نکاح وغیرہ جیسے کاموں کے لیے استعمال کیے جاتے تھے۔ اگر فال میں ہاں نکلتا تو مطلوبہ کام کر ڈالا جاتا اگر نہیں نکلتا تو سال بھر کے لیے ملتوی کر دیا جاتا اور آئندہ پھر فال نکالی جاتی۔

فال گیری کے تیروں کی دوسری قسم وہ تھی جن پر پانی اور دیت وغیرہ درج ہوتے تھے اور تیسری قسم نسب معلوم کرنے کے لیے تھی جس پر یہ درج ہوتا تھا کہ "تم میں سے ہے" یا "تمہارے علاوہ سے ہے" یا "ملحق" ہے۔[4]

---

[1] الانعام ۶:۱۲۱

[2] الانعام ۶:۱۳۸

[3] المائدہ ۵:۱۰۳

[4] ابن ہشام ۱/۱۰۲، ۱۰۳

مشرکین عرب کاہنوں، عرافوں اور نجومیوں کی خبروں پر بھی ایمان رکھتے تھے۔ نجومیوں کی خبروں کو ماننا درحقیقت تاروں پر ایمان لانا ہے اور تاروں پر ایمان لانے کی ایک صورت یہ بھی تھی کہ مشرکین عرب نچھتروں پر ایمان رکھتے تھے اور کہتے تھے کہ ہم پر فلاں اور فلاں نچھتر سے بارش ہوئی ہے۔[1]

مشرکین عرب میں بدشگونی کا بھی رواج تھا اسے عربی میں طیرۃ کہتے ہیں اس کی صورت یہ تھی کہ مشرکین کسی چڑیا یا ہرن کے پاس جا کر اسے بھگاتے تھے۔ پھر اگر وہ داہنے جانب بھاگتا تو اسے اچھائی اور کامیابی کی علامت سمجھ کر اپنا کام کر گزرتے اور اگر بائیں جانب بھاگتا تو اسے نحوست کی علامت سمجھ کر اپنے کام سے باز رہتے۔ اسی طرح اگر کوئی چڑیا یا جانور راستہ کاٹ دیتا تو اسے بھی منحوس سمجھتے۔

مشرکین کی ایک ایسی ہی حرکت یہ بھی تھی کہ مشرکین خرگوش کے ٹخنے کی ہڈی لٹکاتے تھے اور بعض دنوں، مہینوں، جانوروں، گھروں اور عورتوں کو منحوس سمجھتے تھے۔ بیماریوں کی چھوت کے قائل تھے اور روح کے اُلو بن جانے کا عقیدہ رکھتے تھے۔ یعنی ان کا عقیدہ تھا کہ جب تک مقتول کا بدلہ نہ لیا جائے اس کو سکون نہیں ملتا اور اس کی روح اُلو بن کر بیابانوں میں گردش کرتی رہتی ہے اور پیاس، پیاس یا مجھے پلاؤ، مجھے پلاؤ کی صدا لگاتی رہتی ہے جب اس کا بدلہ لے لیا جاتا ہے تو اسے راحت اور سکون مل جاتا ہے۔

قریش مکہ نے دین ابراہیمی میں بہت سی بدعات بھی داخل کر لی تھیں وہ اپنے آپ کو حضرت ابراہیم کی اولاد، بیت کے والی اور مکہ کے باشندے ہونے پر اس قدر مغرور ہو چکے تھے کہ کسی کو اپنا ہم پلہ خیال نہ کرتے تھے اور اپنا نام حمس یعنی بہادر اور گرم جوش رکھتے تھے اور کہتے تھے کہ ہمارے شایان شان نہیں کہ ہم حدود حرم سے باہر جائیں اسی لیے یہ لوگ عرفات نہیں جاتے تھے اور نہ وہاں سے افاضہ کرتے تھے بلکہ مزدلفہ ہی میں ٹھہر کر وہیں سے افاضہ کر لیتے تھے۔ قرآن کریم نے ان کی اس غلطی کی اصلاح کرتے ہوئے فرمایا:

ثُمَّ أَفِيضُوا مِنْ حَيْثُ أَفَاضَ النَّاسُ[2]

''تم لوگ بھی وہیں سے افاضہ کرو جہاں سے سارے لوگ افاضہ کرتے ہیں۔''

ان کی ایک بدعت یہ بھی تھی کہ انہوں نے بیرون حرم کے باشندوں پر یہ پابندی لگا رکھی تھی کہ وہ حرم میں آنے کے بعد پہلا طواف حمس سے حاصل کیے ہوئے کپڑوں ہی میں کریں۔ اب جو لوگ یہ لباس خریدنے کی سکت نہ رکھتے تھے وہ ننگا طواف کرنے پر مجبور ہوتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اس خرافات کے خاتمے کے لیے فرمایا:

يَا بَنِيٓ آدَمَ خُذُوا زِينَتَكُمْ عِندَ كُلِّ مَسْجِدٍ[3]

''اے آدم کے بیٹو ہر مسجد کے پاس اپنی زینت اختیار کر لیا کرو۔''

---

[1] صحیح مسلم، کتاب الایمان باب بیان کفر من قال مطرنا بالنوء، (۲۳۱) الکتب الستۃ، ص ۶۹۱

[2] البقرۃ ۲: ۱۹۹

[3] الاعراف ۷: ۳۱

قریش مکہ کی ایک بدعت یہ بھی تھی کہ وہ حالت احرام میں گھر کے اندر دروازے سے داخل نہ ہوتے تھے بلکہ گھر کے پچھواڑے ایک بڑا سا سوراخ بنا لیتے اور اسی سے آتے جاتے تھے اور اپنے اس اجڈ پنے کو نیکی سمجھتے تھے۔ قرآن مجید نے اس کی بھی ممانعت فرمائی:

وَلَيْسَ الْبِرُّ بِأَنْ تَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ ظُهُورِهَا وَلَٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقَىٰ[1]

''اور نیکی اس بات میں نہیں کہ (حالت احرام میں) گھروں میں ان کے پچھواڑے کی طرف سے آؤ بلکہ نیکوکار وہ ہے جو پرہیزگار ہو۔''

اس طرح اہل عرب لوگ دین ابراہیمی میں بہت سے خرافات اور بدعات شامل کر چکے تھے انہوں نے دین ابراہیمی کا حلیہ بگاڑ دیا تھا اور جن چیزوں سے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے منع کیا تھا اور جس اصنام پرستی سے براءت کا اظہار کرتے ہوئے انہوں نے ہجرت فرمائی تھی۔ دین ابراہیمی کے نام نہاد پیروکاروں نے بت پرستی اور شرک کی تمام شکلوں کو اپنا لیا تھا۔ اہل مکہ کا خصوصاً اور اہل عرب کا عموماً اسی قسم کا دین بن چکا تھا۔

مشرکین کے علاوہ جزیرۃ العرب کے مختلف اطراف میں یہودیت، مسیحیت، مجوسیت اور صابیت کے دعویدار بھی موجود تھے ان کا تاریخی خاکہ بھی مختصراً پیش کیا جا رہا ہے۔

یہودیت:

جزیرۃ العرب میں یہود کے کم از کم دو ادوار ہیں۔ پہلا دور اس وقت سے تعلق رکھتا ہے جب فلسطین میں بابل اور آشور کی حکومت کی فتوحات کے سبب یہودیوں کو ترک وطن کرنا پڑا اس حکومت کی سخت گیری اور بخت نصر کے ہاتھوں یہودی بستیوں کی تباہی و ویرانی، ان کے ہیکل کی بربادی اور ان کی اکثریت کی ملک بابل کو جلاوطنی کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہود کی ایک جماعت فلسطین چھوڑ کر حجاز کے شمالی اطراف میں آ بسی۔[2]

دوسرا دور اس وقت شروع ہوتا ہے جب ٹائیٹس رومی کی زیر قیادت ۷۰ء میں رومیوں نے فلسطین پر قبضہ کیا۔ اس موقع پر رومیوں کے ہاتھوں یہودیوں کی دارو گیر اور ان کے ہیکل کی بربادی کا نتیجہ یہ ہوا کہ متعدد یہودی قبیلے حجاز بھاگ آئے اور یثرب، خیبر اور تیماء میں آباد ہو کر یہاں اپنی باقاعدہ بستیاں بسالیں اور قلعے اور گڑھیاں تعمیر کر لیں۔ ان تارکین وطن یہود کے ذریعے عرب باشندوں میں کسی قدر یہودی مذہب کا بھی رواج ہوا اور اسے بھی ظہور اسلام سے پہلے اور اس کے ابتدائی دور کے سیاسی حوادث میں ایک قابل ذکر حیثیت حاصل ہو گئی۔ ظہور اسلام کے وقت مشہور یہودی قبائل یہ تھے۔ خیبر، نضیر، مصطلق، قریظہ اور قینقاع۔[3]

---

[1] البقرہ ۲:۱۸۹

[2] قلب جزیرۃ العرب، ص ۲۵۱

[3] ایضاً، ص ۲۵۱

یہودیت کو یمن میں بھی فروغ حاصل ہوا۔ یہاں اس کے پھیلنے کا سبب تبان اسعد ابوکرب تھا۔ یہ شخص جنگ کرتا ہوا یثرب پہنچا۔ وہاں یہودیت قبول کر لی اور بنو قریظہ کے دو یہودی علماء کو اپنے ساتھ یمن لے آیا اور ان کے ذریعے یہودیت کو یمن میں وسعت اور پھیلاؤ حاصل ہوا۔ ابوکرب کے بعد اس کا بیٹا یوسف ذونواس یمن کا حاکم ہوا تو اس نے یہودیت کے جوش میں نجران کے عیسائیوں پر حملہ بول دیا اور انہیں مجبور کیا کہ یہودیت قبول کریں مگر انہوں نے انکار کر دیا۔ اس پر ذونواس نے خندق کھدوائی اور اس میں آگ جلوا کر بوڑھے، بچے مرد و عورت سب کو بلاتمیز آگ کے الاؤ میں جھونک دیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس حادثے کا شکار ہونے والوں کی تعداد بیس سے چالیس ہزار کے درمیان تھی۔ یہ اکتوبر ۵۲۳ء کا واقعہ ہے۔ قرآن مجید نے سورہ بروج میں اسی واقعے کا ذکر کیا ہے۔[۱]

یہودیت کے پیروکار اپنے آپ کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پیروکار قرار دیتے تھے۔ حالانکہ ان لوگوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل شدہ کتاب تورات میں تحریف کر لی تھی۔ اس کے علاوہ یہ لوگ قتل انبیاء کتمان حق اور سود خوری جیسی لعنت میں مبتلا ہو چکے تھے۔ ان کی خرابیوں کی تفصیل باب نمبر ۴ میں تفصیلاً آئے گی۔

عیسائیت:

بلادِ عرب میں عیسائی مذہب کی آمد حبشی اور رومی قبضہ گیروں اور فاتحین کے ذریعے ہوئی۔ یمن پر حبشیوں کا قبضہ پہلی بار ۳۴۰ء میں ہوا اور ۳۷۸ء تک برقرار رہا۔ اس دوران یمن میں مسیحی مشن کام کرتا رہا۔ تقریباً اسی زمانے میں ایک مستجاب الدعوات اور صاحب کرامات زاہد جس کا نام فیمیون تھا نجران پہنچا اور وہاں کے باشندوں میں عیسائی مذہب کی تبلیغ کی۔ اہل نجران نے اس کی اور اس کے دین کی سچائی کی کچھ ایسی علامات دیکھیں کہ وہ عیسائیت کے حلقہ بگوش ہو گئے۔[۲]

پھر ذونواس کی کارروائی کے ردعمل کے طور پر حبشیوں نے دوبارہ یمن پر قبضہ کیا اور ابرہہ نے حکومت یمن کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لی تو اس نے بڑے جوش و خروش کے ساتھ بڑے پیمانے پر عیسائیت کو فروغ دینے کی کوشش کی۔ اسی جوش و خروش کا نتیجہ تھا کہ اس نے یمن میں ایک کعبہ تعمیر کیا اور کوشش کی کہ اہل عرب کو (مکہ اور بیت اللہ سے) روک کر اسی کا حج کرائے اور مکہ کے بیت اللہ شریف کو ڈھا دے۔ لیکن اس کی اس جرأت پر اللہ تعالیٰ نے اسے ایسی سزا دی کہ اولین و آخرین کے لیے عبرت بن گیا۔

سورہ فیل میں اسی کی تدبیر کے ضائع ہونے اور ان کی ہلاکت کا ذکر ہے:

أَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِأَصْحَابِ الْفِيلِ ○ أَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ فِي تَضْلِيلٍ ○ وَأَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا أَبَابِيلَ ○ تَرْمِيهِم بِحِجَارَةٍ مِّن سِجِّيلٍ ○ فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّأْكُولٍ ○ [۳]

---

[۱] سیرت ابن ہشام، ۱/ ۲۰، ۲۱، ۲۲، ۲۷، ۳۱، ۳۵، ۳۶

[۲] ایضاً، ۱/ ۳۱۔ ۳۴

[۳] الفیل ۱۰۵: ۱۔ ۵

''کیا تم نے نہیں دیکھا کہ تمہارے پروردگار نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا کیا۔ کیا ان کا داؤ غلط نہیں کیا اور ان پر پرندے بھیجے جھنڈ کے جھنڈ جو ان پر کنکر کی پتھریاں پھینکتے تھے تو ان کو ایسا کر دیا جیسے کھایا ہوا بھس۔''

دوسری طرف رومی علاقوں کی ہمسائیگی کے سبب آل غسان، بنو تغلب اور بنو طی وغیرہ قبائل عرب میں بھی عیسائیت پھیل گئی تھی۔ عیسائی مذہب کے پیروکاروں کی اکثریت عقیدہ کفارہ اور تثلیث کا شکار ہو چکی تھی۔ قلیل تعداد میں لوگ حق پر بھی قائم تھے ان کی تفصیل باب چہارم میں آئے گی۔

مجوسیت:

فارس کا سرکاری مذہب مجوسیت تھا اس طرح اہل فارس کے ہمسایہ عربوں میں اسے فروغ ملا۔ اس کے علاوہ یمن پر فارسی قبضے کے دوران وہاں بھی اکا دکا افراد نے مجوسیت قبول کر لی تھی یہ لوگ آگ کو پوجتے تھے اور دو خداؤں کے قائل تھے۔ مولانا مودودی تفہیم القرآن میں لکھتے ہیں:

''ایران کے آتش پرست جو روشنی اور تاریکی کے دو خدا مانتے تھے اور اپنے آپ کو زرتشت کا پیرو کہتے تھے ان کے مذہب و اخلاق کو مزدک کی گمراہیوں نے بری طرح مسخ کر کے رکھ دیا تھا۔ حتیٰ کہ سگی بہن سے نکاح تک ان میں رواج پا گیا تھا۔[1]

صابیئت:

صابی مذہب کے پیروکار ستارہ پرست لوگ تھے۔ یہ بھی ایک قلیل تعداد میں موجود تھے۔

عراق وغیرہ کے آثار قدیمہ کی کھدائی کے دوران جو کتبات برآمد ہوئے ہیں ان سے پتا چلتا ہے کہ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی کلدانی قوم کا مذہب تھا۔ دور قدیم میں شام و یمن کے بہت سے باشندے بھی اسی مذہب کے پیروکار تھے۔ لیکن جب یہودیت اور پھر عیسائیت کا دور دورہ ہوا تو اس مذہب کی بنیادیں ہل گئیں اور اس کی شمع فروزاں گل ہو کر رہ گئی۔ تاہم مجوس کے ساتھ خلط ملط ہو کر یا ان کے پڑوس میں عراق عرب اور خلیج عربی کے ساحل پر اس مذہب کے کچھ نہ کچھ پیروکار باقی رہے۔[2]

مولانا مودودی سورہ حج کی تفسیر کرتے ہوئے لفظ صابی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''صابی کے نام سے قدیم زمانے میں دو گروہ مشہور تھے۔ ایک حضرت یحییٰ علیہ السلام کے پیرو جو بالائی عراق (یعنی الجزیرہ) کے علاقے میں اچھی خاصی تعداد میں پائے جاتے تھے اور حضرت یحییٰ کی پیروی میں اصطباغ کے طریقے پر عمل کرتے تھے۔ دوسرے ستارہ پرست لوگ جو اپنے دین کو

---

[1] تفہیم القرآن، ۲۱۱/۳ (تفسیر لفظ مجوس میں)

[2] تاریخ ارض القرآن، ۲/ ۱۹۳۔۲۰۸

حضرت شیث اور حضرت ادریس علیہما السلام کی طرف منسوب کرتے تھے اور عناصر پر سیاروں کی اور
سیاروں پر فرشتوں کی فرماں روائی کے قائل تھے۔ ان کا مرکز حران تھا اور عراق کے مختلف حصوں میں
ان کی شاخیں پھیلی ہوئی تھیں۔[1]

مختصر یہ کہ مکہ میں طلوعِ اسلام کے وقت مذکورہ ادیان عرب میں موجود تھے لیکن سارے مذاہب شکست و ریخت سے دوچار تھے۔ مشرکین کا دعویٰ تھا کہ وہ دین ابراہیمی کے پیروکار ہیں حالانکہ ان کا مذہب شرک بت پرستی اور بدعات و توہمات کا ملغوبہ بنا ہوا تھا۔ دین ابراہیمی نے جن مکارم اخلاق کی تعلیم دی تھی یہ لوگ اس سے کوسوں دور تھے۔ یہودی مذہب کے پیروکاروں کا مذہب ریاکاری اور تحکم بن گیا تھا۔ یہودی علماء اللہ کی بجائے خود رب بن بیٹھے تھے وہ لوگوں پر اپنی مرضی چلاتے تھے۔ ان کی ساری توجہ اس بات پر مرکوز رہتی تھی کہ کس طرح مال و دولت اور سیادت حاصل ہو۔ خواہ اس کے لیے انہیں اپنا دین ہی کیوں نہ برباد کرنا پڑے اور ان کے اس قبیح عمل سے کفر و الحاد خواہ کتنا ہی فروغ پائے اور یہی وہ حرص تھے جس کی بنا پر انہوں نے نبی برحق ﷺ کا انکار کیا۔

اسی طرح عیسائیت میں کفارہ، تثلیث اور ابنیت مسیح جیسے غلط عقائد در آئے تھے ان میں ایک طرف رہبانیت تھی تو دوسری طرف عیش پرستی۔ اس طرح یہ مذہب بھی ایک ناقابل فہم بت پرستی بن چکا تھا۔ جن لوگوں نے یہ مذہب اختیار بھی کیا تو ان کی زندگی پر اس کے کوئی مثبت اثرات نظر نہ آتے تھے۔ اس طرح تقریباً تمام ادیان کا حال مشرکین عرب جیسا ہی ہو گیا تھا۔

حنفاء:

دین ابراہیمی کی بنیاد خالص توحید پر تھی۔ امتدادِ زمانہ اور جہالت کے شیوع سے اس دین میں شرک کی آمیزش ہو چکی تھی۔ خانہ کعبہ میں بتوں کی پرستش تک ہونے لگی تھی اور قریش مکہ کی چودھراہٹ اور معاشی مفادات اسی شرک اور اصنام پرستی سے وابستہ ہو چکے تھے۔

> ''قریش مکہ عرب کے مشرکانہ مذہب کے پروہت اور تمام مذہبی امور کے ٹھیکیدار بن چکے تھے۔ ان
> کے لیے سارے عرب سے نذریں اور نیازیں اور چڑھاوے کھنچے چلے آتے تھے۔''[2]

مذہب جب کسی طبقے کا کاروبار بن جاتا ہے تو اس کی اصل بنیاد اور روح کو بالائے طاق رکھ دیا جاتا ہے اور اس کی جگہ من گھڑت روایات خرافات اور بدعات لے لیتی ہیں۔ کچھ ایسی ہی حالت مجموعی طور پر پورے عرب کی ہو چکی تھی۔ مگر مذکورہ صورت حال میں چند نفوس ایسے بھی تھے جن میں جذبہ حق انگڑائی لے رہا تھا اور وہ اس من گھڑت دین سے بیزاری کا اظہار کر رہے تھے۔ ایسے مقدس نفوس جنہوں نے بے زاری کے ساتھ ساتھ عملی طور پر توحید کا نغمہ الاپا ایسے لوگوں کو تاریخ حنفاء کے نام سے یاد کرتی ہے۔ ان مقدس ہستیوں میں سے ایک زید بن عمرو ہیں۔

---

[1] تفہیم القرآن، ۳/ ۲۱۰

[2] نعیم صدیقی، محسن انسانیت، اسلامک پبلی کیشنز، لاہور، س ن، ص ۱۲۹

اسماء بنت ابوبکر کا بیان ہے کہ میں نے بوڑھے سردار زید بن عمرو کو کعبے کے ساتھ ٹیک لگائے ہوئے دیکھا اور وہ کہہ رہا تھا: اے قریش کے لوگو! قسم اس ذات کی جس کے قبضے میں زید بن عمرو کی جان ہے میرے سوا تم میں سے کوئی بھی ابراہیم کے دین پر قائم نہیں۔ پھر کہنے لگا اے خدا اگر میں جانتا کہ تجھے کون سے طریقے پسند ہیں تو میں انہیں طریقوں سے تیری عبادت کرتا لیکن میں نہیں جانتا۔ پھر ہتھیلیاں ٹیک کر سجدہ کرتا۔[1]

زید کی والہیت کا عالم یہ تھا کہ سجدہ گاہ کعبہ میں داخل ہوتا تو پکار اٹھتا: لبیک حقًا حقًا، تعبّدًا و رقًا۔ یعنی اے خداوند برحق میں تیرے حضور اخلاص مندانہ، عبادت گزارانہ اور غلامانہ انداز میں حاضر ہوں۔ پھر کہتا میں کعبہ کی طرف منہ کر کے اسی ذات کی پناہ طلب کرتا ہوں جس کی پناہ ابراہیم علیہ السلام نے ڈھونڈی تھی۔[2]

زید بن عمرو راہ حق کی جستجو میں موصل، الجزیرہ اور شام میں مارا مارا پھرتا رہا۔ اسے یہودیت اور نصرانیت کی چیزیں مطمئن نہ کر سکیں۔ ایک پادری سے معلوم ہوا کہ نبی رحمت مکہ میں آ چکا ہے۔ زید بن عمرو تیزی سے مکہ کی طرف پلٹے مگر بلاد لخم پر لوگوں نے ان کو قتل کر دیا۔[3]

زید بن عمرو کے بیٹے سعید اور حضرت عمر بن الخطاب نے زمانہ اسلام میں آنحضور ﷺ سے دریافت کیا کہ کیا ہم زید کے لیے دعائے مغفرت کر سکتے ہیں۔ آنحضور ﷺ نے فرمایا ہاں۔ فَاِنَّهٗ يُبْعَثُ اُمَّةً وَّحْدَهٗ۔ ''اللہ تعالیٰ ان کو قیامت کے دن ایک مستقل جداگانہ امت کی حیثیت سے اٹھائے گا۔''[4]

ایسی ہی دوسری شخصیت امیہ بن ابی صلت کی تھی جو سرداران طائف میں سے تھا۔ اس شاعر نے توحید اور حشر اور جزا و سزا کے بارے میں اچھے خیالات پیش کیے ہیں۔ نیز اخلاقی حکمت و نصیحت کی باتیں نظم کی ہیں۔ یہ شاعر بھی صنم پرستانہ جاہلی طرز فکر کا باغی تھا۔ مگر حضور ﷺ کی دعوت سے یہ حصہ نہ پا سکا۔ اس کے اشعار کو حضور پسند کرتے اور فرماتے کہ وہ اسلام لاتے لاتے رہ گیا۔[5]

مذکورہ افراد کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ معاشرہ میں برائی اور بدعات کے خلاف ایک تحریک جنم لے رہی تھی اور ماحول ایک زندگی بخش پیغام کے لیے منتظر اور مضطرب تھا۔

---

[1] سیرت ابن ہشام، ۱/ ۲۲۳

[2] ایضاً، ص ۲۲۸

[3] ایضاً، ص ۲۲۹

[4] محسن انسانیت، ص ۱۳۲

[5] ایضاً، ص ۱۳۳

فصل دوم

مکہ میں مسلمانوں کا پرامن رویہ

فصل اول میں قریش مکہ کی مذہبی حالت اور اس کے پورے عرب پر اثرات کا ذکر ہو چکا ہے۔ قریش مکہ نے دین ابراہیمی کا حلیہ بگاڑ کر بدعات، خرافات، شرک اور بت پرستی تک کو اپنا لیا تھا اور ان سب برائیوں کے ساتھ ان کا مفاد وابستہ ہو چکا تھا ان کی چودھراہٹ اور مالی مفادات انہیں بدعات اور خرافات کے گرد گھومتے تھے۔

ان حالات میں کچھ سلیم الفطرت لوگ جو اس حالت سے بیزار تھے اور خالص دین ابراہیمی کی تلاش میں تھے بتوں سے بیزاری اور براءت کا اظہار کر چکے تھے۔ یہ لوگ معاشرے میں ایک نئی جہت اور راہ حق کے لیے چنگاری کا کام کر رہے تھے۔ زید بن عمرو اور امیہ بن ابی الصلت کا شمار انہیں لوگوں میں ہوتا ہے۔

انہیں حالات میں ایک انتہائی سلیم الفطرت ہستی ایک خدا کی عبادت کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے مضبوط کردار کی بنا پر معاشرے میں الصادق اور الامین کا خطاب پا کر اب یاد الٰہی میں مگن غار حرا کو اپنا مرکز بنائے ہوئے تھی اور مسلسل سوچ و بچار میں تھی کہ مخلوق خدا کو توحید الٰہی اور اچھے اخلاق و اطوار کی طرف کیسے چلئے۔ یہ انسانیت کی محسن اور خیر خواہ ہستی حضرت محمد ﷺ کی تھی جن پر اس زمانہ میں رویائے صادقہ کی عنایت ہو چکی تھی یہ جو خواب میں دیکھتے صبح روز روشن کی طرح اس کی تعبیر پاتے تھے مگر انسانیت کی مکمل راہنمائی کے پروگرام کے لیے بے تاب رہتے تھے۔

اسی مبارک ہستی پر غار حرا میں حضرت جبرائیل علیہ السلام اللہ تعالیٰ کا پیغام جس سے انسانیت پچھلی چھ صدیوں سے محروم تھی ، لے کر جلوہ افروز ہوئے تو ان کی بے چین روح کو قرار مل گیا۔

مولانا محمد میاں رقم طراز ہیں:

آپؐ اسی غار میں تھے کہ ایک وجود نمودار ہوا۔ اس سے گھبراہٹ نہیں ہوئی بلکہ دل کو سکون ہوا جیسے سوکھے ہونٹوں کو ٹھنڈا پانی مل گیا[1]

غار حرا میں آپ ﷺ پر سورہ علق کی پہلی پانچ آیات نازل ہوئیں۔ یہاں سے آپ کی باقاعدہ نبوی زندگی کا آغاز ہوا۔ آپ ﷺ کی عمر مبارک چالیس سال ہو چکی تھی سن ۶۱۰ عیسوی تھی۔

پہلی وحی کے وقت آپ کا حضرت جبرائیل سے مکالمہ اور پھر احساس ذمہ داری اور مقام عبدیت کی بلندی کی بنا پر آپ پر گھبراہٹ طاری ہونا اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا آپ کو تسلی دیتے ہوئے آپ کے اوصاف کا تذکرہ کرنا، آپ کے اخلاق کریمانہ اور مقدس منشور زندگی کی غمازی کرتا ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

---

[1] محمد میاں، محمد رسول اللہ ﷺ قرآن اور تاریخ کے آئینہ میں، مکتبہ محمودیہ، لاہور، ۱۹۸۶ء، ص ۵۳

رسول اللہ ﷺ پر وحی کی ابتدا نیند میں اچھے خواب سے ہوئی آپ جو بھی خواب دیکھتے وہ سپیدہ صبح کی طرح نمودار ہوتا تھا۔ پھر آپ کو تنہائی محبوب ہوگئی چنانچہ آپؐ غار حرا میں خلوت اختیار فرماتے اور کئی کئی رات گھر تشریف لائے بغیر مصروف عبادت رہتے۔ اس کے لیے آپ توشہ لے جاتے پھر (توشہ ختم ہونے پر) حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے پاس واپس آتے اور تقریباً اتنے ہی دنوں کے لیے پھر توشہ لے جاتے۔ یہاں تک کہ آپ کے پاس حق آیا اور آپ غار حرا میں تھے یعنی آپ کے پاس فرشتہ آیا اور اس نے کہا پڑھو۔ آپؐ نے فرمایا میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ آپؐ فرماتے ہیں کہ اس پر اس نے مجھے پکڑ کر اس زور سے دبایا کہ میری قوت نچوڑ دی۔ پھر چھوڑ کر کہا پڑھو میں نے کہا میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ اس نے دوبارہ پکڑ کر دبوچا پھر چھوڑ کر کہا پڑھو میں نے پھر کہا میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ اس نے تیسری مرتبہ دبوچا پھر چھوڑ کر کہا:

> اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ ○ خَلَقَ الْإِنسَانَ مِنْ عَلَقٍ ○ اقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ ○ الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ○ عَلَّمَ الْإِنسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ○[۱]
>
> ''پڑھو اپنے رب کے نام سے جس نے (ساری مخلوق) کو پیدا کیا۔ بنایا انسان کو لہو کی پھٹکی سے پڑھ اور تیرا رب بڑا کریم ہے جس نے علم سکھایا قلم سے سکھایا آدمی کو جو نہ جانتا تھا۔''

ان آیات کے ساتھ رسول اللہ ﷺ پلٹے تو آپ کو یہ آیتیں ذہن نشین ہو چکی تھیں۔ احساس ذمہ داری اور اپنی عاجزی کا غیر معمولی احساس تھا کہ آپ پر کپکپی طاری تھی اور یہ آپ کی عاجزی انکساری اور مقام عبدیت کی معراج تھی کہ اپنے آپ کو اس بلند ترین مقام پر فائز دیکھتے ہوئے بھی اپنے آپ کو کچھ نہ سمجھتے تھے۔ گھبراہٹ کے عالم میں دل دھک دھک کر رہا تھا اپنی بیوی حضرت خدیجہؓ بنت خویلد سے فرماتے ہیں مجھے چادر اوڑھا دو مجھے چادر اوڑھا دو انہوں نے آپ کو چادر اوڑھا دی یہاں تک کہ خوف جاتا رہا۔

اس کے بعد آپ ﷺ نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو مذکورہ واقعہ کی اطلاع دیتے ہوئے فرمایا کہ مجھے تو اپنی جان کا ڈر لگتا ہے تو حضرت خدیجہؓ نے جن کے سامنے آپ کے شب و روز تھے آپ کے کردار اور پر امن مشن کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہوئے آپ کو تسلی دی:

> **کلا لا یخزیک اللہ ابدا انک لتصل الرحم و تحمل الکل و تکسب المعدوم و تقری الضیف و تعین علی نوائب الحق.**[۲]
>
> ''خدا شاہد ہے ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ کبھی ایسا نہیں ہو سکتا کہ اللہ تعالیٰ آپ کو ناکام کر دے آپ کی مدد نہ کرے آپ رشتہ داروں کا خیال رکھتے ہیں ان کی مدد کرتے ہیں۔ ہارے، تھکے، درماندہ مسافروں کے لیے سواری کا انتظام کرتے ہیں ان کو منزل تک پہنچانے میں آپ ایسے احسانات کرتے ہیں اور ایسی خدمات انجام دیتے ہیں جن کی نظیر نہیں ملتی۔ باہر کے مسافر جو بے ٹھکانا ہوتے ہیں آپ ان کو اپنا

---

[۱] العلق ۹۶/۱۔۵

[۲] الجامع الصحیح للبخاری، کتاب بدء الوحی، باب کیف کان بدء الوحی الی رسول اللہ ﷺ (۳۰۲) الکتب الستۃ ص ۱

مہمان بناتے ہیں۔ برپا ہونے والے ہنگاموں اور ناگہانی حوادث میں آپ حق کی حمایت کرتے ہیں۔''

یہ تھا آپ کا پروگرام جو انسانیت کی خدمت کے لیے آپ اپنائے ہوئے تھے اس کردار کے ساتھ جب آپ پر وحی نازل ہوئی تو انسانیت کو راہ راست پر لانے اور قیام امن کے لیے آپ نے تین سال تک خفیہ تبلیغ کا کام سرانجام دیا کیونکہ حکمت کا تقاضا یہی تھا۔ صفی الرحمن مبارک پوری رقمطراز ہیں:

مکہ دین عرب کا مرکز تھا یہاں کعبہ کے پاسبان بھی تھے اور ان بتوں کے نگہبان بھی جنہیں پورا عرب تقدیس کی نظر سے دیکھتا تھا اس لیے کسی دور افتادہ مقام کی نسبت مکہ میں مقصد اصلاح تک رسائی ذرا زیادہ دشوار تھی یہاں ایسی عزیمت درکار تھی جسے مصائب ومشکلات کے جھٹکے اپنی جگہ سے نہ ہلا سکیں۔ اس کیفیت کے پیش نظر حکمت کا تقاضا تھا کہ پہلے پہل دعوت وتبلیغ کا کام پس پردہ انجام دیا جائے تاکہ اہل مکہ کے سامنے اچانک ایک ہیجان خیز صورت حال نہ آجائے۔[1]

پہلی وحی کے بعد اولین مسلم آپ کے انتہائی قریبی لوگ تھے۔ پر امن طریقہ دعوت کا تقاضا یہی تھا کہ انتہائی پرخطر دور میں دعوت حق کا راز ایسے لوگوں کے سامنے ہی رکھا جائے جو آپ کے اخلاق کریمانہ اور پچھلے تجربات کی بنا پر آپ کو نبی ماننے کا قطعی فیصلہ کر سکتے ہوں۔ چنانچہ آپ نے اولین جن ہستیوں کا دعوت کے لیے انتخاب کیا ان میں یہ بات بدرجہ اتم موجود تھی۔ علامہ شبلی رقمطراز ہیں:

خاتم الانبیاء ﷺ کا کام خود سلامت رہ کر عرب اور نہ صرف عرب بلکہ تمام عالم کو فروغ اسلام سے منور کر دینا تھا۔ اس لیے نہایت تدبیر اور تدریج سے کام لینا پڑا۔ سب سے پہلا مرحلہ یہ تھا کہ یہ پرخطر راز پہلے کس کے سامنے پیش کیا جائے اس کے لیے صرف وہ لوگ انتخاب کیے جا سکتے تھے جو فیض یاب صحبت رہ چکے تھے جن کو آپ کے اخلاق وعادات کی تمام حرکات وسکنات کا تجربہ ہو چکا تھا جو پچھلے تجربوں کی بنا پر آپ ﷺ کے صدق دعویٰ کا قطعی فیصلہ کر سکتے تھے۔ یہ لوگ حضرت خدیجہؓ آپ کی حرم محترم تھی، حضرت علیؓ تھے جو آپ کی آغوش تربیت میں پلے تھے، زیدؓ تھے جو آپ کے آزاد کردہ غلام اور بندہ خاص تھے۔ حضرت ابوبکرؓ تھے جو برسوں سے فیضیاب خدمت تھے سب سے پہلے آپ نے حضرت خدیجہؓ کو یہ پیغام سنایا وہ سننے سے پہلے مومن تھیں پھر اور بزرگوں کی باری آئی اور سب ہمہ تن اعتقاد تھے۔[2]

آپ ﷺ پر مذکورہ قریب ترین لوگوں کا ایمان لانا آپ کے اخلاص اور آپ کی صداقت کا بجائے خود ایک ثبوت ہے۔ یہ وہ ہستیاں تھیں جو کئی برس سے آپ کی پرائیویٹ اور پبلک لائف سے اور آپ کے ظاہر و باطن سے پوری طرح واقف تھیں۔ ان سے بڑھ کر آپ کی زندگی اور کردار اور آپ کے ذہن وفکر کو جاننے والا کوئی اور نہیں ہو سکتا تھا۔ ان قریب ترین ہستیوں نے بالکل آغاز میں آپ کے بلاوے پر لبیک کہہ کر گویا ایک شہادت بہم پہنچا دی، دعوت کی صداقت اور داعی کے اخلاص کی۔

---

[1] الرحیق المختوم، ص ۱۳۳

[2] سیرت النبی، ص ۲۱۳۵

اسلام کے اولین پیروکاروں میں سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی پر امن دعوت وتبلیغ سے بہت سی اہم ہستیوں کو اسلام قبول کرنے کی سعادت حاصل ہوئی۔

ابن ہشام کے مطابق آپؓ کے علم اور خوش اخلاقی کے سبب آپ کی قوم کے بہت سے لوگوں کی آپ کے پاس نشست و برخاست رہتی تھی جن دوستوں اور ہم نشینوں پر آپ کو اعتماد تھا ان کو آپ نے راہ راست کی طرف بلانا شروع کیا۔ صدیق اکبرؓ کی دعوت سے حضرت عثمان بن عفان، زبیر بن عوام، عبدالرحمٰن بن عوف، سعد بن ابی وقاص اور طلحہ بن عبیداللہ اسلام لائے [1]

مکی دور نبوت کے اس ابتدائی دور میں جب دعوت اسلامی کا کام خفیہ اور رازداری کے طریقے پر ہو رہا تھا وہ پاکیزہ اور راہ حق کے لیے بے قرار لوگ بھی دائرہ اسلام میں داخل ہوئے۔ علامہ شبلی لکھتے ہیں:

بعض صحابہ ایسے تھے جو احناف کے تربیت یافتہ تھے یعنی وہ لوگ جو زمانہ اسلام سے پہلے بت پرستی ترک کر چکے تھے اور اپنے آپ کو حضرت ابراہیم کا پیرو کہتے تھے لیکن اجمالی اعتقاد کے سوا اور کچھ نہیں جانتے تھے اور اسی لیے تلاش حق میں سرگرداں تھے۔ انہی میں زید بھی تھے۔ انہوں نے آنحضرت کی بعثت سے پانچ برس پہلے وفات پائی لیکن ان کے صاحبزادے سعید موجود تھے وہ باپ کے ارشادات سن چکے تھے۔ آنحضرت ﷺ سے ملے تو ان کو وہ راہنما ہاتھ آ گیا جس کی جستجو میں ان کے باپ دنیا سے چلے گئے اور وہ اب تک سرگشتہ تھے۔ [2]

اسی ابتدائی تین سالہ دور میں بلال حبشی، صہیب رومی، عمار، خباب، ابوفکیہ اور معاشرے کے وہ مفلس، نادار اور مظلوم طبقے کے لوگ جن کے پاس جاہلیت کے دور کا کوئی منصب نہ تھا اسلام کی طرف متوجہ ہوئے اور مشرف بہ اسلام ہوئے۔ یہ لوگ نبی کریم ﷺ پر ایمان لانے کے بعد چھپ چھپا کر آپؐ سے راہنمائی حاصل کرتے تھے اور نماز پڑھتے تھے۔ ابن ہشام کا بیان ہے:

نبی ﷺ اور صحابہ کرام نماز کے وقت گھاٹیوں میں چلے جاتے تھے اور اپنی قوم سے چھپ کر نماز پڑھتے تھے۔ ایک بار ابوطالب نے نبی کریم ﷺ اور حضرت علیؓ کو نماز پڑھتے دیکھ لیا۔ پوچھا اور حقیقت معلوم ہوئی تو کہا کہ اس پر برقرار رہیں۔ [3]

تین سال تک تبلیغ کا کام خفیہ اور انفرادی رہا۔ اس دوران اہل ایمان کی ایک جماعت تیار ہو گئی تھی جو اخوت اور تعاون پر قائم تھی، اللہ کا پیغام پہنچا رہی تھی اور اس پیغام کو اس کا مقام دلانے کے لیے کوشاں تھی اور اس راہ میں آنے والے مصائب و آلام پر صبر و استقلال کا بھرپور مظاہرہ کر سکتی تھی اور اعلانیہ دعوت حق کے لیے تیار تھی۔

پر امن اعلانیہ دور دعوت:

اعلانیہ دعوت کے لیے آپ ﷺ پر اللہ تعالیٰ کا یہ قول نازل ہوا وَ اَنْذِرْ عَشِیْرَتَکَ الْاَقْرَبِیْنَ ”آپ اپنے نزدیک ترین قرابت داروں کو (عذاب الٰہی) سے ڈرائیے“۔

---

[1] سیرت ابن ہشام، ۱/۲۵۱

[2] سیرت النبی، ۱/ ۱۳۶

[3] سیرت ابن ہشام، ۱/ ۲۴۷

یہ آیت سورہ شعراء کی ہے اس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ ہے کہ کس طرح ان کی نبوت کا آغاز اور پھر فرعون سے اور آل فرعون سے پالا پڑا اور اللہ نے کیسے موسیٰ علیہ السلام کو بنی اسرائیل کو فرعون سے نجات دی اسی طرح اس سورہ میں پیغمبروں کو جھٹلانے والی اقوام فرعون اور قوم فرعون کے علاوہ قوم نوح، عاد، ثمود، قوم ابراہیم، قوم لوط اور اصحب الایکہ کے انجام کا بھی ذکر ہے۔ گویا اس سورہ میں اہل ایمان کو کامیابی اور نا ماننے والوں کے برے انجام کی خبر ہے۔

نبی کریم ﷺ نے اس سورہ کی مذکورہ آیت کے نزول کے بعد اپنی قوم میں سے اپنے قرابت داروں بنو ہاشم کو جمع کیا اور بات کرنے کی کوشش کی جسے ابولہب نے کامیاب نہ ہونے دیا۔

آپ ﷺ نے دوبارہ قرابت داروں کو جمع کر کے اپنے رسول ہونے اور مرنے کے بعد حساب کتاب کا ذکر کیا اور جنت وجہنم کی بات کی تو اس مرتبہ ابوطالب نے کہا:

(نہ پوچھو) ہمیں تمہاری معاونت کس قدر پسند ہے! تمہاری نصیحت کس قدر قابل قبول ہے اور ہم تمہاری بات کس قدر سچی جانتے مانتے ہیں اور یہ تمہارے والد کا خانوادہ جمع ہے اور میں بھی ان کا ایک فرد ہوں۔ فرق اتنا ہے کہ میں تمہاری پسند کی تکمیل کے لیے ان سب سے پیش پیش ہوں لہٰذا تمہیں جس بات کا حکم ہوا ہے اسے انجام دو بخدا میں تمہاری مسلسل حفاظت واعانت کرتا رہوں گا البتہ میری طبیعت عبدالمطلب کا دین چھوڑنے پر راضی نہیں۔

ابولہب نے کہا:

یہ خدا کی قسم برائی ہے اس کے ہاتھ دوسروں سے پہلے تم لوگ خود ہی پکڑ لو۔

اس پر ابوطالب نے کہا: خدا کی قسم! جب تک جان میں جان ہے ہم ان کی حفاظت کرتے رہیں گے۔[1]

نبی کریم ﷺ نے جب یہ محسوس کر لیا کہ ان کے چچا ابوطالب کی طرف سے مکمل تعاون وحمایت مل رہی ہے تو آپ نے پھر اعلانیہ دعوت وتبلیغ کے لیے پیش قدمی کی اور ایک روز کوہ صفا پر چڑھ کر یہ آواز لگائی: یا صباحاہ (ہائے صبح) عرب لوگ انتہائی اہم معاملے کے لیے لوگوں کو اکٹھا کرنے کے لیے یہ آواز لگایا کرتے تھے۔ آپ کی یہ پکار سن کر قریش کے قبائل آپ کے پاس جمع ہو گئے اور آپؐ نے انہیں خدا کی توحید اپنی رسالت اور یوم آخرت پر ایمان لانے کی دعوت دی۔ یہ اس واقع کا ایک ٹکڑا صحیح بخاری میں ابن عباس رضی اللہ عنہ سے اس طرح مروی ہے کہ جب وَ اَنْذِرْ عَشِیْرَتَکَ الْاَقْرَبِیْنَ نازل ہوئی تو نبی ﷺ نے کوہ صفا پر چڑھ کر بطون قریش کی آواز لگانی شروع کی اے بنی فہر! اے بنی عدی! یہاں تک کہ سب کے سب اکٹھے ہو گئے حتیٰ کہ اگر کوئی آدمی خود نہ جا سکتا تھا تو اس نے اپنا قاصد بھیج دیا کہ دیکھے معاملہ کیا ہے۔ غرض قریش آ گئے ابولہب بھی آ گیا اس کے بعد آپ نے فرمایا تم لوگ یہ بتاؤ! اگر میں یہ خبر دوں کو ادھر وادی میں شہسواروں کی ایک جماعت ہے جو تم پر چھاپہ مارنا چاہتی ہے تو کیا تم مجھے سچا مانو گے؟ لوگوں نے کہا ہاں! ہم نے آپ پر سچ ہی کا تجربہ کیا ہے۔ آپؐ نے فرمایا اچھا: تو میں تمہیں ایک سخت عذاب سے پہلے خبردار کرنے کے

---

[1] محمد الغزالی، فقہ السیرہ، دار الکتاب العربی، ۱۳۷۰ھ، ص ۷۷، ۷۸۔

لیے بھیجا گیا ہوں۔ اس پر ابولہب نے کہا، تو سارے دن غارت ہو تو نے ہمیں اسی لیے جمع کیا تھا اس پر سورۃ تبت یدا ابی لھب نازل ہوئی (ابولہب کے دونوں ہاتھ غارت ہوں اور وہ خود غارت ہو) [۱]

یہ صدا غایت تبلیغ تھی رسول اللہ ﷺ نے اپنے قریب ترین لوگوں پر واضح کر دیا تھا کہ اب اس رسالت کی تصدیق ہی پر تعلقات موقوف ہیں اور جس نسلی اور قبائلی عصبیت پر عرب قائم ہیں اس کا باطل ہونا کھل چکا ہے۔

ان حالات میں اللہ تعالیٰ کا یہ حکم نازل ہوتا ہے:

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ [۲]

"آپ کو جو حکم ملا ہے اسے کھول کر بیان کر دیجیے اور مشرکین سے رخ پھیر لیجیے۔"

اب آپ ﷺ پر مکہ والوں کے شرک، بدعات اور بت پرستی کی تردید کھلم کھلا کرنا لازم ہو چکا تھا۔ چنانچہ آپؐ نے ان کے بتوں کی حقیقت اور شرک و بدعات کے بطلان کو مثالیں دے دے کر واضح کرنا شروع کر دیا تو اہل مکہ آپ اور آپ کے دین کو مٹانے کے لیے مقابلے پر کمل کر آ گئے اور ظلم و ستم کے پہاڑ توڑنے لگے۔ ظلم و ستم اور تشدد کا تفصیلی ذکر تیسری فصل میں آئے گا۔

ان حالات میں کفار کی ستم رانیوں کے مقابل حکمت کا تقاضا یہ تھا کہ رسول اللہ ﷺ اپنے ساتھیوں کی تعلیم و تربیت کا کام خفیہ طریقے سے کریں ورنہ تصادم کی صورت میں آپ کے تمام پیروکاروں کو مٹایا جا سکتا تھا۔ آپ نے ان حالات میں دار ارقم کو جو کوہ صفا پر اہل مکہ کی نگاہوں اور مجلسوں سے دور تھا مرکز بنائے رکھا۔

کفار مکہ کا انفرادی تشدد اس دوران بھی جاری تھا۔ ظلم و ستم کی انتہا ہوئی تو آپ ﷺ نے اپنے مظلوم ساتھیوں کو بچانے اور اپنی تبلیغ کو اپنی طرف سے مکمل پر امن رکھنے کے لیے ہجرت حبشہ کی اجازت مرحمت فرمائی۔ حبشہ میں ایک نیک دل اور عادل بادشاہ اصحمہ کی حکومت تھی۔ رسول اللہ ﷺ کو معلوم تھا کہ اصحمہ نجاشی شاہ حبش ایک عادل بادشاہ ہے وہاں کسی پر ظلم نہیں ہوتا اس لیے آپؐ نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ وہ فتنوں سے اپنے دین کی حفاظت کے لیے حبشہ ہجرت کر جائیں۔

اس کے بعد ایک طے شدہ پروگرام کے مطابق رجب ۵ نبوی میں صحابہ کرام کے پہلے گروہ نے حبشہ کی جانب ہجرت کی۔ اس گروہ میں بارہ مرد اور چار عورتیں تھیں۔ حضرت عثمان بن عفان ان کے امیر تھے اور ان کے ہمراہ رسول اللہ ﷺ کی صاحبزادی حضرت رقیہ بھی تھیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کے بارے میں فرمایا کہ حضرت ابراہیم اور حضرت لوط علیہما السلام کے بعد یہ پہلا گھرانہ ہے جس نے اللہ کی راہ میں ہجرت کی۔ [۳]

یہ لوگ رات کی تاریکی میں چپکے سے نکل کر روانہ ہوئے تاکہ قریش کو علم نہ ہو سکے۔ قریش کو کسی قدر بعد میں علم ہوا۔ انہوں نے تعاقب کیا مگر مسلمان جا چکے تھے لہٰذا قریش نامراد لوٹے اور مسلمانوں نے حبشہ پہنچ کر بڑے چین کا سانس لیا۔ لیکن اسی سال

۱؎ الجامع الصحیح البخاری، کتاب التفسیر، تفسیر سورۃ تبت (۷۴۹/۲) المکتبۃ السلفیۃ، ص ۳۳۱

۲؎ سورۃ الحجر: ۹۴

۳؎ ابن قیم الجوزیہ، زاد المعاد فی ھدی خیر العباد، مطبعۃ السنۃ المحمدیہ ۱۳۷۴ھ، ۲۲۲/۱

رمضان میں قریش کے بڑے بڑے سرداروں کا نبی کریم ﷺ سے اچانک قرآن سن کر سجدہ کرنے کا واقعہ پیش آیا اور اس کی خبر حبشہ میں قریش کے قبول اسلام کی صورت میں پہنچی تو یہ لوگ واپس مکہ پلٹ آئے۔ قریش کے قبول اسلام کی خبر غلط تھی۔ اس طرح ان لوگوں میں سے بیشتر پھر ظلم وستم کا شکار ہو گئے البتہ کچھ لوگ مکہ کے نزدیک سے اصل خبر پا کر پھر پلٹنے میں کامیاب رہے۔

قریش مکہ کے اسلام قبول کرنے والی خبر کا پس منظر یہ تھا کہ نبی کریم ﷺ ایک بار حرم میں تشریف لے گئے جہاں قریش کا ایک بڑا مجمع تھا جس میں ان کے بڑے بڑے سردار موجود تھے۔ آپ ﷺ نے ایک دم اچانک سورہ نجم کی تلاوت شروع کر دی جب قریش کے کانوں میں کلام الٰہی کی آواز جو ناقابل بیان رعنائی و دلکشی اور عظمت لیے ہوئے تھی پڑی تو انہیں ہوش نہ رہا اور سب کے سب گوش بر آواز ہو گئے یہاں تک کہ جب سورہ کے اواخر میں دل ہلا دینے والی آیات تلاوت فرما کر آپؐ نے اللہ کا یہ حکم سنایا کہ فَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ وَاعْبُدُوْا[1] ''اللہ کے لیے سجدہ کرو اور اس کی عبادت کرو۔'' اور اس کی تلاوت کے ساتھ ہی آپ ﷺ نے سجدہ کیا تو کسی کو بھی اپنے آپ پر قابو نہ رہا اور سب کے سب سجدے میں گر پڑے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس موقعہ پر حق کی رعنائی و جلال نے منکرین و مستہزئین کی ہٹ دھرمی کا پردہ چاک کر دیا تھا اس لیے انہیں اپنے آپ پر قابو نہ رہ گیا تھا اور وہ بے اختیار سجدے میں گر پڑے تھے۔[2]

قریش مکہ کے ایک بڑے مجمع نے جن میں سرداران قریش بھی تھے سجدہ تو کر لیا تھا مگر بعد میں انہوں نے اس کی تاویل اپنے پرانے عقیدے اور موقف کی تائید ہی میں کی اور کہنے لگے کہ نبی کریم نے تلاوت میں چونکہ ان کے بتوں کا ذکر عزت و احترام سے کرتے ہوئے یہ کہا تھا کہ تلک الغرانیق العلی، و ان شفاعتھن لترجی یہ بلند پایہ دیویاں ہیں اور ان کی شفاعت کی امید کی جاتی ہے۔

حالانکہ یہ صریح جھوٹ تھا جو آپ کے ساتھ سجدہ کرنے کے حوالے سے انہوں نے گھڑا تھا۔ بہر حال قریش مکہ اپنے کفر، شرک اور ہٹ دھرمی پر اسی طرح قائم تھے اور مسلمانوں کو مسلسل اذیت اور تشدد کا نشانہ بنائے ہوئے تھے۔

لیکن مشرکین کے سجدہ کرنے کے اس واقعہ کی خبر مہاجرین حبشہ کو بھی معلوم ہوئی مگر اپنی اصل صورت سے بالکل ہٹ کر یعنی انہیں یہ معلوم ہوا کہ قریش مکہ مسلمان ہو گئے ہیں چنانچہ انہوں نے ماہ شوال میں مکہ واپسی کی راہ لی لیکن جب اتنے قریب آ گئے کہ مکہ ایک دن سے بھی کم فاصلے پر رہ گیا تو حقیقت حال آشکارا ہوئی۔ اس کے بعد کچھ لوگ تو سیدھے حبشہ پلٹ گئے اور کچھ لوگ چھپ چھپا کر یا قریش کے کسی آدمی کی پناہ لے کر مکے میں داخل ہوئے۔[3]

اس کے بعد حبشہ سے واپس آنے والے مسلمانوں کو خصوصاً اور مسلمانوں کو عموماً قریش مکہ اور ان کے خاندان والوں نے خوب ستایا اور تشدد کا نشانہ بنایا تو آپ ﷺ نے صحابہ کرام کو پھر ہجرت حبشہ کا مشورہ دیا تاکہ اپنی تحریک کو پر امن رکھا جائے اور مظلوم مسلمانوں کو ظلم وستم سے بچایا جائے۔

---

[1] سورہ النجم ۵۳:۶۲

[2] الجامع الصحیح للبخاری، باب سجدۃ النجم و باب سجود المسلمین والمشرکین (۱۰۷۰،۱۰۷۱) الکتب الستہ، ص ۸۴

[3] زاد المعاد ۱/۲۴

پہلی ہجرت حبشہ کی کامیابی اور نجاشی کے حسن سلوک کا قریش مکہ کو بہت قلق تھا اس لیے دوسری ہجرت حبشہ کو ناکام بنانے کے لیے سرداران قریش بہت چوکنا تھے لیکن مسلمان اللہ کے فضل سے ان سے کہیں زیادہ مستعد ثابت ہوئے اور حبشہ کی طرف ہجرت کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

اس مرتبہ کل ۸۲ یا ۸۳ مردوں اور اٹھارہ یا انیس عورتوں نے ہجرت کی۔ (حضرت عمار کی ہجرت مختلف فیہ ہے)[1]

قریش مکہ نے عمرو بن عاص اور عبداللہ بن ربیعہ کو جو گہری سوجھ بوجھ کے مالک تھے اور ابھی مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ دونوں کو قیمتی تحائف دے کر شاہ حبش کے پاس بھیجا۔ نجاشی نے ان کے کہنے پر مسلمانوں کو طلب کیا۔ ان کا موقف سن کر واپس بھیجنے سے انکار کیا۔ یوں یہ دونوں سفیر اپنے ہدیے واپس لیے بے آبرو ہو کر واپس مکہ پہنچے۔

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا جنہوں نے اس واقعے کو بیان کیا ہے، کہتی ہیں کہ وہ دونوں اپنے ہدیے تحفے لیے بے آبرو ہو کر واپس آئے اور ہم نجاشی کے پاس ایک اچھے ملک میں ایک اچھے پڑوسی کے زیر سایہ مقیم رہے۔[2]

مکہ میں رہنے والے باقی مسلموں نے اپنے اسلامی مشن کو پر امن طریقے سے جاری رکھا اور ہر قسم کے تشدد کو برداشت کیا۔ قریش مکہ نے حبشہ کی سفارت کی ناکامی اور اسلام کی مسلسل اشاعت سے تنگ آ کر آپ ﷺ کو ختم کرنے کے منصوبے بنانا شروع کر دیے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اسی دوران اسلام کو حضرت حمزہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے قبول اسلام سے تقویت بخشی تو پھر انہوں نے آپ ﷺ اور آپ کے خاندان کا بائیکاٹ اور محاصرہ کر کے ختم کرنے کی منصوبہ بندی کی۔

قریش دیکھتے تھے کہ ان کی روک ٹوک پر بھی اسلام کا دائرہ پھیلتا جاتا ہے۔ عمرؓ اور حمزہؓ جیسے لوگ ایمان لا چکے۔ نجاشی نے مسلمانوں کو پناہ دے دی ہے۔ سفراء بے نیل و مرام واپس آ چکے ہیں۔ مسلمانوں کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ اس لیے یہ تدبیر سوچی کہ آنحضرت ﷺ اور آپ کے خاندان کو محصور کر کے تباہ کر دیا جائے۔ چنانچہ تمام قبائل نے ایک معاہدہ مرتب کیا کہ:

> ''کوئی شخص نہ خاندان بنی ہاشم سے قربت کرے گا نہ ان کے ہاتھ خرید و فروخت کرے گا نہ ان سے ملے گا نہ ان کے پاس کھانے پینے کا سامان جانے دے گا جب تک وہ محمد کو قتل کے لیے حوالہ نہ کر دیں۔''[3]

تین سال تک آپ ﷺ اور آپ کے چند صحابہ اور تمام خاندان بنو ہاشم نے شعب ابی طالب میں اس طرح گزارے کہ کوئی ان سے نہ کوئی چیز لے سکتا تھا اور نہ دے سکتا تھا۔ مسلسل فاقوں سے تنگ آ کر یہ لوگ درختوں کے پتے اور سوکھا چمڑہ تک کھانے پر مجبور ہوئے لیکن انہوں نے مزاحمت کا طریقہ اختیار نہ کیا۔ ہر تنگی کو برداشت کر کے دین اسلام کو اپنائے رکھا۔

---

[1] زاد المعاد، ۲۴/۱

[2] سیرت ابن ہشام، ۱/ ۳۳۴-۳۳۸

[3] سیرت النبی ۱۹۶/۱

حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کا بیان ہے کہ ایک دفعہ رات کو سوکھا ہوا چمڑا ہاتھ آ گیا میں نے اس کو پانی سے دھویا پھر آگ پر بھونا اور پانی میں ملا کر کھایا۔[۱]

بچے جب بھوک سے روتے تھے تو باہر آواز آتی تھی۔قریش سن سن کر خوش ہوتے تھے لیکن بعض رحم دلوں کو ترس بھی آتا تھا۔ایک دن حکیم بن حزام نے جو حضرت خدیجہؓ کا بھتیجا تھا تھوڑے سے گیہوں اپنے غلام کے ہاتھ حضرت خدیجہؓ کے پاس بھیجے۔ راہ میں ابوجہل نے دیکھ لیا اور چھین لینا چاہا۔اتفاق سے ابوالبختری کہیں سے آ گیا، وہ اگرچہ کافر تھا لیکن اس کو رحم آیا اور کہا کہ ایک شخص اپنی پھوپھی کو کچھ کھانے کے لیے بھیجتا ہے تو کیوں روکتا ہے۔

اس محصوری کے زمانے میں رسول اللہ ﷺ اور دوسرے مسلمان حج کے زمانہ میں باہر نکل کر لوگوں کو اسلام کی دعوت دیتے تھے[۲]۔ آپ کا چچا ابولہب آپ کو ہر قسم کی تکلیف دیتا۔مسلسل تین برس تک آنحضرت ﷺ اور تمام آل ہاشم نے یہ مصیبتیں جھیلیں۔بالآخر دشمنوں ہی میں سے کچھ لوگوں کے دلوں میں اللہ نے رحم ڈالا انہوں نے اس معاہدے کو ختم کرنے کی تحریک چلائی۔ اسی دوران معاہدہ کی عبارت کو سوائے اسم اللہ کے دیمک چاٹ گئی۔مسلمان شعب ابی طالب سے باہر آنے میں کامیاب ہوئے۔

ہشام عامری خاندان بنو ہاشم کا قریبی رشتہ دار اور اپنے قبیلہ میں ممتاز تھا۔وہ چوری چھپے بنو ہاشم کو غلہ وغیرہ بھیجتا رہتا تھا ایک دن وہ زہیر کے پاس جو عبدالمطلب کے نواسے تھے گیا اور کہا:''کیوں زہیر! تم کو یہ پسند ہے کہ تم کھاؤ پیو اور ہر قسم کا لطف اٹھاؤ اور تمہارے ماموں کو ایک دانہ تک نصیب نہ ہو؟'' زہیر نے کہا:''کیا کروں تنہا ہوں ایک شخص بھی میرا ساتھ دے تو میں ظالمانہ معاہدہ کو پھاڑ کر پھینک دوں۔'' ہشام نے کہا''میں موجود ہوں'' دونوں مل کر مطعم بن عدی کے پاس گئے۔ابوالبختری، ابن ہشام، زمعہ بن الاسود نے بھی ساتھ دیا۔دوسرے دن سب مل کر حرم میں گئے۔زہیر نے سب لوگوں کو مخاطب کر کے کہا''اے اہل مکہ! یہ کیا انصاف ہے! ہم لوگ آرام سے زندگی بسر کریں اور بنو ہاشم کو آب و دانہ نصیب نہ ہو۔خدا کی قسم جب تک یہ ظالمانہ معاہدہ چاک نہ کر دیا جائے گا میں باز نہ آؤں گا۔'' ابوجہل برابر سے بولا:''ہرگز اس معاہدہ کو کوئی ہاتھ نہیں لگا سکتا۔زمعہ نے کہا تو جھوٹ کہتا ہے۔ جب یہ لکھا گیا تھا اس وقت بھی ہم راضی نہ تھے،غرض مطعم نے ہاتھ بڑھا کر دستاویز چاک کر دی۔مطعم بن عدی، عدی بن قیس، زمعہ بن الاسود، ابوالبختری، زہیر سب ہتھیار باندھ کر بنو ہاشم کے پاس گئے اور ان کو درہ سے نکال لائے۔[۳]

مذکورہ واقعہ کے وقت حضرت ابوطالب بھی حرم پاک کے ایک گوشے میں موجود تھے جن کے آنے کا سبب یہ تھا:

رسول اللہ ﷺ نے ابوطالب سے فرمایا کہ اے چچا قریش نے جو عہد نامہ لکھا تھا اللہ تعالیٰ نے اس پر دیمک کو مسلط کیا اور دیمک اس کو کھا گئی ہے۔صرف خدا کا نام باقی چھوڑا ہے۔ابوطالب نے کہا کیا تمہارے خدا نے تم کو اس بات کی خبر دی ہے؟ فرمایا ہاں، چنانچہ ابوطالب یہ سن کر قریش کے پاس آئے اور کہا کہ اے گروہ قریش میرے بھتیجے نے ایسا ایسا کہا ہے۔تم اپنے عہد نامہ

---

[۱] سیرت النبی ۱/۱۶۶

[۲] الرحیق المختوم، ص۱۹۱

[۳] سیرت النبی ۱/۱۶۷

کو دیکھو اگر واقعی اس کی یہی صورت ہو تو لازم ہے کہ تم اپنے ظلم وستم سے جو ہم پر تم نے کر رکھا ہے باز آ جاؤ اور اگر بھتیجے کا کہنا غلط ہوا تو میں اپنے بھتیجے کو تمہارے حوالے کر دوں گا۔ قریش اس بات پر راضی ہو گئے پھر جب اس کو دیکھا تو اس معاہدے کو رسول اللہ ﷺ کے فرمان کے مطابق مٹی کھا گئی تھی صرف خدا کا نام باقی رہ گیا تھا۔[1]

اس موقعہ پر ان پانچوں افراد نے جو اس معاہدے کے خلاف سرگرم تھے، اس معاہدے کو توڑ دیا۔

معاہدہ تو ختم ہو گیا البتہ قریش نے اس واقعہ کو بھی آپ ﷺ کے جادو سے تعبیر کیا جس کا ذکر اس آیت میں ہے:

وَإِن يَرَوْا آيَةً يُعْرِضُوا وَيَقُولُوا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ[2]

''اور اگر وہ کوئی نشانی دیکھتے ہیں تو رخ پھیر لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ تو چلتا پھرتا جادو ہے۔''

مشرکین مکہ نے اس واضح نشانی سے بھی منہ پھیر لیا اور آپ ﷺ کی مخالفت میں اور آگے بڑھ گئے۔

قریش کا مقاطعہ جو بعثت مبارکہ کے ساتویں سال شروع ہوا تھا تین سال بعد سن ۱۰ نبوی میں ختم ہو گیا۔ اس کے چند ماہ بعد نبی آپ کے چچا ابو طالب اور آپ کی غمگسار بیوی حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا انتقال ہو گیا۔ ان دو شخصیات کی وفات کے بعد آپ ﷺ پر اور آپ کے ساتھیوں پر ظلم وستم اور بڑھا دیا گیا۔

ابولہب اور عقبہ بن ابی معیط جو دونوں پڑوسی اور موذی دشمن تھے۔ یہ دونوں دشمن نبی کریم کی راہ میں کانٹے بچھواتے اور غلاظت ڈلواتے تھے۔[3] ان کے بچے آپ کے گھر میں گھس کر برتنوں کو خراب کرتے۔ کبھی ہنڈیا کو اوندھی کر دیتے یا اس میں پلیدی ڈال دیتے تھے۔[4]

نبی کریم ﷺ کے ہمدم اور ہم راز ابو بکر صدیق کو اتنا ستایا گیا کہ وہ بھی مکہ چھوڑنے پر مجبور ہو گئے اور حبشہ کے ارادے سے نکلے لیکن برک غماد پہنچے تو ابن دغنہ سے ملاقات ہوئی اور وہ اپنی پناہ میں آپ کو واپس مکہ لے آیا۔[5]

ان حالات میں نبی کریم نے اپنی دعوت کو مکہ سے باہر طائف لے جانے کا فیصلہ کیا۔ نبی کی زندگی کا ہر ورق چونکہ امت کے لیے سبق ہوتا ہے اس لیے وہ اللہ تعالیٰ پر مکمل اور کامل بھروسہ کے باوجود ظاہری ذرائع اور اسباب سے دامن نہیں جھٹکتا کیونکہ اگر سلسلہ اسباب کو چھوڑ دیا جائے تو اس عالم اسباب کا انتظام ہی درہم برہم ہو جائے۔ بہرحال جب ابو طالب کی وفات کے بعد قریش کو موقعہ مل گیا کہ جو کچھ وہ اب تک نہیں کر سکتے تھے اس کو کر گزریں تو آپؐ کو بھی ایسے ذریعہ کی تلاش ہوئی جو قانون عرب کے بموجب آپ کے لیے پناہ بن سکے اور اس کے لیے آپ کی نظر طائف پر پڑی۔

---

[1] سیرت ابن ہشام، ۱/ ۳۳۸

[2] القمر ۵۴: ۲

[3] طبقات ابن سعد، ۱/ ۱۳۳

[4] ابن کثیر، عماد الدین، البدایہ والنہایہ، مکتبۃ المعارف، بیروت، لبنان، ۱۹۷۷ء، ۳/ ۱۳۳

[5] سیرت ابن ہشام، ۱/ ۴۱۶

شوال ۱۰ نبوی میں نبی کریم ﷺ طائف تشریف لے گئے یہ مکے سے تقریباً ساٹھ میل دور ہے آپؐ نے یہ مسافت آتے جاتے پیدل طے فرمائی تھی آپؐ کے ہمراہ آپ کے آزاد کردہ غلام حضرت زید بن حارثہ تھے[۱]

طائف میں قبیلہ ثقیف کا تسلط تھا تین بھائی عبدیالیل، مسعود اور حبیب یہاں کے رئیس اعظم اور قبیلہ ثقیف کے سردار تھے۔ نبی کریم ﷺ کی نظر ان پر پڑی کہ اگر وہ پناہ میں لے لیں تو آپ کو فریضہ تبلیغ کی ادائگی میں آسانی ہوگی چنانچہ آپ رمضان گزارنے کے بعد ماہ شوال میں طائف تشریف لے گئے دس روز بعد وہاں قیام فرمایا۔ عوام و خواص اور ہر ایک کے سامنے دعوت اسلام پیش کی۔ روٴسا اور معززین کے مکانوں میں پہنچ کر گفتگو کی[۲]

ان تین بھائیوں سے بھی ملاقات کی اپنا مقصد واضح کیا مگر کسی ایک نے بھی انسانیت سے جواب نہیں دیا۔

ایک نے کہا اگر خدا نے تمہیں رسول بنا کر بھیجا ہے تو وہ خانہ کعبہ کے کپڑے کھسوٹ رہا ہے (اس کی عزت پامال کر رہا ہے)

دوسرے نے کہا اللہ کو آپ کے سوا کوئی اور نہیں ملا تھا جس کو رسول بنا کر بھیجتا۔

تیسرے نے کہا واللہ میں تم سے بات نہیں کروں گا۔ کیونکہ جیسا تمہارا دعویٰ ہے اگر واقعی تم خدا کے رسول ہو تو رسول کی شان یہ نہیں ہے کہ اس سے بحث کی جائے اور اگر تم خدا پر جھوٹ باندھ رہے ہو تو میری شان یہ نہیں ہے کہ میں جھوٹے سے بات کروں۔[۳]

ان لوگوں کے جواب سن کر آپ نے صرف اتنا فرمایا کہ میری اس دعوت کو پس پردہ رکھنا مگر ان لوگوں نے آوارہ لوگوں کو آپ کے پیچھے لگا دیا جنہوں نے آپؐ پر اس قدر تشدد کیا کہ آپ کے جوتے خون سے بھر گئے۔ اس دن کی سختی سے متعلق حضرت عائشہؓ سے روایت ہے، ان کا بیان ہے کہ انہوں نے ایک روز رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ کیا آپؐ پر کوئی ایسا دن بھی آیا ہے جو احد کے دن سے زیادہ سنگین رہا ہو؟ آپ ﷺ نے فرمایا ہاں، تمہاری قوم سے مجھے جن جن مصائب کا سامنا کرنا پڑا ان میں سب سے سنگین مصیبت وہ تھی جس سے میں گھاٹی کے دن دوچار ہوا جب میں نے اپنے آپ کو عبدیالیل بن عبد کلال کے صاحبزادے پر پیش کیا مگر اس نے میری بات منظور نہ کی تو میں غم والم سے نڈھال اپنے رخ پر چل پڑا اور مجھے قرن ثعالب پہنچ کر ہی افاقہ ہوا۔ وہاں میں نے سر اٹھایا تو کیا دیکھتا ہوں کہ بادل کا ایک ٹکڑا مجھ پر سایہ فگن ہے میں نے بغور دیکھا تو اس میں حضرت جبرائیل علیہ السلام تھے انہوں نے مجھے پکار کر کہا آپ کی قوم نے آپ سے جو بات کہی اللہ نے اسے سن لیا ہے۔ اب اس نے آپ کے پاس پہاڑوں کا فرشتہ بھیجا ہے تاکہ آپ ان کے بارے میں اسے جو حکم چاہیں دیں۔ اس کے بعد پہاڑوں کے فرشتے نے مجھے آواز دی اور سلام کرنے کے بعد کہا: اے محمد بات یہی ہے اب آپ جو چاہیں...... اگر چاہیں کہ میں انہیں دو پہاڑوں کے درمیان کچل دوں۔ تو ایسا ہی ہوگا۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا نہیں، بلکہ مجھے امید ہے کہ اللہ عزوجل ان کی پشت سے ایسی نسل پیدا کرے گا جو صرف ایک اللہ کی

---

[۱] الرحیق المختوم، ص ۲۱۷

[۲] طبقات ابن سعد، ۱/ ۱۴۲

[۳] البدایہ والنہایہ، ۳/ ۱۳۵

عبادت کرے گی اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھہرائے گی۔[1]

نبی کریم ﷺ کے اس جواب میں آپ کے پرامن رویے اور ناقابل ادراک گہرائی رکھنے والے اخلاق عظیمہ کے جلوے دیکھے جاسکتے ہیں۔

نبی کریم ﷺ نے طائف سے مکہ واپس پہنچ کر نئے سرے سے دعوت اسلام اور تبلیغ رسالت کے کام میں چستی اور گرمجوشی کا مظاہرہ کرنے کا ارادہ فرمایا۔ عرب کے قانون کے مطابق آپ مکہ میں واپس بغیر کسی کی پناہ کے داخل نہ ہوسکتے تھے کوئی آپؐ کو پناہ دینے کے لیے تیار نہ تھا۔ سب آپ کے پیغام پر معذرت کرتے دکھائی دے رہے تھے۔ پھر یہ سعادت مطعم بن عدی کو نصیب ہوئی اس نے آپ کو پیغام پر ہاں کہا اور خود ہتھیار لیس ہو کر اور اپنے بیٹوں کو لے کر آپؐ کو مکہ میں داخل کر دیا۔ آپ ﷺ نے اس کے اس احسان کو عمر بھر یاد رکھا۔

غزوہ بدر میں جب کفار مکہ کی ایک بڑی تعداد قید ہو کر آئی اور بعض قیدیوں کی رہائی کے لیے حضرت جبیر بن مطعم آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے فرمایا:

لو کان المطعم بن عدی حیا ثم کلمنی فی ھٰؤلاء النتنی لترکتھم لہ۔[2]

''اگر مطعم بن عدی زندہ ہوتا پھر مجھ سے ان بدبودار لوگوں کے بارے میں گفتگو کرتا تو میں اس کی خاطر ان سب کو چھوڑ دیتا۔''

قبائل اور افراد کو حج کے موقعہ پر امن دعوت:

طائف کے لوگوں کو نبی کریم ﷺ نے نہایت حکمت و دانائی اور شفقت بھرے لہجے میں اسلام کی طرف بلایا مگر ان لوگوں نے اس کا جواب انتہائی بھونڈے تشدد اور تکبر کی صورت میں دیا۔ آپ ﷺ نے واپس مکہ آکر موسم حج سے فائدہ اٹھا کر بہت سے قبائل اور افراد کو اسلام کی دعوت دینا شروع کر دی۔ یہ کام اگرچہ نبوت کے چوتھے سال سے ہی آپ کا معمول بن چکا تھا مگر طائف کے سفر کی سختی اور پھر آپ ﷺ کے صبر و استقلال اور اللہ کی طرف سے تائید اور نصرت نے آپ کی ہمت کو دو چند بڑھا دیا تھا۔ سفر طائف کے بعد آپ کی تبلیغ رنگ لانے لگی۔ بہت سے لوگ جو مکہ سے باہر سکونت پذیر تھے آپ کے ہاتھ پر اسلام قبول کر کے آپ کے دست و بازو بننے لگے اور یثرب میں بھی آپ کے جاں نثار فریضہ تبلیغ انتہائی حکمت اور پرامن طریقے سے ادا کرنے لگے۔ سوید بن صامت، ایاس بن معاذ، ابوذر غفاری، طفیل بن عمرو دوسی اور ضماد ازدی نے اسی ماہ میں اسلام قبول کیا تھا۔

سن نبوی کے گیارھویں سال موسم حج میں نبی کریم ﷺ کو دعوت اسلام کے لیے چند ایسے کارآمد بیج دستیاب ہوئے جو دیکھتے ہی دیکھتے سرو قامت درختوں میں تبدیل ہو گئے اور جن کی چھاؤں میں مسلمانوں نے برسوں راحت محسوس کی۔ اہل مکہ کے ظلم و ستم اور

---

[1] الجامع الصحیح للبخاری، کتاب بدء الخلق، باب اذا قال احدکم آمین... (۳۲۳۱) المکتب السلفیہ، ص ۴۹۲

[2] الجامع الصحیح للبخاری، کتاب المغازی، باب ۱۲ (۴۰۲۴) المکتب السلفیہ، ص ۳۲۸

راہ حق سے رکاوٹ ڈالنے کی وجہ سے نبی کریم ﷺ موسم حج میں رات کی تاریکی میں مختلف قبائل کو اسلام کی دعوت دیا کرتے تھے۔ اسی حکمت عملی کے مطابق آپ ﷺ ایک رات حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کے ہمراہ منیٰ کی گھاٹی سے گزرے تو یثرب کے چھ جوانوں کو باہم گفتگو کرتے سنا۔ آپ سیدھے ان کے پاس پہنچے ان سب کا تعلق قبیلہ خزرج سے تھا۔ ان کے نام یہ تھے: اسعد بن زرارہ ۲۔ عوف بن حارث ۳۔ رافع بن مالک ۴۔ قطبہ بن عامر ۵۔ عقبہ بن عامر ۶۔ حارث بن عبداللہ۔

یہ اہل یثرب کی خوش قسمتی تھی کہ وہ اپنے حلیف یہود مدینہ سے سنا کرتے تھے کہ اس زمانے میں ایک نبی بھیجا جانے والا ہے اور اب جلد ہی وہ نمودار ہوگا۔ ہم اس کی پیروی کر کے اس کی معیت میں تمہیں عاد و ارم کی طرح قتل کر دیں گے۔[1]

نبی کریم ﷺ نے ان لوگوں کے پاس پہنچ کر ان کا تعارف حاصل کر کے انہیں اسلام کی حقیقت بتلائی اور اللہ عزوجل کی طرف دعوت دی اور قرآن کی دعوت دی۔ ان لوگوں کو آپس میں مشورے کے بعد یہ یقین ہوگیا کہ یہ تو وہی نبی ہے جن کے حوالے سے یہود ہمیں دھمکیاں دیتے رہتے ہیں۔ لہٰذا یہود ہم پر سبقت نہ لے جانے پائیں۔ اس کے بعد انہوں نے اسلام قبول کرلیا۔

یہ لوگ مدینہ واپس ہوئے تو اپنے ساتھ اسلام کا پیغام بھی لے گئے چنانچہ وہاں گھر گھر رسول اللہ ﷺ کا چرچا پھیل گیا۔[2]

اگلے سال سن ۱۲ نبوی میں بارہ آدمی نبی کریم کی خدمت میں موسم حج میں حاضر ہوئے۔ ان میں حضرت جابر بن عبداللہ کو چھوڑ کر باقی پانچ وہی تھے جو پچھلے سال بھی آچکے تھے اور ان کے علاوہ سات آدمی نئے تھے۔[3]

ان لوگوں نے منیٰ میں عقبہ کے پاس نبی کریم ﷺ کے مبارک ہاتھ پر بیعت کی۔ یہ بیعت آپ کے پر امن رویے اور مشن کی منہ بولتی تصویر ہے۔ یہ بیعت عقبہ اولیٰ کہلاتی ہے۔ حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے مروی ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: آؤ! مجھ سے اس بات پر بیعت کرو کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو گے، چوری نہ کرو گے، زنا نہ کرو گے، اپنی اولاد کو قتل نہ کرو گے، اپنے ہاتھ پاؤں کے درمیان سے گھڑ کر کوئی بہتان نہ لاؤ گے اور کسی بھلی بات میں میری نافرمانی نہ کرو گے۔ جو شخص یہ ساری باتیں پوری کرے گا اس کا اجر اللہ پر ہے اور جو شخص ان میں سے کسی چیز کا ارتکاب کر بیٹھے گا پھر اسے دنیا ہی میں اس کی سزا دے دی جائے گی تو یہ اس کے لیے کفارہ ہوگی اور جو شخص ان میں سے کسی چیز کا ارتکاب کر بیٹھے گا پھر اللہ اس پر پردہ ڈال دے گا تو اس کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے چاہے گا تو سزا دے گا اور چاہے گا تو معاف کر دے گا۔

حضرت عبادہؓ فرماتے ہیں کہ ہم نے اس پر آپ ﷺ سے بیعت کی۔[4]

جب یہ لوگ رخصت ہونے لگے تو حضور ﷺ نے مصعب بن عمیر بن ہاشم کو ان کے ساتھ کیا تاکہ ان کو قرآن پڑھائیں اور احکام اسلام کی تعلیم دیں۔

---

[1] زاد المعاد، ۲/ ۵۰

[2] ابن ہشام، ۱/ ۴۲۸، ۴۳۰

[3] الرحیق المختوم، ص ۲۳۶

[4] الجامع الصحیح للبخاری، کتاب مناقب الانصار، باب وفود الانصار الی النبی ﷺ بمکۃ وبیعۃ العقبۃ (۳۸۹۲) الکتب الستۃ، ص ۳۱۷

اگلے سال سن ۱۳ نبوی میں یثرب کے مسلمانوں اور مصعب بن عمیر کی تبلیغی مساعی کے نتیجہ میں ۷۰ سے زائد لوگ حج کی ادائیگی کے لیے آئے اور اپنے مشن کو خ ٔامن رکھنے کے لیے رات کی تاریکی میں گھاٹی میں جمع ہو کر رسول اللہ ﷺ سے ملے اور اس بار انہوں نے نبی کریم ﷺ کو یثر نے کی دعوت اور مکمل تعاون اور تحفظ کی پیش کش کی۔ نبی کریم ﷺ نے ان سے بیعت لی جو بیعت عقبہ ثانیہ کہلاتی ہے۔ اس بیعہ ۔ کی دفہ ۔یہ تھیں:

بیعت کا واقعہ امام احمد نے حضرت جابرؓ سے تفصیل سے روایت کیا ہے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ہم نے عرض کی کہ اے اللہ کے رسول (ﷺ) ہم آپ سے کس بات پر بیعت کریں۔ آپؐ نے فرمایا اس بات پر کہ:

۱۔ چستی اور سستی ہر حال میں بات سنو گے اور مانو گے۔

۲۔ تنگی اور خوش حالی ہر حال میں مال خرچ کرو گے۔

۳۔ بھلائی کا حکم دو گے اور برائی سے روکو گے۔

۴۔ اللہ کی راہ میں اٹھ کھڑے ہو گے اور اللہ کے معاملے میں کسی ملامت گر کی ملامت کی پرواہ نہ کرو گے۔

۵۔ اور جب میں تمہارے پاس آ جاؤں گا تو میری مدد کرو گے اور جس چیز سے اپنی جان اور اپنے بال بچوں کی حفاظت کرتے ہو اس سے میری بھی حفاظت کرو گے۔[1]

بیعت عقبہ ثانیہ کی کارروائی کو مکمل رازداری سے سرانجام دینے کے لیے تمام کوششیں بروئے کار لائی گئی تھیں۔ اس کے باوجود بھی ایک شیطان نے پہاڑ کی چوٹی سے یہ نظارہ دیکھا اور چیخ کر اہل مکہ کو پکار کر کہا لوگو آؤ دیکھو کہ محمد اور اس کے فرقے کے لوگ تم سے لڑائی کے مشورے کر رہے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم اس آواز کی پرواہ نہ کرو۔ عباس بن عبادہ نے کہا اگر حضور کی اجازت ہو تو ہم کل ہی مکہ والوں کو اپنی تلوار کے جوہر دکھا دیں۔ نبی رحمت نے فرمایا نہیں مجھے جنگ کی اجازت نہیں ہے۔[2]

آپ ﷺ نے اس کے بعد بیعت کے شرکاء میں سے ۱۲ آدمیوں کا انتخاب کیا اور ان کا نام نقیب رکھا اور یہ بھی فرمایا کہ جس طرح عیسیٰ بن مریم نے اپنے لیے ۱۲ شخصوں کو چن لیا تھا اسی طرح میں تمہیں انتخاب کرتا ہوں تاکہ تم یثرب میں جا کر دین کی اشاعت کرو۔ مکہ والوں میں میں خود یہ کام کروں گا۔ نقیبوں کے نام یہ ہیں:

قبیلہ خزرج کے ۹۔ اسعد بن زرارہ، رافع بن مالک، عبادہ بن صامت، سعد بن ربیع، منذر بن عمرو، عبداللہ بن رواحہ، براء بن معرور، عبداللہ بن عمرو بن حرام، سعد بن عبادہ۔

قبیلہ اوس کے ۳۔ اسید بن حضیر، سعد بن خثیمہ، ابوالہیثم بن تیہان[3]

---

[1] سیرت ابن ہشام، ۱/ ۴۵۴

[2] زادالمعاد، ۱/ ۳۰۴

[3] رحمۃ للعالمین، ۱/ ۸۱

کفارِ مکہ کو اس بیعت کی خبر کی کچھ بھنک پہنچی۔ انہوں نے رؤسائے یثرب سے احتجاج بھی کیا مگر یثرب سے آنے والے کسی مشرک کو اس کی خبر تک نہ تھی۔ ان کے یقین دلانے پر کفارِ مکہ نامراد لوٹے۔ مگر مسلسل کرید میں رہے جب انہیں یقین ہو گیا کہ خبر صحیح ہے تو بیعت کرنے والوں کے پیچھے دوڑے مگر وہ لوگ کافی سفر کر چکے تھے۔ صرف سعد بن عبادہ ان کے قابو میں آئے جن پر انہوں نے جی بھر کر تشدد کیا۔

سعد بن عبادہ کو مطعم بن عدی اور حارث بن حرب نے مکہ والوں سے چھڑایا کیونکہ ان دونوں کے قافلے مدینہ سے گزرتے تھے تو حضرت سعد ہی کی پناہ میں گزرتے تھے۔ یوں یہ ثابت قدم بزرگ بھی واپس پلٹنے میں کامیاب ہوئے۔[1]

مشرکین مکہ نے نبی کریم ﷺ اور آپ کے ساتھیوں پر ظلم و ستم کی انتہا کی مگر آپؐ اور آپ کے ساتھیوں کا رویہ پرامن اور پروقار رہا۔ انہوں نے نبی رحمت کی قیادت میں نازک سے نازک مرحلہ میں بھی آپ کے حکم اور تعلیمات کی ذرا بھر خلاف ورزی نہ کی۔

مکہ میں آپ ﷺ کے دعوتی پروگرام کے نمایاں اصول یہ رہے:

۱۔ کُفُّوْٓا اَیْدِیَکُمْ[2] "ہاتھ روکو"

۲۔ اقیموا الصّلوٰۃ "نماز قائم کرو"

۳۔ اٰتوا الزکوٰۃ "زکوٰۃ ادا کرو"

۴۔ وَ اَقْرِضُوا اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا[3] "اللہ کو قرض حسنہ دیتے رہو"

مکہ معظمہ میں زکوٰۃ کا حکم تو ہوا مگر اس کا نصاب نہیں مقرر کیا گیا۔ نصاب مدینہ طیبہ میں سن ۲ ہجری میں مقرر ہوا۔ مکہ معظمہ میں زکوٰۃ اور قرض حسنہ کا فرق محض مصرف کے لحاظ سے تھا یعنی غریبوں اور مسکینوں کو جو دیا جاتا تھا وہ زکوٰۃ اور غلاموں کو خرید کر رہا کرنا یا دوسرے ملی کاموں میں خرچ کو قرآن میں قرض سے تعبیر کیا۔ حاصل یہ ہوا کہ جو کچھ ہو خرچ کر ڈالو اور جو خرچ کرو گے اللہ کے یہاں اس سے بہتر ملے گا۔

مذکورہ اصولوں کی پاسداری کرتے ہوئے نبی کریم ﷺ اور آپ کے صحابہ نے دن رات محنت کر کے ہر قسم کے ظلم و تشدد کو برداشت اور اپنی مکمل متاع اللہ کی راہ میں خرچ کر کے دین اسلام کی روشنی یثرب تک پہنچا دی اور وہاں کی ایک مناسب تعداد نے جب اسے قبول کر لیا ان کی دعوت اور اذن خداوندی سے مرکز اسلام مدینہ کو بنانے کے لیے نبی کریم ﷺ اور آپ کے صحابہ نے ہجرت فرمائی۔

---

[1] سیرت ابن ہشام، ۱/ ۴۴۸

[2] النساء ۴:۷۷

[3] المزمل :۲۰

فصل سوم

کفار مکہ کا طرز عمل اور مزاحمتی تدابیر

عرب میں بادشاہت نہیں تھی ہر ایک قبیلہ آزاد ہوتا تھا۔ شیخ قبیلہ اندرونی نظام کا نگران ہوتا تھا۔ مکہ میں اس نظام نے چھوٹے سے جمہوریہ کی صورت اختیار کر لی تھی۔ صدر جمہوریہ تو پھر بھی کوئی نہ تھا البتہ قبائل کی ایک مشترک جماعت (کونسل) تھی اس نے شہری، سماجی اور انتظامی ضرورتوں کو سامنے رکھ کر تقریباً ایک درجن شعبے بنائے تھے اور ہر شعبہ کا سربراہ منتخب کر دیا تھا۔ مثلاً مقدمات قتل کا ایک خاص شعبہ تھا اس کے سربراہ ابوبکر صدیق تھے۔ شعبہ سفارت کے ذمہ دار حضرت عمر فاروق تھے۔ اسی طرح باقی شعبوں کے ذمہ دار علیحدہ علیحدہ تھے۔ ان میں سے صرف ابوبکر صدیق وہ تھے جو سب سے پہلے اسلام لا چکے تھے۔ عمر فاروق کئی سال بعد مسلمان ہوئے۔ باقی شعبوں کے ذمہ دار یا تو مسلمان ہوئے ہی نہیں اگر ہوئے بھی تو بہت آخر میں۔[1]

اس مشترک جماعت کے اجلاس دارالندوہ میں ہوتے تھے کوئی غیر معمولی معاملہ ہوتا تو اراکین کے علاوہ بھی نمایاں افراد کو خاص طور پر مدعو کر لیا جاتا تھا۔

حرب بن امیہ، ولید بن مغیرہ، عاص بن وائل، عتبہ بن ربیعہ، ابولہب، ابوجہل، امیہ بن خلف، ابی بن خلف، عقبہ بن ابی معیط، نضر بن حارث، اسود بن عبد یغوث بڑے بڑے دولت مند تھے۔ یہ تاجر بھی تھے اور صاحب جائداد بھی سودی کاروبار بھی بڑے پیمانے پر کرتے تھے اور ان تمام خصوصیتوں کے مالک تھے جو سرمایہ داروں میں ہوا کرتی ہیں۔ مثلاً ابولہب جو آنحضرت ﷺ کا چچا بھی تھا اور ہمیشہ مخالف میں پیش پیش رہا تھا اس کا سودی لین دین وسیع پیمانہ پر تھا اور اس کے حرص و طمع کی یہ حالت تھی کہ اس نے خانہ کعبہ کے خزانہ سے سونے کا ہرن چوری کر کے بیچ ڈالا تھا یہ ہرن بہت عرصہ سے محفوظ چلا آتا تھا۔[2]

عاص بن وائل بہت دولت مند قبیلہ کا مشہور سردار تھا مگر حضرت خباب سے اس کا اس پر جھگڑا ہوا کہ انہوں نے لوہے کی کوئی چیز بنا کر اس کو دی تھی وہ اس کی اجرت مانگتے تھے اور یہ جان چراتا تھا۔

مذکورہ افراد مکہ کی سیاست میں نمایاں مقام رکھتے تھے ان کے پاس دولت کے انبار بھی تھے اور فرماں بردار اولاد کی بھی کمی نہ تھی حلقہ احباب بھی وسیع تھا۔ ان میں تکبر، غرور، بخل، دولت پرستی اور حرص عروج پر تھی کمزوروں پر ظلم کرنا ان کی عادت بن چکی تھی نرم مزاجی اور اخلاق سے نا آشنا انتہائی سخت دل لوگ تھے۔ قرآن نے ان لوگوں کے نام لیے بغیر ان کے کردار کا نقشہ بہت سی آیات میں یوں کھینچا ہے:

وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ ۝ الَّذِىْ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ ۝[3]

---

[1] محمد رسول اللہ قرآن اور تاریخ کے آئینہ میں، ص ۷۶

[2] محولہ بالا

[3] الھمزہ ۱۰۴: ۱، ۲

"ہر طعن آمیز اور چغل خور کے لیے تباہی ہے جو مال جمع کرتا اور اس کو گن گن کر رکھتا ہے۔"

وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِينٍ ۝ هَمَّازٍ مَّشَّاءٍ بِنَمِيمٍ ۝ مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ أَثِيمٍ ۝ عُتُلٍّ بَعْدَ ذَٰلِكَ زَنِيمٍ ۝ أَن كَانَ ذَا مَالٍ وَبَنِينَ ۝[1]

"کسی ایسے شخص کے کہنے میں نہ آ جانا جو بہت قسمیں کھانے والا ذلیل اوقات ہے طعن آمیز شرارتیں کرنے والا چغلیاں لیے پھرنے والا مال میں بخل کرنے والا حد سے بڑھا ہوا بدکار رخت خو اور اس کے علاوہ بدذات ہے اس سبب سے کہ مال اور بیٹے رکھتا ہے۔"

ان حالات میں جب نبی کریم ﷺ نے دعوت اسلام کی تحریک شروع کی تو اہل مکہ کے مذکورہ طبقہ کی طرف سے ردعمل اور مزاحمتی تدابیر اس طرح سے آئیں:

۱۔ استخفاف

نبی کریم ﷺ نے حکمت کے پیش نظر اپنی دعوت کو شروع میں خفیہ رکھا۔ اس زمانہ میں اہل مکہ کے برسراقتدار طبقہ نے اس تحریک کو قابل توجہ ہی نہ سمجھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ یہ چند نوجوانوں کا سر پھرا پن ہے الٹی سیدھی باتیں کرتے ہیں چار دن میں دماغوں سے یہ ہوا نکل جائے گی ہمارے سامنے کون دم مار سکتا ہے۔

اس طرح برسراقتدار طبقہ اپنے زعم قوت میں مگن رہا اور نبی کریم اپنی دعوت کو مسلسل آگے بڑھاتے رہے۔ آپ کو اپنے قرابت داروں کو انذار کا حکم ملا تو آپ نے ایک دعوت پر سب عزیزوں کو مدعو کر کے دعوت دین میں معاونت چاہی۔ صرف حضرت علی جو ابھی بچے تھے تعاون کے لیے کھڑے ہوئے تو اس موقع پر حاضرین میں خوب قہقہہ پڑا۔ گویا انہوں نے استخفاف کے طور پر قہقہہ لگاتے ہوئے کہا کہ یہ دعوت اور یہ داعی اور یہ معاون اور لبیک کہنے والا۔

کوہ صفا پر کھڑے ہو کر آپ نے پکار لگائی اور دعوت دی اور اللہ کے عذاب سے بچنے کی تاکید کی تو آپ کے چچا ابولہب نے توہین آمیز لہجے میں کہا:

"تو سارے دن غارت ہو تو نے ہمیں اسی لیے جمع کیا تھا۔ اس پر سورۃ تبت یدا ابی لھب نازل ہوئی"[2]

نبی کریم ﷺ اعلانیہ دعوت دین کا آغاز فرماتے ہیں اور بتوں سے بیزاری کا اعلان کرتے دکھلائی دیتے ہیں تو اب قریش مکہ آپؐ کے استخفاف کے لیے آپ کو نعوذ باللہ مجنوں کہتے ہیں:

وَقَالُوا يَا أَيُّهَا الَّذِي نُزِّلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ إِنَّكَ لَمَجْنُونٌ[3]

"اور ان کفار نے کہا کہ اے وہ شخص جس پر قرآن نازل ہوا تو یقیناً پاگل ہے۔"

---

[1] القلم ۶۸: ۱۰۔۱۳

[2] الجامع الصحیح للبخاری، کتاب التفسیر، تفسیر سورۃ تبت (۴۹۷۱) الکتب الستۃ ص ۴۳۱

[3] الحجر ۱۵: ۶

کبھی آپ ؐ پر جادوگر اور جھوٹے ہونے کا الزام لگایا جاتا:

وَعَجِبُوا أَن جَاءَهُم مُّنذِرٌ مِّنْهُمْ وَقَالَ الْكَافِرُونَ هَٰذَا سَاحِرٌ كَذَّابٌ[1]

''انہیں حیرت ہے کہ خود انہیں میں سے ایک ڈرانے والا آیا اور کافرین کہتے ہیں کہ یہ جادوگر ہے جھوٹا ہے۔''

کفار مکہ جب آپ ﷺ کو کسی جگہ تشریف فرما دیکھتے اور آپ کے ارد گرد کمزور اور مظلوم صحابہ کرام کا گروہ موجود پاتے تو استہزاء اور استخفاف کے طور پر یوں کہتے:

أَهَٰؤُلَاءِ مَنَّ اللَّهُ عَلَيْهِم مِّن بَيْنِنَا[2]

''اچھا یہی وہ حضرات ہیں جن پر اللہ نے ہمارے درمیان سے احسان فرمایا ہے۔''

قرآن نے مشرکین مکہ کے اس قبیح عمل کا نقشہ ذیل کی آیات میں وضاحت سے کھینچا ہے:

إِنَّ الَّذِينَ أَجْرَمُوا كَانُوا مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا يَضْحَكُونَ ○ وَإِذَا مَرُّوا بِهِمْ يَتَغَامَزُونَ ○ وَإِذَا انقَلَبُوا إِلَىٰ أَهْلِهِمُ انقَلَبُوا فَكِهِينَ ○ وَإِذَا رَأَوْهُمْ قَالُوا إِنَّ هَٰؤُلَاءِ لَضَالُّونَ ○ وَمَا أُرْسِلُوا عَلَيْهِمْ حَافِظِينَ ○[3]

''جو مجرم تھے وہ ایمان لانے والوں کا مذاق اڑاتے تھے اور جب ان کے پاس سے گزرتے تو آنکھیں مارتے تھے اور جب اپنے گھروں کو پلٹتے تو لطف اندوز ہوتے ہوئے پلٹتے تھے اور جب انہیں دیکھتے تو کہتے کہ یہی گمراہ ہیں، حالانکہ وہ ان پر نگران بنا کر نہیں بھیجے گئے تھے۔''

مشرکین مکہ نبی کریم ﷺ پر نازل ہونے والے قرآن کو پہلے لوگوں کے افسانے قرار دیتے اور کبھی ازراہ استخفاف کہتے یہ تو محض گھڑا ہوا جھوٹ ہے اور یہ کلام آپ کو کوئی شخص سکھاتا ہے۔ قرآن نے ان کے اس افترا اور استخفاف کو یوں بیان کیا ہے:

وَقَالُوا أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ اكْتَتَبَهَا فَهِيَ تُمْلَىٰ عَلَيْهِ بُكْرَةً وَأَصِيلًا ○[4]

''اور کہتے ہیں کہ پہلے لوگوں کی کہانیاں ہیں جن کو اس نے جمع کر رکھا ہے اور وہ صبح و شام اس کو پڑھ پڑھ کر سنائی جاتی ہیں۔''

إِنْ هَٰذَا إِلَّا إِفْكٌ افْتَرَاهُ وَأَعَانَهُ عَلَيْهِ قَوْمٌ آخَرُونَ[5]

''یہ محض جھوٹ ہے جسے اس نے گھڑ لیا ہے اور کچھ دوسرے لوگوں نے اس پر اس کی اعانت کی ہے۔''

---

[1] ص ۳:۳۸

[2] الانعام ۵۳:۶

[3] المطففین ۲۹:۸۳۔۳۳

[4] الفرقان ۵:۲۵

[5] الفرقان ۴:۲۵

آپ ﷺ کی شان کو گھٹانے کے لیے مشرکین مکہ نے آپ کا تعلق ایک بدنام زمانہ شخصیت ابی کبشہ سے جوڑنے کی بھونڈی کوشش کی۔ نعیم صدیقی لکھتے ہیں:

''دلائل کے مقابلے میں جب گالیاں لائی جارہی ہوں تو ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ دلائل تو اپنی جگہ جمے رہتے ہیں لیکن جو گالی مقابلے پر لائی جاتی ہے وہ جذباتی حد تک دو چار دن کام دے کر بالکل بے اثر ہو جاتی ہے اور انسانی فطرت اس سے نفور ہونے لگتی ہے اس لیے استادان فن کا یہ کلیہ ہے کہ نت نئی گالیاں ایجاد کرتے چلے جاؤ۔ چنانچہ نبی کریم ﷺ کے لیے ایک گالی اور وضع کی گئی آپؐ کو ابن ابی کبشہ کہا جاتا تھا۔ ابی کبشہ ایک معروف مگر بدنام شخصیت تھی یہ شخص تمام عرب کے دینی رجحانات کے خلاف شعری نامی ستارے کی پرستش کرتا تھا۔ ابن ابی کبشہ کے معنی ہوئے ابن کبشہ کا بیٹا یا ابی کبشہ کا پیرو (نعوذ باللہ) دل کا بخار نکالنے کے لیے مریضان جذباتیت نے کیا کیا ایجادیں نہیں کیں۔''[1]

نبی کریم کی دعوت مشرکین مکہ کی تحریک استخفاف کے باوجود ترقی کرتی رہی تو اب انہوں نے آپؐ کو شاعر اور کاہن کے طور پر پیش کرنا شروع کر دیا اور بطور استخفاف کہتے کہ جی کیا ہے، بس شاعری ہے۔ محمد درجہ اول کے آرٹسٹ اور لسان خطیب ہیں۔ ان کی شاعری کی وجہ سے کچھ زمین کے نوجوان بہک رہے ہیں۔[2]

مشرکین مکہ کبھی نبی کریم کا ناطہ کاہنوں سے جوڑتے ہوئے آپ کو کاہن قرار دیتے، کاہن کہنے سے قریش کا مدعا یہ ہوتا تھا کہ آنحضور نے بھی بس اسی طرح کا ایک ڈھکوسلا سا بنا رکھا ہے تاکہ لوگ آئیں، مریدیں ان پر کہانت کا سکہ بھی چلے اور پیٹ کا مسئلہ بھی حل ہو جائے۔[3]

قرآن نے ان کے ان دونوں الزاموں کی تردید کرتے ہوئے لوگوں کو غور و فکر کی دعوت بھی دی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ قَلِيلًا مَا تُؤْمِنُونَ O وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ قَلِيلًا مَا تَذَكَّرُونَ O[4]

''اور یہ کسی شاعر کا کلام نہیں مگر تم لوگ بہت ہی کم ایمان لاتے ہو اور نہ کسی کاہن کے حرفات ہیں لیکن تم لوگ بہت ہی کم کرتے ہو''

مشرکین مکہ نبی کریم ﷺ کی توہین اور خفت کرنے کا کوئی موقعہ ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے۔ آپ کے صاحبزادے عبداللہ کا انتقال ہوا تو عاص بن وائل السہمی نے آنحضور کی دعوت و تحریک کی تحقیر کرتے ہوئے یہ زہریلے کلمات کہے:

دعوہ فانما هو رجل ابتر لا عقب له لومات لانقطع ذکرہ واسترحتم منه

''یعنی یہ کہ کیا ہے میاں چھوڑ دو اسے اس کے حال پر وہ تو ایک لنڈ منڈ آدمی ہے۔ کوئی اس کے پیچھے

---

[1] محسن انسانیت، ص ۱۳۰

[2] ایضاً، ص ۱۳۲

[3] ایضاً، ص ۱۳۳

[4] الحاقہ ۶۹: ۴۱، ۴۲

رہنے والا نہیں اس کے مرتے ہی اس کی یاد تک فراموش ہو جائے گی اور تم اس کے جھنجھٹ سے نجات
پا کر امن چین سے رہنا۔[1]

آپ ﷺ کا چچا ابولہب بھی آپ کی تحقیر کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتا تھا۔ بعثت سے قبل ابولہب نے اپنے دو بیٹوں عتبہ اور عتیبہ کی شادی نبی کریم ﷺ کی دو صاحبزادیوں رقیہ اور ام کلثوم سے کی تھی لیکن بعثت کے بعد اس نے نہایت سختی اور درشتی سے ان دونوں کو طلاق دلوادی۔[2]

اسی طرح جب نبی ﷺ کے دوسرے صاحبزادے عبداللہ کا انتقال ہوا تو ابولہب کو اس قدر خوشی ہوئی کہ وہ دوڑتا ہوا اپنے رفقاء کے پاس پہنچا اور انہیں یہ "خوشخبری" سنائی کہ محمدؐ ابتر (نسل بریدہ) ہو گئے ہیں۔[3]

ترھیب وتشدد:

قریش مکہ جب استخفاف، استہزاء، القاب تراشی اور گالی گلوچ کے ذریعے نبی کریم ﷺ اور آپ کے جانثار صحابہ کو راہ حق سے روکنے میں ناکام رہے تو ان کا اگلا اقدام ترہیب وتشدد کی شکل میں سامنے آیا۔ تشدد کا معاملہ تو سب کے ساتھ ہوا البتہ غلام کنیزیں اور غریب الوطن لوگوں پر تو ظلم وستم کے پہاڑ توڑے گئے۔

علامہ شبلی لکھتے ہیں:

> "اسلام جب آہستہ آہستہ پھیلنا شروع ہوا اور رسول اللہ ﷺ اور اکابر صحابہ کو ان کے قبیلوں نے اپنے حصار حفاظت میں لے لیا تو قریش کا طیش وغضب ہر طرف سے سمٹ کر ان غریبوں پر ٹوٹا جن کا کوئی یار و مددگار نہ تھا ان میں کچھ غلام اور کنیزیں تھیں کچھ غریب الوطن تھے جو ایک دو پشت سے مکہ میں آ رہے تھے اور کچھ کمزور قبیلوں کے آدمی تھے جو کسی قسم کی عظمت واقتدار نہیں رکھتے تھے۔ قریش نے ان کو اس طرح ستانا شروع کیا کہ جور وستم کی تاریخ میں اس کی مثال پیدا کرنا قریش کی یکتائی کی تحقیر ہے۔"[4]

ابوجہل جب کسی معزز اور طاقتور آدمی کے مسلمان ہونے کی خبر سنتا تو اسے برا بھلا کہتا، ذلیل ورسوا کرتا اور مال وجاہ کو سخت خسارے سے دوچار کرنے کی دھمکیاں دیتا۔ اور اگر کوئی کمزور آدمی مسلمان ہوتا تو اسے مارتا اور دوسروں کو بھی برانگیختہ کرتا۔[5]

---

[1] تفہیم القرآن، ۶/ ۴۹۰
[2] ایضاً، ۶/ ۵۲۲
[3] ایضاً، ۶/ ۴۹۰
[4] سیرت النبی، ۱/ ۱۵۶، ۱۵۷
[5] سیرت ابن ہشام، ۱/ ۳۲۰

حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کا چچا انہیں کھجور کی چٹائی میں لپیٹ کر نیچے سے دھواں دیتا۔[1]

حضرت بلالؓ، امیہ بن خلف کے غلام تھے۔ امیہ ان کی گردن میں رسی ڈال کر لڑکوں کو دے دیتا تھا اور وہ انہیں مکے کے پہاڑوں میں گھماتے پھرتے تھے۔ یہاں تک کہ گردن پر رسی کا نشان پڑ جاتا تھا۔ خود امیہ بھی انہیں باندھ کر ڈنڈے سے مارتا تھا اور چلچلاتی دھوپ میں جبراً بٹھائے رکھتا تھا۔ کھانا پانی بھی نہ دیتا تھا اور اس سے کہیں بڑھ کر یہ ظلم کرتا تھا کہ جب دوپہر کی گرمی شباب پر ہوتی تو مکہ کے پتھریلے کنکروں پر لٹا کر سینے پر بھاری پتھر رکھوا دیتا۔ پھر کہتا خدا کی قسم تو اسی طرح پڑا رہے گا یہاں تک کہ مر جائے یا محمد ساتھ کفر کرے۔ بلال اس حالت میں بھی فرماتے: احد احد۔[2]

حضرت عمار ان کے والد یاسر ان کی والدہ سمیہ مسلمان ہو گئے تھے۔ ابوجہل نے انہیں گوناگوں عذاب پہنچائے۔ ایک دن نبی ﷺ نے انہیں عذاب سہتے دیکھا تو فرمایا:

اصبروا یا آل یاسر فان موعدکم الجنۃ۔

"یاسر والو صبر کرو تمہارا مقام جنت ہے"

کم بخت ابوجہل نے بی بی سمیہ کی اندام نہانی میں نیزہ مارا اور اسے جان سے مار ڈالا۔[3]

نبی کریم ﷺ اور اکابر صحابہ پر بھی تشدد کی بھونڈی مثالیں قائم ہوتی رہتی تھیں۔ ابن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کا چشم دید بیان ہے کہ ایک روز نبی ﷺ خانہ کعبہ میں نماز پڑھ رہے تھے۔ عقبہ بن ابی معیط آیا اس نے اپنی چادر کو لپیٹ دے کر رسی جیسا بنایا اور جب نبی ﷺ سجدہ میں گئے تو چادر کو حضور کی گردن میں ڈال دیا اور پیچ پر پیچ دینے شروع کیے۔ گردن مبارک بہت بھینچ گئی تھی۔ تاہم حضور اسی اطمینان قلب سے سجدہ میں پڑے ہوئے تھے۔ اتنے میں ابوبکر صدیق آئے انہوں نے دھکے دے کر عقبہ کو ہٹایا اور زبان سے یہ آیت بھی پڑھ کر سنائی:

أَتَقْتُلُونَ رَجُلًا أَن يَقُولَ رَبِّيَ اللَّهُ وَقَدْ جَاءَكُم بِالْبَيِّنَاتِ

"کیا تم ایک بزرگ کو مارتے ہو اور صرف اس جرم میں کہ وہ اللہ کو اپنا پروردگار کہتا ہے اور تمہارے پاس روشن دلائل بھی لے کر آیا ہے۔"[4]

حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کی ماں کو ان کے اسلام لانے کا علم ہوا تو ان کا دانہ پانی بند کر دیا اور انہیں گھر سے نکال دیا۔ یہ بڑے ناز ونعمت میں پلے تھے۔ حالات کی شدت سے دوچار ہوئے تو کھال اس طرح ادھڑ گئی جیسے سانپ کچلی چھوڑتا ہے۔[5]

قبیلہ بنی عدی کے ایک خانوادے بنی مؤمل کی ایک لونڈی مسلمان ہوئیں تو انہیں حضرت عمر بن خطاب، جو بنی عدی سے تعلق

---

۱ رحمۃ اللعالمین، ۱/۵۵

۲ ایضاً، ۱/ ۵۷

۳ ایضاً، ۱/ ۵۵

۴ الجامع الصحیح للبخاری، کتاب مناقب الانصار، باب مالقی النبی واصحابہ من المشرکین بمکۃ (۳۸۵۶) الکتب الستۃ، ص ۳۱۳

۵ رحمۃ اللعالمین، ۱/ ۵۷

رکھتے تھے اور ابھی مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ اس قدر مارتے تھے کہ مارتے مارتے خود تھک جاتے تھے اور اس کے بعد کہتے تھے کہ میں نے تجھے (کسی مروت کی وجہ سے نہیں بلکہ محض) تھک جانے کی وجہ سے چھوڑا ہے۔[۱]

حضرت ابوذر غفاری نے اسلام قبول کیا تو کعبہ میں با آواز بلند کلمہ شہادت پڑھنے کے جرم میں قریش نے کہا: اس بے دین کو مارو۔ لوگوں نے مار ڈالنے کے لیے مارنا شروع کیا۔ حضرت عباسؓ آئے اور انہوں نے انہیں جھک کر دیکھا تو کہا کہ کم بختو یہ قبیلہ غفار کا آدمی ہے جہاں تم تجارت کے لیے جاتے ہو اور کھجوریں لاتے ہو۔ لوگ ہٹ گئے۔ اگلے دن انہوں نے پھر سب کو سنا کر کلمہ پڑھا پھر لوگوں نے مارا اور حضرت عباسؓ نے ان کو چھڑا دیا اور یہ اپنے وطن چلے آئے۔[۲]

ترہیب و تشدد ہی کی ایک صورت آپ ﷺ کا مقاطعہ تھا۔ تمام قبائل نے باہم مشورہ سے یہ ترکیب سوچی کہ نبی کریم ﷺ اور آپ کے پورے خاندان کو جنہوں نے آپ کی حفاظت کا ابو طالب سے عہد کیا تھا انہیں محصور کر کے تباہ کر دیا جائے اور ان کا ہر طرح سے بائیکاٹ کر دیا جائے تاکہ کوئی چیز ان تک نہ پہنچ سکے۔

اس باہمی عہد کی مضبوطی کے لیے تمام قبائل عرب نے ایک معاہدہ مرتب کیا اور سب لوگوں نے اس کا اقرار کیا کہ خاندان بنو ہاشم سے نہ شادی بیاہ کریں گے نہ ان کے ہاتھ خرید و فروخت کریں گے نہ ان سے کسی قسم کا میل جول رکھیں گے۔ یہ معاہدہ مرتب ہو گیا تو مزید استحکام کے لیے اس کو خانہ کعبہ کے اندر لٹکا دیا گیا تاکہ اس معاہدے کے خلاف کوئی شخص بات نہ کر سکے۔

اس معاہدے کے نتیجے میں بنو ہاشم مجبور ہو گئے کہ وہ مکہ چھوڑ دیں۔ چنانچہ یکم محرم سنہ ۷ نبوی کی شب کو تمام خاندان بنی ہاشم کو ساتھ لے کر جناب ابو طالب شعب ابی طالب میں جا کر محصور ہو گئے۔[۳]

اس طرح قریش نے رسول اللہ ﷺ کے دعوتی مشن کو مقامی حیثیت سے بند کر دیا تھا۔ سنہ ۱۰ نبوی میں یہ محاصرہ ٹوٹا اور قید و بند سے رہائی ملی۔[۴]

مذکورہ محاصرہ ترہیب کی بدترین مثال تھا لیکن دعوت دین کے داعی نے اس سب کو برداشت کیا اور دعوت کا کام جاری رکھا۔

ترغیب:

حضرت عمر اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہما کے قبول اسلام کے بعد جب تحریک اسلامی کو ایک نئی قوت ملی تو کفار مکہ نے نبی کریم ﷺ اور آپ کے صحابہ کو دعوت دین سے پھیرنے کے لیے ترغیب کی ترکیب بھی استعمال کی۔ ذیل میں اس کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

ابن اسحاق نے یزید بن زیاد کے واسطے سے محمد بن کعب قرظی کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ مجھے بتایا گیا کہ عتبہ بن ربیعہ نے جو سردار قوم تھا ایک روز قریش کی محفل میں کہا۔ اور اس وقت رسول اللہ ﷺ مسجد حرام میں ایک جگہ تن تنہا تشریف فرما تھے کہ قریش کے لوگو کیوں نہ

---

[۱] رحمۃ اللعالمین، ۱/ ۵۷۔ ابن ہشام، ۱/ ۳۶۹

[۲] الجامع الصحیح للبخاری، کتاب مناقب الانصار، باب اسلام ابی ذر الغفاری رضی اللہ عنہ (۳۸۶۱) الکتب الستۃ، ص ۳۱۳

[۳] طبقات ابن سعد، ۱/ ۲۰۹

[۴] ایضاً، ۱/ ۲۱۰

میں محمد کے پاس جا کر ان سے گفتگو کروں اور ان کے سامنے چند امور پیش کروں، ہو سکتا ہے وہ کوئی چیز قبول کرلیں اور اسے دے کر ہم انہیں اپنے آپ سے باز رکھیں گے۔

مشرکین نے کہا ابوالولید جائیے اور ان سے بات کیجیے۔ اس کے بعد عتبہ اٹھا اور رسول اللہ ﷺ کے پاس جا کر ایسے ہم کلام ہوا: بھتیجے! ہماری قوم میں تمہارا جو مرتبہ و مقام ہے اور جو بلند پایہ نسب ہے وہ تمہیں معلوم ہی ہے۔ اور اب تم اپنی قوم میں ایک بڑا معاملہ لے کر آئے ہو جس کی وجہ سے تم نے ان کی جماعت میں تفرقہ ڈال دیا ہے اور ان کی عقلوں کو حماقت سے دوچار کر دیا۔ ان کے معبودوں اور ان کے دین کی عیب چینی کی اور ان کے آباؤ اجداد کو کافر ٹھہرایا ہے۔ لہٰذا میری بات غور سے سنو میں تم پر چند چیزیں پیش کر رہا ہوں۔ ان پر غور کرو اور کوئی بات قبول کرلو۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہو میں سنوں گا۔ ابوالولید نے کہا:

بھتیجے یہ معاملہ جسے تم لے کر آئے ہو اگر اس سے تم یہ چاہتے ہو کہ مال حاصل کرو تو ہم تمہارے لیے اتنا مال جمع کیے دیتے ہیں کہ تم ہم میں سب سے زیادہ مالدار ہو جاؤ اور اگر تم یہ چاہتے ہو کہ اعزاز و مرتبہ حاصل کرو تو ہم تمہیں اپنا سردار بنائے لیتے ہیں یہاں تک کہ تمہارے بغیر کسی معاملہ کا فیصلہ نہ کریں گے اور اگر تم چاہتے ہو کہ بادشاہ بن جاؤ تو ہم تمہیں اپنا بادشاہ بنائے لیتے ہیں اور اگر یہ جو تمہارے پاس آتا ہے کوئی جن بھوت ہے جسے تم دیکھتے ہو لیکن اپنے آپ سے دفع نہیں کر سکتے تو ہم تمہارے لیے اس کا علاج تلاش کیے دیتے ہیں[۱]

حضور ﷺ نے عتبہ کی پیش کش مسترد کرتے ہوئے اس کے سامنے اپنی دعوت کی وضاحت کی تو عتبہ آپ کے پاس سے اثر لے کر واپس ہوا۔

اس کے بعد قریش نے یہ کوشش شروع کی کہ کسی طرح اسلام اور جاہلیت میں کچھ لو اور کچھ دو کی بنیاد پر سمجھوتا ہو جائے تاکہ اسلام اور جاہلیت بیچ راستے میں ایک دوسرے سے جا ملیں۔ چنانچہ قریش نے کہنا شروع کر دیا کہ کچھ چیزیں مشرکین چھوڑ دیں اور کچھ چیزیں نبی کریم ﷺ چھوڑ دیں۔ اس چیز کی تجویز بھی باقاعدہ آپ کے سامنے رکھی گئی۔

ابن جریر اور طبرانی کی ایک روایت ہے کہ مشرکین نے رسول اللہ ﷺ کو یہ تجویز پیش کی کہ ایک سال آپ ان کے معبودوں کی پوجا کیا کریں اور ایک سال وہ آپ کے رب کی عبادت کیا کریں گے۔ عبد بن حمید کی ایک روایت اس طرح ہے کہ مشرکین نے کہا اگر آپ ہمارے معبودوں کو قبول کرلیں تو ہم بھی آپ کے خدا کی عبادت کریں گے۔[۲]

اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے رد میں سورۃ قل یاایھا الکفرون نازل فرمائی جس میں اعلان کیا گیا کہ جسے تم پوجتے ہو اسے میں نہیں پوج سکتا۔[۳]

مشرکین مکہ نے آپ کے سامنے یہ مطالبہ بھی رکھا کہ اگر آپ اپنے حلقے سے ہمارے معاشرے کے گھٹیا لوگوں اور ہمارے غلاموں کو نکال دیں تو ہم آپ کے پاس آ بیٹھیں اور آپ کی تعلیمات سنیں جبکہ مقصود ان کا یہ تھا کہ جو لوگ پیغمبر علیہ السلام کے لیے

---

[۱] سیرت ابن ہشام، ۱/ ۲۹۳

[۲] الشوکانی محمد بن علی، فتح القدیر، مصطفیٰ البابی الحلبی واولادہ لمصر ۱۳۵۰ھ، ۵/ ۵۰۸

[۳] سیرت ابن ہشام، ۱/ ۳۶۲

اور آپ کے مقدس مشن کے لیے اپنی زندگی تک کو داؤ پر لگائے بیٹھے ہیں ان کی حوصلہ شکنی ہو۔ آپ ﷺ پر ان کی اس پیش کش کا اثر ہونے سے پہلے ہی اللہ تعالیٰ کی طرف سے راہنمائی یوں آتی ہے:

وَلَا تَطْرُدِ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُم بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيدُونَ وَجْهَهُ[1]

"اور آپ ان ساتھیوں کو معاندین کی خوشنودی کے لیے اپنے قرب سے ہرگز محروم نہ کریں۔"

لوگوں کو آپ ﷺ کی باتوں اور محفل سے دور رکھنے کے لیے نضر بن حارث نے کچھ گھٹیا اور اوچھے طریقے بھی اپنائے۔ اس نے حیرہ جا کر رستم اور اسفند یار کے قصے سیکھے اور واپس آ کر لوگوں کو آپ کی مجلس کے بعد یہ قصے سنا کر دعوت اسلامی کی راہ سے ہٹانے کی اور بہکانے کی کوشش کرتا تھا۔ جب آپ ﷺ کسی جگہ بیٹھ کر اللہ کی باتیں کرتے اور اس کی گرفت سے لوگوں کو ڈراتے تو آپ کے بعد یہ شخص وہاں پہنچ جاتا اور کہتا کہ بخدا محمد کی باتیں مجھ سے بہتر نہیں! اس کے بعد وہ فارس کے بادشاہوں اور رستم و اسفند یار کے قصے سناتا پھر کہتا آخر کس بناء پر محمد کی بات مجھ سے بہتر ہے؟[2]

ابن عباس کی روایت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ نضر نے چند لونڈیاں خرید رکھی تھیں اور جب وہ کسی آدمی کے متعلق سنتا کہ وہ نبی کریم ﷺ کی طرف مائل ہے تو اس پر ایک لونڈی مسلط کر دیتا جو اسے کھلاتی پلاتی اور گانے سناتی یہاں تک کہ اسلام کی طرف اس کا جھکاؤ باقی نہ رہ جاتا اسی سلسلے میں یہ ارشاد الٰہی نازل ہوا:

وَمِنَ النَّاسِ مَن يَشْتَرِي لَهْوَ الْحَدِيثِ لِيُضِلَّ عَن سَبِيلِ اللَّهِ[3]

"کچھ لوگ ایسے ہیں جو کھیل کی بات خریدتے ہیں تاکہ اللہ کی راہ سے بھٹکا دیں۔"[4]

مشرکین مکہ کی تمام ترغیبات کے باوجود دعوت اسلام نبی کریم ﷺ کی سرکردگی میں مسلسل برگ و بار لاتی ہوئی آگے بڑھتی رہی۔

کفار مکہ کی طرف سے سفارتی مہمات اور معاہدات کی پیش کش:

نبی کریم ﷺ نے جب اللہ تعالیٰ کے حکم فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ کی تعمیل میں اعلانیہ دعوت کا کام شروع کیا اور مشرکین کے غلط عقائد کی دلائل سے تردید شروع کی تو کفار مکہ کو اپنا دنیاوی مرتبہ اور مذہبی اجارہ داری جاتی نظر آنے لگی تو انہوں نے اس تحریک کو روکنے کے لیے تشدد کی راہ اختیار کی۔ آپ ﷺ کو ابو طالب کی تائید حاصل تھی اس لیے آپ کے علاوہ کمزور اور غریب طبقہ کے مسلمانوں پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے گئے غلاموں کو اذیت کا تختہ مشق بنایا گیا۔ اشراف قریش میں سے جو مسلمان ہوئے ان کو ان کے گھر والوں نے ہی اتنی اذیتیں دینا شروع کیں کہ ان کی زندگی دوبھر ہو گئی۔ آخر کار سنہ ۵ نبوی میں نبی کریم ﷺ نے مسلمانوں کو

---

[1] الانعام ۶: ۵۲

[2] سیرت ابن ہشام، ۱/ ۲۹۹، ۳۰۰، ۳۸۵

[3] سورۃ لقمان ۳۱: ۶

[4] فتح القدیر للشوکانی، ۴/ ۲۳۶

مشورہ دیا کہ اپنے دین پر قائم رہنے کے لیے مناسب یہی ہے کہ حبش کو ہجرت کر جائیں۔ قریش مکہ نے حبشہ تک مسلمانوں کا تعاقب کیا اور انہیں پریشان کرنے کی کوششیں کیں۔ سنہ ۹ نبوی میں جب قریش مکہ نے محسوس کیا کہ انکی تمام کوششیں دعوت اسلام کی اشاعت اور تبلیغ کو روکنے میں کارگر ثابت نہیں ہو رہیں تو انہوں نے نبی کریم ﷺ کا راستہ روکنے کے لیے سفارتی مہمات اور معاہدات کا سہارا لینا شروع کیا۔

پہلی سفارتی مہم/شکایتی وفد

ابن اسحاق کہتے ہیں کہ اشراف قریش سے چند آدمی ابو طالب کے پاس گئے اور بولے اے ابو طالب آپ کے بھتیجے نے ہمارے خداؤں کو برا بھلا کہا ہے۔ ہمارے دین کی عیب چینی کی ہے۔ ہماری عقلوں کو حماقت زدہ کہا ہے اور ہمارے باپ دادا کو گمراہ قرار دیا ہے۔ لہذا یا تو آپ انہیں روک دیں یا ہمارے اور ان کے درمیان سے ہٹ جائیں۔ کیونکہ آپ بھی ہماری ہی طرح ان سے مخلف دین پر ہیں ہم ان کے معاملے میں آپ کے لیے بھی کافی رہیں گے۔ اس کے جواب میں ابو طالب نے نرم بات کہی اور رازدارانہ لب ولہجہ اختیار کیا۔ چنانچہ وہ واپس چلے گئے[1]

نبی کریم ﷺ نے دعوت دین کا کام اپنے طریقے کے مطابق جاری رکھا اور اسلام کے پیروکاروں میں اضافہ جاری رہا تو مذکورہ سفارت پھر آئی اس پر بھی عالمی مشن کی دعوت بند نہ ہوئی تو تیسری مرتبہ قریش کی سفارت بہت سخت لہجہ اور چیلنج دینے کے لیے آئی۔

تیسری سفارت مہم:

ایک وفد نے حضرت ابو طالب کو چیلنج دیا کہ اپنے بھتیجے کو یا تو بتوں کی مذمت سے روکے یا پھر اپنی حمایت سے نکال دے۔[2] اس مرتبہ ان کے غم وغصہ کا پارہ اتنا شدید اور اونچا تھا کہ وہ چیلنج دے کر چلتے بنے اور کوئی وضاحت یا جواب سننا بھی پسند نہ کیا۔ ابو طالب نے اس سفارتی وفد کے تیور دیکھ کر اندازہ کر لیا کہ اب قریش مزید صبر نہ کر سکیں گے اور صورت حال انتہائی نازک اور سنگین ہو چکی ہے۔ اور انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ تنہا قریش کا مقابلہ کرنا ناممکن ہے۔ اس لیے شفیق چچا نے نبی کریم ﷺ کو بلا کر کہا بھتیجے مجھ پر اتنا بوجھ نہ ڈالو جو میں اٹھا نہ سکوں۔ نبی کریم ﷺ نے جان لیا کہ چچا ابو طالب حمایت سے عاجز ہوتے نظر آ رہے ہیں تو نہایت پیغمبرانہ عزم وثبات اور اطمینان قلب کے ساتھ جواب دیا:

> واللہ لو وضعوا الشمس فی یمینی والقمر فی یساری علی ان اترک ھذا الامر
> حتی یظھرہ اللہ او اھلک فیہ ما ترکتہ۔[3]
>
> ''اللہ کی قسم اگر یہ لوگ میرے داہنے ہاتھ میں سورج اور بائیں ہاتھ میں چاند بھی لا کر رکھ دیں تو میں
> اپنے فریضے سے باز نہیں آ سکتا یہاں تک کہ اللہ اس کو غالب کر دے یا میں اس میں ختم ہو جاؤں۔''

---

[1] سیرت ابن ہشام، ۱/ ۲۸۲

[2] عیون الاثر، ۱/ ۹۹

[3] سیرت ابن ہشام، ۱/ ۲۸۵

نبی کریم ﷺ نے مزید فرمایا اے میرے چچا اگر آپ میری حمایت نہیں کر سکتے تو بھی پرواہ نہیں میں خدا کے حکم سے یہ کام انجام دے رہا ہوں اور اسی کی حفاظت میرے لیے کافی ہے۔ اس بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کو اپنے دعوتی مشن سے کس قدر لگاؤ تھا اور دشمنوں کی پرواہ کیے بغیر آپ اپنے مشن میں مگن رہتے تھے۔

سنجیدہ سفارتی مہم:

ایک اور موقعہ پر ابولید عتبہ نامی ایک انتہائی سنجیدہ مزاج قریشی نے ڈپلومیٹک انداز میں تنہا آ کر آپ سے بحث کی اور پوچھا کہ آپ کا تبلیغ سے منشا کیا ہے؟ دولت چاہتے ہو، خوبصورت بیویاں مطلوب ہیں یا پھر شہر کی سرداری چاہتے ہو ہم ہر چیز کے لیے آمادہ ہیں[1]۔ صرف ہمارے دیوتاؤں کی مذمت سے باز آ جاؤ اور ان کی پوجا کرنے والوں کے دوزخی ہونے کے اعلان سے دست بردار ہو جاؤ۔

اس کے جواب میں رسول اللہ ﷺ نے سورہ حم السجدہ کی ابتدائی آیات تلاوت فرمانا شروع کیں ان میں خدا کے عذاب سے ڈرایا گیا تھا۔ عتبہ اس قدر متاثر ہوا کہ اسے خوف ہوا کہ کہیں وہ دھمکی اسی لمحے پوری ہو کر خدا کا عذاب نہ نازل ہو جائے۔ اس نے قسمیں دیں کہ محمد اب مزید تلاوت نہ فرمائیں اور وہاں سے خاموش چلا گیا[2]۔

نبی کریم ﷺ کے مبارک مشن میں اس قدر سچائی اور حقیقت پسندی غالب ہوتی تھی کہ اس کے سامنے کسی کا مکر و فریب ٹھہر نہیں سکتا تھا اور سننے والا حق سمجھنے پر مجبور ہو جاتا تھا۔ نبی کریم کی بات مخاطب کی ذہنی سطح کے مطابق ہوتی تھی۔ اس میں بے جا منطقی موشگافیاں نہ ہوتی تھیں بلکہ دوٹوک بات ہوتی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ حضور ﷺ کا اپنا کردار اور سیرت مطہرہ جس کا اثر ایک ایک ادا سے ظاہر ہوتا تھا، اخلاص، بے لوثی اور اقدار عالیہ سے وابستگی اس کے علاوہ تھی۔ اللہ تعالیٰ کا بھی فرمان ہے:

وَقُل لَّهُمْ فِي أَنفُسِهِمْ قَوْلًا بَلِيغًا[3]

''اور ان سے ایسی بات کرو جو دل میں اتر جائے۔''

قریشی وفد کی ابوطالب کو ایک انوکھی پیش کش:

قریش کی ابوطالب کو دی جانے والی دھمکی کے باوجود بھی جب نبی کریم نے اپنا مشن جاری رکھا تو قریش نے جان لیا کہ ابوطالب نبی کریم کو چھوڑنے پر تیار نہیں ہیں تو وہ لوگ ولید بن مغیرہ کے لڑکے عمارہ کو ہمراہ لے کر ابوطالب کے پاس پہنچے اور یوں عرض کی: اے ابوطالب یہ قریش کا سب سے بانکا اور خوبصورت نوجوان ہے۔ آپ اسے لے لیں اس کی دیت اور نصرت کے آپ حق دار ہوں گے آپ اسے اپنا لڑکا بنا لیں یہ آپ کا ہوگا اور آپ اپنے بھتیجے کو ہمارے حوالے کر دیں۔ جس نے آپ کے آباء واجداد کے دین کی

---

[1] سیرت ابن ہشام، ۱/ ۳۱۶

[2] عیون الاثر، ۱/ ۱۰۶

[3] النساء۴: ۶۳

مخالفت کی ہے آپ کی قوم کا شیرازہ منتشر کر رکھا ہے اوران کی عقلوں کو حماقت سے دوچار بتلایا ہے ہم اسے قتل کریں گے۔ بس یہ ایک آدمی کے بدلے ایک آدمی کا حساب ہے۔

ابوطالب نے کہا خدا کی قسم کتنا برا سودا ہے جو تم لوگ مجھ سے کر رہے ہو۔ تم اپنا بیٹا مجھے دیتے ہو کہ میں اسے کھلاؤں پلاؤں پالوں پوسوں اور میرا بیٹا مجھ سے طلب کرتے ہو کہ اسے قتل کر دو۔ خدا کی قسم یہ نہیں ہو سکتا۔[1]

مشترکہ عبادت کے لیے معاہدے کی پیش کش:

مشرکین مکہ کی ساری تدبیریں رائیگاں گئیں تو انہوں نے مشترکہ عبادت کا معاہدہ پیش کر دیا۔ ابن اسحاق کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ خانہ کعبہ کا طواف کر رہے تھے کہ اسود بن مطلب، ولید بن مغیرہ، امیہ بن خلف اور عاص بن وائل سہمی آپ کے سامنے آئے یہ سب اپنی قوم کے بڑے لوگ تھے بولے اے محمد آؤ جسے تم پوجتے ہو اسے ہم بھی پوجیں اور جسے ہم پوجتے ہیں اسے تم بھی پوجو۔ اس طرح ہم اور تم اس کام میں مشترک ہو جائیں۔ اب اگر تمہارا معبود ہمارے معبود سے بہتر ہے تو ہم اس سے اپنا حصہ حاصل کر چکے ہوں گے اور اگر ہمارا معبود تمہارے معبود سے بہتر ہوا تو تم اس سے اپنا حصہ حاصل کر چکے ہو گے اس پر اللہ تعالیٰ نے پوری سورہ قل یایھا الکافرون نازل فرمائی جس میں اعلان کیا گیا کہ جسے تم لوگ پوجتے ہو اسے میں نہیں پوج سکتا۔[2]

ابوطالب کی وفات سے قبل معاہدہ کی پیش کش:

ایک ظالمانہ اور یک طرفہ معاہدہ کی بدولت شعب ابی طالب میں تین سال تک محصور و مجبور رہنے کے بعد جب نبی کریم ﷺ اور آل ہاشم باہر آئے تو نبی کریم نے اپنی دعوت کا کام زور و شور سے شروع کر دیا۔ اب مشرکین مکہ اگر چہ بائیکاٹ ختم کر چکے تھے لیکن پھر بھی دباؤ ڈالنے اور اللہ کی راہ سے روکنے کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے تھے۔ اسی دوران ابوطالب کی صحت بہت بگڑ گئی تو قریش مکہ کو فکر لاحق ہوئی کہ اگر انہوں نے ابوطالب کی موت کے بعد کوئی انتہائی قدم اٹھایا تو لوگ طعنہ دیں گے کہ ابوطالب کی موجودگی میں ان کے بھتیجے کا کچھ نہ بگاڑ سکے ان کی موت کے بعد زیادتی پر اتر آئے ہیں۔ چنانچہ قریش مکہ نے ابوطالب سے معاہدہ کرنے کا ارادہ کیا اور اس مرتبہ وہ کچھ ایسی رعایتیں بھی دینے کے لیے تیار ہو گئے جس پر اب تک راضی نہ تھے۔ بہر حال قریش کا وفد جس کی کل تعداد تقریباً پچیس تھی جن میں قریش کے معزز ترین آدمی یعنی عتبہ بن ربیعہ، شیبہ بن ربیعہ، ابوجہل بن ہشام، امیہ بن خلف، ابوسفیان اور دیگر اشراف شامل تھے، انہوں نے کہا: اے ابوطالب ہم آپ کے مرتبے اور مقام کو مدنظر رکھتے ہوئے اور آپ کی موجودہ حالت کے اندیشے (یعنی آخری ایام زندگی) کی بنا پر چاہتے ہیں کہ آپ اپنے بھتیجے کو بلائیں اور پھر ان کے بارے میں ہم سے اور ہمارے بارے میں ان سے عہد و پیمان لے لیں یعنی وہ ہم سے دستکش رہیں اور ہم ان سے دستکش رہیں۔ وہ ہم کو ہمارے دین پر چھوڑ دیں اور ہم ان کو ان کے دین پر چھوڑ دیں۔

---

[1] سیرت ابن ہشام، ۱/ ۲۶۶، ۲۶۷

[2] ایضاً، ۱/ ۳۶۲

ابوطالب نے نبی کریم ﷺ کو بلوایا اور ان لوگوں کی پیش کش ذکر کی۔ جواب میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا میں ان کے سامنے صرف ایک بات رکھتا ہوں۔ اگر یہ لوگ اسے مان لیں تو پورا عرب ان کا تابع فرمان ہو جائے گا اور عجم پر بھی ان کی بادشاہت قائم ہو جائے گی۔ اس پر وہ لوگ کسی قدر توقف میں پڑ گئے اور سوچنے لگے کہ اسے کیسے مسترد کریں۔ ابوجہل نے کہا اچھا بتلاؤ وہ بات کیا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا آپ لا الہ الا اللہ کہیں اس پر انہوں نے تالیاں بجا بجا کر کہا کہ سارے خداؤں کی جگہ صرف ایک خدا؟ تمہارا معاملہ بڑا عجیب ہے۔ پھر باہم ہم کلام ہوئے کہ چلو یہ شخص تمہاری کوئی بات ماننے کو تیار نہیں لہٰذا اپنے دین پر ڈٹے رہو۔

قرآن ان لوگوں کے بارے میں یوں گویا ہوا:

أَجَعَلَ الْآلِهَةَ إِلَٰهًا وَاحِدًا إِنَّ هَٰذَا لَشَيْءٌ عُجَابٌ ○ وَانطَلَقَ الْمَلَأُ مِنْهُمْ أَنِ امْشُوا وَاصْبِرُوا عَلَىٰ آلِهَتِكُمْ إِنَّ هَٰذَا لَشَيْءٌ يُرَادُ ○ مَا سَمِعْنَا بِهَٰذَا فِي الْمِلَّةِ الْآخِرَةِ إِنْ هَٰذَا إِلَّا اخْتِلَاقٌ ○[1]

''کیا اس نے سارے معبودوں کی جگہ بس ایک ہی معبود بنا ڈالا۔ یہ تو بڑی عجیب بات ہے اور ان کے بڑے یہ کہتے ہوئے نکلے کہ چلو اور اپنے معبودوں پر ڈٹے رہو یہ ایک سوچی سمجھی اسکیم ہے ہم نے کسی اور ملت میں یہ بات نہیں سنی یہ محض گھڑنت ہے۔''[2]

نبی کریم ﷺ نے مذکورہ تمام سفارتی مہمات اور معاہدات کی پیش کش کے مقابلے میں جس ہمت جوانمردی اور عزم و استقلال کا مظاہرہ فرمایا وہ آپ کی کمال دینی حمیت اور پیغمبرانہ غیرت کی اعلیٰ ترین مثال ہے۔ آپ نے اللہ تعالیٰ کے سچے دین کے مقابلے میں ہر قسم کی پیش کش کو ٹھکرا دیا اور اس سلسلے میں ہونے والے ہر قسم کے تشدد اور دکھ کو خندہ پیشانی اور عظیم حوصلے کے ساتھ برداشت کر کے قیامت تک ہر اس شخص کے لیے جو دین متین کی دعوت کے لیے کام کرنا چاہے گا ایک اعلیٰ مثال قائم کی۔ جس کا اعتراف قرآن یوں کرتا ہے:

إِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ[3]

''بے شک آپ اخلاق کے اعلیٰ مراتب پر فائز ہیں۔''

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ[4]

''تمہارے لیے رسول اللہ ﷺ کی زندگی بہترین نمونہ ہے۔''

---

[1] ص:۵۔۷

[2] سیرت ابن ہشام، ۱/ ۴۱۷۔۴۱۹

[3] سورۃ القلم ۶۸: ۴

[4] سورۃ الاحزاب ۳۳: ۲۱

باب چہارم

ریاست مدینہ میں غیر مسلموں سے تعلقات و معاہدات

فصل اول

مدینہ کے غیر مسلموں کا عمومی رویہ

۱۔ یہود ۲۔ نصاریٰ

۳۔ منافقین

فصل دوم

مدنی دور کے معاہدات اور ان کی معاشرتی و سیاسی اہمیت

۱۔ عقد مواخات
۲۔ میثاق مدینہ
۳۔ قبیلہ جہینہ سے معاہدہ
۴۔ بنو ضمرہ سے معاہدہ
۵۔ معاہدہ بواط
۶۔ بنی زرعہ اور بنی ربعہ سے معاہدہ
۷۔ معاہدہ بنی مدلج
۸۔ معاہدہ بنو ضخار
۹۔ معاہدہ اشجع
۱۰۔ معاہدات حدیبیہ
۱۱۔ معاہدات بنو عریض و بنو غازیہ
۱۲۔ خیبر کا معاہدہ
۱۳۔ تبوک کا معاہدہ
۱۴۔ معاہدہ فدک
۱۵۔ معاہدہ تیماء
۱۶۔ معاہدہ جرباء اور اذرح
۱۷۔ سینٹ کیتھرائن سے معاہدہ
۱۸۔ معاہدہ ایلہ
۱۹۔ معاہدہ مقنا
۲۰۔ معاہدہ نجران

فصل سوم

غیر مسلموں کی عہد شکنی اور اس کے نتائج

۱۔ بنو قینقاع کی عہد شکنی
۲۔ بنو نضیر کی عہد شکنی
۳۔ بنو قریظہ کی عہد شکنی
۴۔ یہود خیبر کی عہد شکنی
۵۔ قریش مکہ اور بنو بکر کی عہد شکنی

فصل اول

مدینہ کے غیر مسلموں کا عمومی رویہ:

پیغمبر اسلام حضرت محمد ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا سامنا مکہ میں صرف ایک قوم قریش سے تھا جن کا مذہب بت پرستی تھا۔ اس کے برعکس مدینہ میں آپ ﷺ اور آپ کے ساتھیوں کا پالا بیک وقت چار قسم کے دشمنوں سے تھا۔ یہاں بت پرست و مشرکین بھی تھے اور یہودی بھی اور کم تعداد میں عیسائی بھی۔ پھر بت پرست مشرکین میں سے ایک بہت خطرناک اور مار آستین منافقین کا گروہ بھی وجود میں آچکا تھا۔

بت پرست مشرکین جو مدینے کے اصل باشندے تھے انہیں مسلمانوں پر کوئی بالادستی حاصل نہ تھی۔ کچھ مشرکین شک وشبہ میں مبتلا تھے۔ اور اپنے آبائی دین کو چھوڑنے میں تردد محسوس کر رہے تھے لیکن اسلام اور مسلمانوں کے خلاف اپنے دل میں کوئی عداوت اور داؤ گھاؤ نہیں رکھ رہے تھے اس طرح کے لوگ تھوڑے ہی عرصے بعد مسلمان ہو گئے اور خالص اور پکے مسلمان ہوئے۔[۱]

اسلام اور اہل اسلام کے خلاف یہود و نصاریٰ اور کچھ مشرکین جو مسلمانوں کے خلاف سخت کینہ اور عداوت چھپائے ہوئے تھے یعنی منافقین منفی رویہ رکھتے تھے۔ مدینہ کے ان غیر مسلموں کا عمومی رویہ جاننے کے لیے ہر ایک کا ذکر ذیل میں کیا جاتا ہے:

ا۔ یہود:

یہ لوگ اشوری اور رومی ظلم و جبر سے بھاگ کر حجاز میں پناہ گزیں ہو گئے تھے یہ درحقیقت عبرانی تھے لیکن حجاز میں پناہ گزین ہونے کے بعد ان کی وضع قطع، زبان اور تہذیب وغیرہ بالکل عربی رنگ میں رنگ گئی تھی یہاں تک کہ ان کے قبیلوں اور افراد کے نام بھی عربی ہو گئے تھے اور ان کے اور عربوں کے آپس میں شادی بیاہ کے رشتے بھی قائم ہو گئے تھے لیکن ان سب کے باوجود ان کی نسلی عصبیت برقرار تھی۔[۲]

یہود فخر اور بڑائی کے مرض میں مبتلا ہو چکے تھے یہ اپنے سوا دوسری قوموں کو بہت حقیر قرار دیتے تھے اور ان کا یہ مرض یہاں تک بڑھ چکا تھا کہ عربوں کے لیے امی کا لفظ استعمال کرتے تھے اور ان کے مال کو اپنے لیے ہر حال میں جائز سمجھتے تھے جیسا کہ ارشاد ہے:

قَالُوا لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْأُمِّيِّينَ سَبِيلٌ ۔[۳]

"انہوں نے کہا ہم پر امیوں کے معاملے میں کوئی راہ نہیں"

---

[۱] صفی الرحمٰن مبارک پوری، الرحیق المختوم، مکتبہ السلفیہ شیش محل روڈ، لاہور، ص ۲۹۸

[۲] ایضاً، ص ۲۹۹

[۳] آل عمران ۳:۷۵

یعنی امیوں کا مال کھانے میں ہماری کوئی پکڑ نہیں۔

یہ لوگ اپنے آپ کو بڑے عالم اور روحانی پیشوا سمجھتے تھے حالانکہ ان کی دینداری فال گیری اور جادو اور جھاڑ پھونک کے گرد ہی گھومتی تھی۔

یہود سود خور تھے تجارت بھی کرتے تھے اس لیے بہت مال دار تھے۔ ان کے قبیلے بنو نضیر، بنو قینقاع اور بنو قریظہ بڑے بڑے قلعوں میں رہتے تھے۔ یہودیوں کے مدینہ میں قیام پذیر ہونے کی ایک بڑی وجہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دی ہوئی یہ بشارت بھی تھی:

> ''خداوند تیرا خدا تیرے لیے تیرے ہی درمیان سے تیرے ہی بھائیوں میں سے میری مانند ایک نبی برپا کرے گا۔''[1]

اس وقت سے یہود امید کیے ہوئے تھے اور اسی امید پر مدینہ میں ٹھہرے ہوئے تھے کہ بنی اسماعیل میں پیدا ہونے والا نبی یہود کے قومی ادبار کو دور کرنے والا، ان کی گزشتہ شان و شوکت حکومت و سلطنت کو دوبارہ زندہ کرنے والا ہوگا۔ اور جب سے یہود کو شام سے نکال دیا گیا اور ذلت و غلامی کے گڑھے میں ڈال دیا گیا اس وقت سے نبی موعود کے ظہور پر ان کی آنکھیں اور بھی زیادہ لگی ہوئی تھیں۔[2]

لیکن آپ ﷺ کے تشریف لانے پر یہ گروہ آپ کے خلاف یہ کہہ کر ہو جاتا ہے کہ یہ نبی تو عیسیٰ علیہ السلام کو نبی اور راستباز مانتا ہے اور اس پر بھی ایمان لانا ضروری قرار دیتا ہے۔

پھر جب سے یہود کو یہ پتہ چلا تھا کہ پیغمبر اسلام یثرب میں اپنی دعوت کا مرکز بنانے والا ہے تب سے تو ان کے بغض حسد اور دشمنی کی کوئی انتہا نہ رہی تھی۔ اسی لیے آپ ﷺ کی مدینہ آمد کے وقت ہی سے یہود کو اسلام اور مسلمانوں سے سخت عداوت ہو گئی تھی اگرچہ وہ اس کا برملا اظہار نہ کر سکے۔

حضرت صفیہ بنت حیی بن اخطب رضی اللہ عنہا اپنے یہودی والد اور چچا کی گفتگو نقل کرتی ہیں کہ میرے والد اور چچا صبح آپ ﷺ کے پاس پہنچے اور غروب آفتاب کے وقت تھکے ماندے گرتے پڑتے شدت غم سے نڈھال واپس آتے ہیں اور میری طرف خلاف معمول التفات نہ کرتے ہوئے باہم ہمکلام ہوتے ہیں۔ میرے چچا پوچھتے ہیں کیا یہ وہی ہے؟ والد نے جواب دیا ہاں! خدا کی قسم۔ چچا نے کہا آپ انہیں ٹھیک ٹھیک پہچان رہے ہیں؟ والد نے کہا، ہاں! چچا نے کہا: تو اب آپ کے دل میں ان کے متعلق کیا ارادے ہیں؟ والد نے کہا، عداوت، خدا کی قسم جب تک زندہ رہوں گا۔[3]

---

[1] کتاب مقدس، کتاب استثناء، باب ۱۵

[2] رحمۃ اللعالمین، ۱ر ۹۷

[3] سیرت ابن ہشام ۱ر۵۱۸-۵۱۹

اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہودیوں نے آپ ﷺ کی عداوت اور دشمنی کو دل میں چھپا رکھا تھا اور اس کا اظہار انھوں نے اپنے ناپاک عزائم سے متعدد بار کیا اور پیغمبر اسلام اور ان کے ساتھیوں کو مختلف انداز میں اذیت پہنچانے کا سلسلہ عمر بھر جاری رکھا جن میں سے چند ایک درج ذیل ہیں:

انصار میں تفرقہ ڈالنے کی کوشش:

مرشا بن قیس نامی ایک بوڑھا شخص مسلمانوں سے سخت عداوت رکھتا تھا۔ اسے اوس اور خزرج کی محبت جو اسلام کی بدولت ان میں ہوئی تھی ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ اس نے ایک یہودی نوجوان کے ذریعے اوس اور خزرج کی ایک پرانی لڑائی کا تذکرہ کروا کر دونوں کو لڑانے کی مذموم کوشش کی۔ نبی رحمت ﷺ کی بروقت مداخلت اور نصیحت سے دونوں گروہ لڑائی سے باز آ گئے اور رو پڑے اور آپس میں گلے لگے۔[1]

نومسلموں کی تحقیر:

جب عبداللہ بن سلام، ثعلبہ بن سعید، اسید بن سعید اور اسد بن عبید وغیرہ یہودی مسلمان ہو گئے تو علمائے یہود کہنے لگے کہ یہ لوگ ہم میں نالائق اور شریر تھے اگر یہ لائق اور نیک ہوتے تو اپنا دین قدیم ترک نہ کرتے اور محمد (ﷺ) کے متبع نہ ہوتے۔

اللہ تعالیٰ نے یہود کی مذمت میں یہ آیت نازل فرمائی:

لَيْسُوا سَوَاءً مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ أُمَّةٌ قَائِمَةٌ يَتْلُونَ آيَاتِ اللَّهِ آنَاءَ اللَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُونَ ○[2]

یعنی سب لوگ برابر نہیں ہیں۔ اہل کتاب میں سے ایک گروہ ایسا ہے جو رات کی ساعتوں میں کھڑے ہو کر خدا کی آیات پڑھتے ہیں اور سجدہ کرتے ہیں۔

آپ ﷺ کو قتل کرنے کی سازش:

یہودی قبیلہ بنو نضیر نے آپ ﷺ کو دھوکے سے بلا کر قتل کرنے کا منصوبہ بنایا۔ حضرت جبرائیل نے آپ کو آگاہ کیا کہ یہود تلواریں باندھ کر تیار ہیں کہ آپ جب آئیں تو آپ کو قتل کر دیں۔[3]

مختصر یہ کہ یہود مدینہ نے اسلام اور اہل اسلام کی دشمنی کو اپنا مشن بنا لیا تھا۔ وہ پیغمبر اسلام اور ان کے صحابہ کرام کو تکلیف پہنچانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے۔ اس سلسلے میں کسی قرابت یا ہمسائیگی کے حق کو خاطر میں نہ لاتے بلکہ دشمنان اسلام کے لیے اندرون خانہ ہر قسم کا تعاون مہیا کر رہے تھے۔

نصاریٰ:

مکی دور میں کفار مکہ کے ظلم و ستم سے تنگ آ کر مظلوم مسلمان نبی کریم ﷺ کی اجازت سے دو مرتبہ حبشہ کی طرف ہجرت کر

---

[1] سیرت ابن ہشام ۱/۳۸۲

[2] آل عمران ۳:۱۱۳

[3] سیرت النبی ۱/۳۸۲-۳۸۳

چکے تھے اور حبشہ کے عیسائی حاکم نے ان کے ساتھ بہت اچھا برتاؤ کیا اور سفارت قریش مکہ کو انہیں حوالے کرنے سے انکار کر کے مسلمانوں کے دلوں میں اپنے لیے جگہ بنائی تھی۔ پھر نجاشی کے دربار میں حضرت جعفرؓ کی تقریر سے متاثر ہو کر ایک وفد نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر آپ کی تعلیمات کو برحق جان کر مسلمان ہو چکا تھا۔

ابوجہل اور اس کے چند ساتھیوں نے انہیں ورغلانے کی کوشش کی تو انھوں نے کہا سلام ہے بھائیو تم پر ہم تمہارے ساتھ جہالت بازی نہیں کر سکتے ہمیں اپنے طریقے پر چلنے دو اور تم اپنے طریقے پر چلتے رہو ہم اپنے آپ کو جان بوجھ کر بھلائی سے محروم نہیں رکھ سکتے۔[1]

اسی طرح نبی کریم ﷺ کے مکی دور نبوت کے دوران دنیا کی دو بڑی طاقتوں روم اور ایران میں لڑائی جاری ہوئی تو مسلمانوں کی ہمدردیاں عیسائیوں کے ساتھ تھیں کیونکہ وہ مسلمانوں کے مذہب کے قریب تر تھے جبکہ کفار کی ہمدردیاں ایرانیوں کے ساتھ تھیں کیونکہ وہ آتش پرست اور دو خداؤں کے قائل تھے۔ پہلی دفعہ رومی مغلوب ہوئے تو کفار مکہ نے خوشیاں منائیں لیکن قرآن نے رومیوں کے دوبارہ غالب آنے کی پیش گوئی کی تو کفار مکہ نے مسلمانوں سے خوب مذاق کیا۔ قرآن میں سورہ روم میں اس پیش گوئی کا ذکر ہے۔

الٓمّٓ ۝ غُلِبَتِ الرُّوْمُ ۝ فِیْٓ اَدْنَى الْاَرْضِ وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَیَغْلِبُوْنَ ۝[2]

''رومی قریب کی سرزمین میں مغلوب ہو گئے ہیں اور اپنی اس مغلوبیت کے چند سال کے اندر وہ غالب ہو جائیں گے۔''

ان حالات میں مسلمان عیسائیوں کے بارے میں اچھی توقعات اور دوستانہ مراسم کی توقعات کے ساتھ مدینہ میں داخل ہو رہے تھے مگر وہاں کے عیسائی ان توقعات کے خلاف دشمنان اسلام ثابت ہوئے۔

مدینہ میں جو عیسائی موجود تھے وہ بھی نبی موعود کے منتظر تھے۔ جب سے خدا کے برگزیدہ بندے حضرت عیسیٰ مسیح نے سب سے آخری وعظ میں دوسرے تسلی دینے والے کے آنے کی خبر دی تھی جو دنیا کے ساتھ ہمیشہ رہے گا اور جو دنیا کی سب چیزیں سکھائے گا اور عیسائیوں کو اس کے حکم پر چلنے کی تاکید کی تھی تب سے عیسائی بھی اس نبی ﷺ کا انتظار کر رہے تھے۔[3]

انجیل میں ہے:

''وہ دنیا کو گناہ سے اور راستی سے اور عدالت سے تقصیروار ٹھہرائے گا وہ میری بزرگی کرے گا تمہیں ساری سچائی کی راہ بتا دے گا۔''[4]

---

[1] سیرت ابن ہشام، ۲ر ۳۲
[2] الروم ۳۰: ۱-۳
[3] رحمۃ للعالمین، ۱ر ۹۸
[4] کتاب مقدس، باب ۱۴، ۱۶، ۱۹

پیغمبر اسلام تشریف لائے اور جب انھوں نے عیسائیوں کے خود ساختہ عقائد الوہیت مسیح، کفارہ اور تثلیث جیسے عقائد کا رد کیا اور رہبانیت اور پوپ کے اعلیٰ اقتدارات کی تردید کی تو عیسائیوں کی اکثریت نے آپ پر ایمان لانے کی بجائے آپ کی دشمنی کی ٹھان لی۔
اور آپ ﷺ اور اسلام پر ایمان لانا تو درکنار قرآن کی اس دردمندانہ اپیل کا بھی مثبت جواب نہ دیا:

قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَى كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ ..... [۱]

''کہہ دیجیے اے اہل کتاب آؤ اس کلمہ کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان مشترک ہے۔''

آپ ﷺ یہودیوں اور عیسائیوں کو اہل کتاب ہونے کے ناطے بہت اہمیت دیتے تھے۔ جن احکام میں کوئی حکم خداوندی نہ آیا ہوتا آپ اہل کتاب کی پیروی سے بھی نہ ہچکچاتے تھے۔ مثلاً عاشورہ کا روزہ اور بیت المقدس کی طرف ایک مدت تک منہ کر کے نماز پڑھنا وغیرہ۔ لیکن ان لوگوں کی طرف سے کوئی جواب نہ ملا یہاں تک کہ حکم ربی آیا:

وَلَن تَرْضَى عَنكَ الْيَهُودُ وَلَا النَّصَارَى حَتَّى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ. [۲]

''اور تم سے نہ تو یہودی کبھی خوش ہوں گے اور نہ عیسائی یہاں تک کہ ان کے مذہب کی پیروی اختیار کر لو۔''

عیسائیوں کا سب سے بڑا مرکز نجران میں تھا۔ نجران یمن کے ایک وسیع ضلع کا نام ہے۔
اہل نجران کے پاس آپ ﷺ نے ایک دعوتی خط بھیجا تھا جس کے جواب میں اہل نجران نے ایک وفد حالات کا بغور مطالعہ کرنے کے لیے بھیجا تھا۔ ان لوگوں نے آنحضرت ﷺ سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق گفتگو کی اور کہا ''اگر آپ کے فرمان کے مطابق مسیح خدا کے بیٹے نہیں ہیں تو پھر ان کا باپ کون ہے؟'' یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ رسول اللہ ﷺ پر ان آیات کا نزول ہوا:

إِنَّ مَثَلَ عِيسَى عِندَ اللَّهِ كَمَثَلِ آدَمَ خَلَقَهُ مِن تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهُ كُن فَيَكُونُ ○ الْحَقُّ مِن رَّبِّكَ فَلَا تَكُن مِّنَ الْمُمْتَرِينَ ○ فَمَنْ حَاجَّكَ فِيهِ مِن بَعْدِ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ أَبْنَاءَنَا وَأَبْنَاءَكُمْ وَنِسَاءَنَا وَنِسَاءَكُمْ وَأَنفُسَنَا وَأَنفُسَكُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَل لَّعْنَتَ اللَّهِ عَلَى الْكَاذِبِينَ ○ [۳]

''عیسیٰ کا حال خدا کے نزدیک آدم کا سا ہے کہ اس نے (پہلے) مٹی سے ان کا قالب بنایا پھر فرمایا (انسان) ہو جا تو وہ (انسان) ہو گئے یہ (بات) تمہارے پروردگار کی طرف سے حق ہے تو تم ہرگز شک کرنے والوں میں نہ ہونا۔ پھر اگر یہ لوگ عیسیٰ کے بارے میں تم سے جھگڑا کریں اور تم کو حقیقت

---

[۱] آل عمران ۳:۶۴
[۲] البقرہ ۲:۱۲۰
[۳] آل عمران ۳:۵۹۔۶۱

حال تو معلوم ہو ہی چکی ہے تو ان سے کہنا آؤ ہم اپنے بیٹوں اور عورتوں کو بلائیں تم اپنے بیٹوں اور عورتوں کو بلاؤ اور ہم خود بھی آئیں اور تم خود بھی آؤ پھر دونوں فریق (خدا سے) دعا و التجا کریں اور جھوٹوں پر خدا کی لعنت بھیجیں۔"

وفد کے ارکان مباہلے کی دعوت سے گھبرا گئے۔ ایک شخص نے رائے دی کہ:

"مباہلہ نہیں کرنا چاہیے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ واقعی پیغمبر ہوں اور ہم لوگ مباہلے کے بعد ہمیشہ کے لیے تباہ ہو جائیں اس لیے مناسب یہی ہے کہ خراج دے کر معاہدہ کر لیا جائے۔"[1]

آپ ﷺ نے ان کے ساتھ خراج کی ادائیگی پر معاہدہ کر لیا۔

اہل کتاب کا ایمان نہ لانا کسی شبہ کی بنا پر نہ تھا وہ لوگ دنیاوی لالچ اور حسد و بغض کی بنا پر مسلمان نہیں ہوئے ورنہ آپ ﷺ کے نبی ہونے کا علم انہیں روز روشن کی طرح تھا۔

الَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ يَعْرِفُونَهُ كَمَا يَعْرِفُونَ أَبْنَاءَهُمْ وَإِنَّ فَرِيقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُونَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُونَ ○[2]

"جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے وہ ان (پیغمبر آخرالزماں) کو اچھی طرح پہچانتے ہیں جس طرح اپنے بیٹوں کو پہچانا کرتے ہیں مگر ایک فریق ان میں سے سچی بات کو جان بوجھ کر چھپا رہا ہے۔"

---

[1] الجامع الصحیح للبخاری، کتاب المغازی، باب قصۃ اہل نجران (۴۳۸۰) الکتب ہستہ، ص ۳۸۹

[2] البقرہ ۲:۱۴۶

منافقین

نبی کریم ﷺ کی مدینہ آمد کے کچھ عرصہ بعد ہی بہت سے مشرکین نے اسلام قبول کرلیا تھا اور باقی مشرکین نے جو اپنے اندر مسلمانوں اور نبی کریم کے خلاف سخت کینہ وعداوت چھپائے ہوئے تھے منافقین کا روپ دھار لیا۔ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے ہر نازک مرحلے میں مسلمانوں کو دھوکہ دیا۔ ان کا سردار عبداللہ بن ابی تھا یہ نبی کریم سے اپنا مقام چھیننے کی بنا پر نالاں تھا۔

یہ وہ شخص ہے جس کو جنگ بعاث کے بعد اوس وخزرج نے اپنا سربراہ بنانے پر اتفاق کرلیا تھا۔ اس کے لیے موتیوں کا تاج تیار کیا جارہا تھا تاکہ اس کے سر پر تاج شاہی رکھ کر اس کی باقاعدہ بادشاہت کا اعلان کردیا جائے کہ اچانک رسول اللہ ﷺ کی آمد آمد ہوگئی اور لوگوں کا رخ اس کی بجائے نبی کریم کی طرف ہوگیا اس لیے اسے یہ بھی رنج تھا کہ آپ ہی نے اس کی بادشاہت چھینی ہے۔[1]

عبداللہ بن ابی اور اس کے دوسرے ساتھی جو اس کی بادشاہت میں بڑے بڑے عہدے حاصل کرنے کی امید لیے ہوئے تھے۔ اسلام کا غلبہ دیکھ کر ظاہرا ایمان تو لے آئے مگر دل سے کافر ہی رہے۔ ان لوگوں نے مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کا کوئی موقعہ ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ قرآن نے ان لوگوں کا تعارف یوں کرایا ہے:

وَمِنَ النَّاسِ مَن يَقُولُ آمَنَّا بِاللَّهِ وَبِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَمَا هُم بِمُؤْمِنِينَ ○[2]

"کچھ لوگ ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم اللہ پر اور یوم آخرت پر ایمان لائے حالانکہ وہ حقیقت میں مومن نہیں ہیں۔"

دھوکہ بازی:

منافقین دھوکہ دہی کو کفار اور مسلمانوں کے درمیان بطور ہتھیار کے استعمال کرتے تھے۔ حالانکہ وہ خود اپنے آپ کو دھوکہ دے رہے تھے۔ قرآن مجید نے ان کی اس روش پر یوں تبصرہ کیا ہے:

يُخَادِعُونَ اللَّهَ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَمَا يَخْدَعُونَ إِلَّا أَنفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُونَ ○[3]

"یہ اللہ اور مومنوں کو دھوکہ دے رہے ہیں حالانکہ وہ اپنے آپ کو دھوکہ دے رہے ہیں اور اس کا انہیں شعور نہیں۔"

---

[1] الرحیق المختوم، ص ۲۹۸
[2] البقرہ ۸:۲
[3] البقرہ ۹:۲

فساد اور ضد:

منافقین فساد فی الارض کی مسلسل کوشش میں رہتے تھے۔ وہ کافروں اور مسلمانوں یا مسلمانوں کی باہمی لڑائی کو منفعت بخش کام سمجھتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی اس بری روش کا تذکرہ یوں کیا ہے:

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ قَالُوا إِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُونَ ○ أَلَا إِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُونَ وَلَٰكِن لَّا يَشْعُرُونَ ○[1]

''اور جب انہیں کہا جاتا ہے کہ زمین میں فساد نہ کرو تو وہ جواب دیتے ہیں ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں، آگاہ رہو کہ یہی لوگ فساد برپا کرنے والے ہیں مگر شعور نہیں رکھتے۔''

منافقین فساد کو بھی اصلاح کا نام دیتے تھے حالانکہ یہ ان کی ہٹ دھرمی تھی۔ اس طرح ضد اور ہٹ دھرمی سے منافقین اپنی اصلاح کی بجائے فساد برپا کرتے رہتے تھے۔

مسلمانوں کا مذاق اڑانا:

منافقین تنہائی میں یا اپنی منافقانہ مجلسوں میں مسلمانوں کا مذاق اڑاتے تھے اور انہیں بے وقوف گردانتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی اس قبیح حرکت کو یوں بیان کیا ہے:

وَإِذَا لَقُوا الَّذِينَ آمَنُوا قَالُوا آمَنَّا وَإِذَا خَلَوْا إِلَىٰ شَيَاطِينِهِمْ قَالُوا إِنَّا مَعَكُمْ إِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِئُونَ ○[2]

''اور جب یہ اہل ایمان سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں اور جب علیحدگی میں اپنے شیطانوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم اصل میں تو تمہارے ساتھ ہیں ہم تو مسلمانوں سے محض مذاق کر رہے ہیں۔''

گمراہی اختیار کرنا:

منافقین نے دنیاوی مفادات اور اپنی ضد کی بنا پر گمراہی خرید لی تھی۔ یہ لوگ ہدایت پر گمراہی کو ترجیح دیتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے اس خسارے کی تجارت پر یوں تبصرہ کیا ہے:

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الضَّلَالَةَ بِالْهُدَىٰ فَمَا رَبِحَت تِّجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوا مُهْتَدِينَ ○[3]

---

[1] البقرہ ۲: ۱۱-۱۲

[2] البقرہ ۲: ۱۴

[3] البقرہ ۲: ۱۶

''یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی خریدی پس نہ ہی ان کی تجارت فائدہ مند ہوگی اور نہ ہی وہ ہدایت یافتہ ہوئے۔''

منافقین کی مذکورہ جملہ خرابیوں کے باوجود چونکہ یہ لوگ اپنے آپ کو مسلمان کہتے تھے اور آپؐ کے پاس آتے جاتے تھے اس لیے آپؐ نے ان کے تمام خامیوں کے باوجود ان کو اپنے پاس سے نہیں بھگایا بلکہ ان سے خیرخواہی ہی کی۔ یہاں تک کہ غزوہ تبوک سے واپسی پر جب منافقین نے آپ کی عظیم کامیابی پر جلتے ہوئے آپ کے قتل کی ناپاک سازش باندھی اور آپ کے قتل کا منصوبہ بنا کر عملی اقدام بھی کیا۔ لیکن نبی رحمت ﷺ نے اتنے بڑے جرم پر بھی عفو سے کام لیا۔

اس موقع پر حضور ﷺ سے درخواست بھی کی گئی کہ ان منصوبہ گروں میں سے ہر ایک کے اہل قبیلہ کو حکم دیں کہ وہ اپنے آدمی کا سر آپ کے سامنے لائیں۔ جواب میں نبی رحمت ﷺ نے فرمایا:

''میں پسند نہیں کرتا کہ عربوں میں چرچا ہو کہ محمد نے کچھ لوگوں کو ساتھ لے کر دشمنوں کا مقابلہ کیا اور پھر جب غلبہ پالیا تو اپنے ہی ساتھیوں کو قتل کرنے لگا۔''[1]

اس طرح نبی رحمت ﷺ اپنے بے وفا ساتھیوں یعنی منافقوں کو بھی اپنا ساتھی کہہ کر نفسیاتی طور پر اپنے ساتھ ہی رہنے پر مجبور کر دیتے تھے۔ تسخیر قلوب کا یہ وہ اخلاقی حربہ تھا جو نبی کریم ﷺ کا امتیازی نشان ہے۔ مدینہ میں آپ ﷺ کو سب سے زیادہ ذہنی دکھ عبداللہ بن ابی نے پہنچایا۔ اس کے بیٹے نے جو سچے اور پکے مسلمان تھے، اپنے باپ کے قتل کی اجازت چاہی تو آپؐ نے منع فرمایا اور کہا کہ میں اس پر مہربانی کروں گا۔

یہ ارشاد اس طرح پورا ہوا کہ جب عبداللہ بن ابی مرا تو کفن کے لیے آپؐ نے خود اپنا پیراہن مبارک عنایت فرمایا۔ جنازہ کی نماز پڑھائی۔[2] اس موقع پر حضرت عمرؓ نے دامن تھام لیا کہ آپ منافق کی نماز جنازہ پڑھتے ہیں۔ لیکن رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میں نماز جنازہ ضرور پڑھاؤں گا اس پر حضرت عمرؓ نے عرض کی کہ قرآن کریم میں آیا ہے کہ اگر تم ان کے لیے ستر دفعہ بھی عفو و درگزر کے لیے دعا مانگو تو بھی اللہ ان کو معاف نہیں کرے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تب تو میں ستر دفعہ سے زیادہ ان کی معافی کے لیے دعا مانگوں گا۔[3]

یہ بات بھی بڑی دلچسپ ہے کہ یہود اور منافقین میں ایک قدر مشترک یعنی حاسدانہ انتقامی جذبہ ہونے کی بنا پر اور اسلام کی بڑھتی ہوئی طاقت کو دیکھ کر کچھ یہودیوں نے بھی ظاہراً اسلام قبول کر لیا تھا۔ یہ لوگ بھی پکے منافق تھے۔ ان میں بنو قینقاع سے نمایاں مرتبے کے حامل یہ افراد تھے:

---

[1] محسن انسانیت، ص ۳۶۸-۳۶۹

[2] سیرت النبی، ۳۸۲/۱

[3] MUhammad Ali, Muhammad the Prophet, Ahmadiyya Aunjumani-Ishaat-i-Islam Lahore, India, 1924 , p.218,219

سعد بن حنیف ۲۔ زید بن لصیت ۳۔ نعمان ابن اوفی ابن عمرو ۴۔ رافع بن حریملہ ۵۔ رفاعہ بن زید بن تابوت

۶۔ سلسلہ ابن برہام ۷۔ کنانہ ابن صوریا[1]

مذکورہ منافقین میں سے رافع بن حریملہ کا مقام نفاق اتنا بلند تھا کہ جس دن وہ مرا تو سرور عالم ﷺ نے خود فرمایا کہ آج منافقین کے سرخیلوں میں سے ایک سرخیل مر گیا ہے۔ ایسا ہی مقام رفاعہ بن زید بن تابوت کا تھا۔ چنانچہ غزوہ بنی عبدالمصطلق سے واپسی پر طوفان صرصر اٹھا اور لوگ کچھ گھبرا گئے تو حضور ﷺ نے تسلی دلاتے ہوئے فرمایا کہ یہ طوفان منافقین کے ایک سرخیل کو کیفر کردار تک پہنچانے کے لیے متحرک ہوا ہے۔ لوگ مدینہ پہنچے تو معلوم ہوا کہ رفاعہ کی روح اسی طوفان کی لہروں کے ساتھ پرواز کر چکی ہے۔[2]

---

[1] محسن انسانیت، ص ۲۹۶

[2] سیرت ابن ہشام، ۲/ ۷۳۔۷۵

فصل دوم

معاہدات:

ہجرت کے بعد مدینہ منورہ کو ایک سیاسی وحدت بنانے اور اسلامی حکومت کی بنیاد ڈالنے کی کوششوں کے ساتھ ساتھ آنحضرت ﷺ نے نہ صرف مسلمانوں کے تحفظ کے لیے بلکہ ہمہ گیر اور عالم گیر امن کی خاطر قریب و بعید کے قبائل اور ارباب اقتدار سے جن میں مہاجرین و انصار اور یہود شامل تھے، ایسے معاہدات کیے جن میں ہر شخص کو جان و مال اور دین کا تحفظ، رائے اور ضمیر کی مکمل آزادی کے ساتھ فیصلہ کرنے کا موقع دیا گیا۔[1]

چوتھے باب میں حضرت محمد ﷺ کے تمام ایسے سیاسی اور معاشرتی معاہدوں کا جائزہ لیا گیا ہے جن کے ذریعے مدینہ منورہ ایک ایسے متحدہ مرکز میں تبدیل ہو گیا جو چند سال کی مختصر ترین مدت میں نہ صرف دینی و روحانی بلکہ سیاسی اور معاشرتی حیثیت سے بھی دنیا کا سب سے اہم مرکز بن گیا اور فی الحقیقت عہد نبوت میں جس اسلامی اسٹیٹ کا آغاز ہوا تھا وہ روزانہ دو سو چوہتر (۲۷۴) مربع میل کے اوسط سے وسعت اختیار کرتی رہی اور دس سال کے بعد جب آنحضرت ﷺ کا وصال پاک ہوا تو دس لاکھ سے زیادہ مربع میل کا رقبہ آپ کے زیر اقتدار آ چکا تھا۔

> برصغیر کے تین ملکوں کے تقریباً برابر وسیع علاقے کی فتح میں دشمن کے بمشکل ڈیڑھ سو آدمی ہلاک ہوئے اور مسلمان فوج کا مشکل سے اس دس سال میں ماہانہ ایک سپاہی شہید ہوتا رہا۔ انسانی خون کی یہ عزت تاریخ عالم میں بلا خوف تردید بے نظیر ہے۔"[2]

یہ معاہدات امن و آزادی کا واضح اعلان اور غیر مسلم شہریوں کے حقوق کا بنیادی ماخذ ہیں۔ نیز سیاسی اصول کی حیثیت بھی رکھتے ہیں۔ خلفائے راشدین نے غیر مسلم شہریوں کے لیے جو قانون بنائے ان کی اصل بنیاد یہی معاہدات ہیں۔ حضور ﷺ کے اخلاق و عادات، عقائد اسلامیہ، عبادات و تعزیرات کے بے شمار مسائل، حکومت اسلامی کے سیاسی نظریات اور اسلامی تاریخ کے اہم ابواب کے لیے یہ معاہدے بنیادی ماٰخذ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اگر ان پر عمل کیا گیا ہوتا تو عرب کی تاریخی بدامنی ختم ہو جاتی۔ ہر ایک قبیلے کو رائے اور ضمیر کی مکمل آزادی کے ساتھ اپنے حال اور مستقبل پر غور اور فیصلہ کرنے کا موقع ملتا اور شاید قرن اول کی تاریخ میں کوئی جنگ پیش نہ آتی۔

ان معاہدات کے ذریعے غیر مسلموں کو اسلام کے عالم گیر نظریات سے روشناس کرانا مقصود ہے تاکہ ناواقفیت کے باعث اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جو غلط فہمیاں اور نفرتیں پیدا کر دی گئی ہیں وہ دور ہو سکیں۔

---

[1] عیون الاثر، ۱/۱۹۷

[2] حمید اللہ، ڈاکٹر۔ رسول اکرم ﷺ کی سیاسی زندگی، دارالاشاعت، کراچی، ص ۲۸۳

مدنی دور کے معاہدات

عقدِ مواخات:

ہجرت کے پانچویں مہینے رسول اللہ ﷺ نے دینی اخوت کے استحکام اور مہاجرین کی معاشی کفالت اور آبادکاری کے لیے اہم ترین قدم اٹھایا جس کو احادیث و سیر کی کتابوں میں "مواخات بین المہاجرین والانصار" کہا گیا ہے۔ انس بن مالکؓ فرماتے ہیں:

قد حالف النبی بین قریش والانصار فی داری[1]

"رسول اللہ نے میرے گھر میں قریش (مہاجرین) اور انصار کے درمیان اسلامی برادری کا معاہدہ کرایا تھا"

مسند احمد میں بھی عقد مواخات موجود ہے۔

"ان رسول اللہ ﷺ کتب کتابا بین المھاجرین والانصار علی ان یعقلوا معاقلھم و یفدو اعانیھم بالمعروف والاصلاح بین المسلمین."[2]

"حضرت محمد ﷺ نے مہاجرین اور انصار کے درمیان ایک معاہدہ لکھوایا جس کے اہم نکات میں ایک دوسرے کے ساتھ دیت کی ادائیگی میں امداد کرنا، ایک دوسرے کے قیدیوں کا فدیہ ادا کرنا اور مسلمانوں کے درمیان اصلاح کی کوشش کرنا شامل تھا۔"

ابن سعدؒ نے عقدِ مواخات کی تفصیل یوں بیان کی ہے:

"رسول اللہ ﷺ جب مدینہ تشریف لے آئے، مہاجرین کے مختلف لوگوں کے درمیان بھی اخوت کا معاہدہ کرایا اور مہاجرین وانصار کے درمیان بھی مواخات کا رشتہ قائم فرمایا۔ ان کے درمیان یہ برادری باہمی ہمدردی اور حق پر قائم تھی اور اس وقت انصار کی میراث بھی مہاجرین کو ملتی تھی۔ معاہدے میں ۴۵ مہاجرین اور ۴۵ انصار یا بقول بعض راویان حدیث ۵۰۔۱۵۰ افراد شریک تھے۔ مواخات کا یہ معاہدہ غزوہ بدر سے پہلے ہوا تھا۔ جنگ بدر کے بعد جب یہ آیت نازل ہوئی کہ "نسبی رشتہ دار میراث کے زیادہ حق دار ہیں" تو پھر میراث تو نسبی رشتہ داروں کو دی جاتی تھی لیکن باہمی ہمدردی اور اسلامی برادری کا رشتہ بحال رہا۔"[3]

---

[1] الجامع الصحیح للبخاری، کتاب الاعتصام، باب ما ذکر النبی..... (۷۳۴۰) الکتب السنۃ، ص ۶۱۱

[2] مسند احمد، ۲/ ۲۰۴

[3] طبقات ابن سعد، ۱/ ۲۳۸

عقد مواخات ہی کا اثر تھا کہ انصار مدینہ نے اپنی زمینیں اور باغات اپنے مہاجر بھائیوں کے درمیان ملکاً تقسیم کرنے کی درخواست پیش کر دی لیکن رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ "اتنا زیادہ بوجھ تم پر ڈالنا مناسب نہیں ہے البتہ اپنی زمینیں مزارعت یعنی بٹائی کے اصول پر مہاجرین کو دے دو اور آمدن میں تم دونوں شریک ہو گے۔ انصار نے کہا ہمیں منظور ہے۔"[1]

ہجرت کے آٹھویں مہینے حضور نے ایک معاہدہ کیا جو میثاق مدینہ کے نام سے موسوم ہے۔

میثاق مدینہ ۱ھ:

اسلام سے پہلے مدینہ میں یہود کا اقتدار اور تسلط تھا ہجرت کے بعد آنحضرت ﷺ نے پیغمبرانہ فراست سے کام لے کر یہ طے کیا کہ مدینہ میں خارجی طاقتیں ہیں ان سے معاہدہ کر لیا جائے۔ مدینہ کے اطراف میں یہود کے تین قبیلے تھے، بنو قینقاع، بنو نضیر اور بنو قریظہ۔ انصار میں اوس و خزرج دو بڑے قبیلے تھے۔ حضور اکرم ﷺ نے یہود و انصار کا ایک صلح کانفرنس میں جمع کر کے ان کے باہمی روابط کو منظم کر دیا۔ جس سے اسلامی سوسائٹی کے مقاصد کی تکمیل میں زبردست امداد ملی۔[2]

ایک نئی ریاست کی تاسیس و تشکیل کے سلسلے میں میثاق مدینہ کو بڑی اہم اور بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ مدینہ میں بسنے والے مختلف گروہوں کے باہمی تعلقات اور حقوق و فرائض کو متعین و منضبط کرنے کے لیے نیز اس شہر کی سیاسی تنظیم اور تحفظ و دفاع کے لیے ایک ایسا تحریری معاہدہ کیا جسے میثاق مدینہ کہا جاتا ہے۔ آپ ﷺ نے اس معاہدے کی اہمیت کے پیش نظر اسے تحریر کروایا۔ اس میثاق کے لیے آپ نے "کتاب" اور "صحیفے" کے الفاظ استعمال فرمائے جس سے اس دستاویز کی اہمیت کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔[3]

ڈاکٹر محمد حمید اللہ کے خیال میں میثاق مدینہ دنیا کا سب سے پہلا تحریری دستور ہے جسے خود ریاست کے حاکم اعلیٰ نے نافذ کیا۔[4]

بقول ڈاکٹر حمید اللہ:

> "عام قوائد و قوانین ملک کم و بیش تحریری صورت میں ہر جگہ ملتے ہیں۔ دستور مملکت کو عام قوانین سے علیحدہ تحریری صورت میں لایا جانا اس کی نظیر باوجود بڑی تلاش کے مجھے عہد نبویؐ سے پہلے نہیں مل سکی۔
> یہ اس زمانے کی قانونی عبارت اور دستاویز نویسی کا انمول نمونہ ہے۔"[5]

جملہ دستاویز میثاق مدینہ میں ۵۲ دفعات ہیں۔ پہلی ۲۳ دفعات انصار و مہاجرین کے مختلف قواعد و مشتمل ہیں اور بقیہ حصہ یہودی

---

[1] الجامع الصحیح للبخاری۔ کتاب الحرث والمزارعۃ، باب مؤونۃ النخل وغیرہ (۲۳۲۵) المکتبۃ السلفیۃ، ص ۱۸۲

[2] اسلام کا نظام حکومت، ص ۳۶۱

[3] اردو دائرہ معارف اسلامیہ، ص ۳۲۳۔۳۲۴

[4] Hamidullah, Dr., The First Written Constitution in the World, Lahore, 1975, p 8,9

[5] حمید اللہ، ڈاکٹر۔ خطبات بہاولپور، اسلام آباد، ادارہ تحقیقات اسلامی، ۱۹۹۲ء، ص ۷۶

قبائل کے حقوق و فرائض سے بحث کرتا ہے۔ ان دونوں میں ایک جملہ دہرایا گیا ہے کہ آخری عدالت، مرافعہ محمد رسول اللہ ﷺ کی ذات ہوگی۔ [۱]

''میثاق مدینہ'' سیاست نبویؐ کا شاہکار:

''میثاق مدینہ'' رسول اللہ ﷺ کی سیاسی بصیرت اور حسن تدبر کا مثالی شاہکار ہونے کے ساتھ ساتھ رواداری، امن و سلامتی اور عدل و انصاف کے ہر جوہر سے مزین ہے۔ یہ وہ تاریخی معاہدہ ہے جس کی بدولت خاتم النبیین ﷺ نے چودہ سو سال قبل ایک ایسا ضابطہ انسانی معاشرے میں قائم فرمایا جس سے شرکائے معاہدہ میں ہر گروہ اور فرد کو اپنے عقیدہ و مذہب پر فلسفہ عدل و انصاف کی بنا پر آزادی اور حصول انصاف کا حق حاصل ہوا۔ انسانی زندگی کی حرمت قائم ہوئی، یہ تاریخ ساز دستاویز اور اس کی دفعات اپنی حقیقت اور عملیت پر آپ گواہ ہیں۔ امن و سلامتی حریت اور عدل و انصاف کا ہر جوہر اس میں موجود ہے [۲]

مدینہ منورہ میں ریاست کا قیام باقاعدہ آئین کے ذریعہ کیا گیا۔ یہ آئین ''میثاق مدینہ'' کے نام سے معروف ہے۔ حالانکہ اس کی حیثیت ایک آئینی حکم نامے (Constitutional Charter) کی سی ہے۔ لیکن چونکہ آئین ایک طرح کا عہد نامہ ہوتا ہے جو ایک طرف حکومت اور دوسری طرف افراد کے حقوق و فرائض کی حدود متعین کرتا ہے۔ اسی بنا پر ''میثاق مدینہ'' کو معاہدات میں شمار کیا جاسکتا ہے۔

اس معاہدے کی مختلف دفعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہر معاملے میں آپ ﷺ کی شخصیت کو ہی آخری حیثیت دی گئی۔ اس دستاویز میں ایک دفعہ لفظ ''دین'' بھی برتا گیا ہے۔ اس لفظ میں بیک وقت مذہب اور حکومت دونوں کا مفہوم پایا جاتا ہے اور یہ ایک ایسا امر ہے کہ اس کو پیش نظر رکھے بغیر مذہب اسلام اور سیاسیات اسلام کو اچھی طرح سمجھا نہیں جاسکتا۔ [۳]

محمد حسین ہیکل کے خیال میں:

> ''یہ تحریری معاہدہ جس کی رو سے حضرت محمد ﷺ نے آج سے تیرہ سو سال قبل ایک ایسا ضابطہ معاشرۂ انسانی میں قائم کیا جس سے شرکائے معاہدہ میں ہر گروہ اور ہر فرد کو اپنے اپنے عقیدے کی آزادی کا حق حاصل ہوا، انسانی زندگی کی حرمت قائم ہوئی، اموال کے تحفظ کی ضمانت مل گئی، ارتکاب جرم پر گرفت اور مواخذہ نے دباؤ ڈالا اور معاہدین کی یہ بستی (شہر مدینہ) اس میں رہنے والوں کے لیے امن کا گہوارہ بن گئی۔'' [۴]

---

[۱] خطبات بہاولپور، ص ۸۲

[۲] محمد تانی، ڈاکٹر۔ محسن انسانیت اور انسانی حقوق، کراچی، دارالاشاعت، ۱۹۹۹ء، ص ۱۳۵

[۳] حمید اللہ، ڈاکٹر، عہد نبوی ﷺ میں نظام حکمرانی، اکیڈمک آفسٹ پریس، آرام باغ روڈ کراچی، ۱۹۸۷ء، ص ۸۲

[۴] محمد حسین ہیکل۔ حیات محمد ﷺ، لاہور، ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۱۹۷۲ء، ص ۲۲۷

اس معاہدے کے مستند ہونے کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ پوری عبارت میں کوئی بھی ایسی شق نہیں جو اسلام کی پالیسی یا اسلامی تعلیمات کے خلاف ہو۔ مزید براں، یہ ایک مسلسل اور مربوط عبارت ہے جو ظاہر کرتی ہے کہ اس کا مصنف ایک ہی تھا۔

"It is a proud heritage of the Muslims that th first written constitution of a state promulgated in the world by a head of the state originates from no less a personality that the Holy Prophet of Islam himself.[1]

ریاست مدینہ کی تشکیل میں ''میثاق مدینہ'' کا سیاسی و انتظامی کردار:

جان بیکٹ المعروف گلب پاشا ''میثاق مدینہ'' کی اہمیت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ:

''مسلمانوں اور یہودیوں کے باہمی معاہدے کے اقتباسات اس حقیقت پر روشنی ڈالتے ہیں کہ کس طرح مدینے آتے ہی پیغمبر اسلام کی ذات گرامی مقامی سیاست، انتظام مملکت اور انصاف کے معاملات میں گھر گئی تھی، ایک قابل سربراہ کے لیے جس کی اپنی جماعت روبہ ترقی ہو اور اس کے ارکان میں آئے دن اضافہ ہو رہا ہو، یہ بات ناگزیر ہو جاتی ہے کہ وہ ان امور پر توجہ دے جو معاشرت، معیشت اور انصاف کے لیے ضروری ہیں۔''[2]

مستشرق ٹورا اینڈری (Torandrae) اسلام میں میثاق مدینہ کی اہمیت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:

''مدینہ کی امت کے قوانین کسی دینی حکومت کے دستور کی وہ پہلی دستاویز ہیں جس نے بتدریج اسلام کو ایک عالمی مملکت اور عالمی دین بنادیا۔''[3]

اس مملکت کی اساس چونکہ اسلامی اصولوں پر استوار تھی لہٰذا یہ امن و سلامتی کا گہوارہ تھی اور اس میں غیر مسلموں کے لیے بڑی کشش پائی جاتی تھی۔

پیغمبر اسلام ﷺ کی سیاسی بصیرت، قائدانہ صلاحیت اور تدبر و فراست کے نتیجے میں معرض وجود میں آنے والے دستور ''میثاق مدینہ'' کے سیاسی اثرات اور بعد ازاں اس کے نتیجے پر وجود پذیر آنے والی مثالی مملکت مدینہ کے متعلق مغرب کا دانشور اے۔ جے۔ آربری (A.J.Arberry) اعتراف حقیقت اس طرح کرتا ہے:

"When he (Mohammad P.B.U.H) died in 634, Islam was

---

[1] The First Written Constitution World in the World, p.4

[2] گلب پاشا۔ محمد رسول اللہ ﷺ، کراچی، سیٹزن پبلشرز، س ن، ص ۱۹۸

[3] Torandrae, Mohammad the man and his faith new york 1960, p136

secure as the paramaunt religion and political system of all arabia."[1]

''میثاق مدینہ'' کی سیاسی، دفاعی اور قانونی حیثیت:

اس تاریخی حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ یہود اپنی ذہانت و فراست کے لیے بجا طور پر شہرت رکھتے تھے لیکن صدیوں کی منافقت اور سرکشی نے انہیں حد درجہ عیار اور مکار بنا دیا تھا۔ یہ آپ ﷺ کا کمال ہی تھا کہ یہود نے اپنے خصائص کے باوصف اس معاہدے ''میثاق مدینہ'' کو اپنی مرضی سے قبول کر لیا اور اس وقت قبول کیا جب مسلمان انتہائی کسمپرسی کی حالت میں تھے اور اس معاہدے میں رسول اکرم ﷺ کی حیثیت اللہ تعالیٰ کے سچے نبی، حکمران اور حاکم کی تھی اور مسلمانوں کے مقابلے میں ان کی حیثیت ثانوی تھی۔ علاوہ ازیں اس عہد نامے کی رو سے نہ صرف یہ کہ مدینے میں اسلامی ریاست معرض وجود میں آ گئی بلکہ یہود اور دیگر معاہد اقوام نے بھی اسے تسلیم کر لیا۔

''میثاق مدینہ'' کی نوعیت:

میثاق مدینہ اور اس کی دفعات اپنی حقیقت پر آپ گواہی دیتی ہیں کہ امن و سلامتی، آزادی اور انصاف کا ہر جوہر اس میں موجود ہے۔ یہ معاہدہ ان لوگوں کے ساتھ کیا گیا جو قرآن کی زبان میں ظلم اور گناہ کی راہ میں تیز رو تھے۔ جھوٹ کے عادی، حرام کھانے میں جری، سود خور، سرمایہ دار، غریبوں کا مال ناحق ہضم کرنے والے تھے۔ آنحضرت نے اس معاہدہ کے بعد بھی اس قوم کو مزید رعایتیں دیں مگر بدنام اور بدکردار یہودیوں نے ہر رعایت کو نظر انداز کر دیا۔

اس زمانے میں مسلمان مکہ سے بے وطن ہو چکے تھے، مدینہ میں صورت حال نازک تھی۔ بیرونی دشمن مدینہ کی دیواروں تک پہنچ کر جارحانہ حملے کر رہے تھے۔ اسلامی نظام بھی خطرہ میں تھا، ایسی حالت میں یہود نے ایک اچھے معاہدے کو توڑ دیا۔ انھوں نے حملہ آوروں کو مدد دی، سازشیں کیں، جاسوسی کی، آنحضرت ﷺ کی جان لینے کی کوشش کی، خارجی دشمنوں قریش اور داخلی دشمنوں (منافقوں) سے سازباز کی۔ جب سازش کھل گئی، مجرموں نے جرموں کا اقرار کر لیا تو ان کو معمولی سزا دی گئی۔ دنیا میں جن جرائم کی سزا موت ہے اسلام نے انتہائی نزاکتوں کے وقت بھی ان کی سزا یہ تجویز کی کہ اثر پذیر علاقوں کو خالی کرا لیا۔[2]

مدینہ سے ملحقہ قبائل سے سفارتی تعلقات اور معاہدات:

مدینہ منورہ میں نبی کریم ﷺ کو داخلی امور کی سرانجام دہی میں تقریباً آٹھ مہینے گزر گئے۔ اس دوران حضور ﷺ کو خارجی معاملات کے متعلق توجہ دینے کا بہت کم موقع ملا۔ ہجرت کے بعد قریش کی مخالفت نے قبائل عرب میں ایک آگ لگا دی تھی۔[3]

---

[1] A. J Arberry, Aspects of Islamic Civilization, London, 1964, p11

[2] اسلام کا نظام حکومت، ص ۳۶۲۔۳۶۳

[3] زاد المعاد، ۲/ ۱۵۰

کسی قبیلے کی جانب سے اطمینان نہیں رہا تھا۔ مدینہ پر ہر وقت حملے کا خطرہ رہتا تھا۔ صحابہ کرامؓ راتوں کو پہرے دیتے تھے۔

اس دوران نبی کریم ﷺ قبائل کی نقل و حرکت پر نظر رکھتے تھے۔ اس کے لیے آپ نے دو طریقے اختیار فرمائے:

۱۔ مدینہ سے ملحقہ قبائل کو رفاقت، خیر سگالی اور مصالحت کا پیغام دیا جائے اور ان سے مصالحت کر لی جائے تاکہ اتحاد و یک جہتی کی فضا قائم ہو اور سفارتی تعلقات استوار ہوں۔

۲۔ ایسی صورت اختیار کی جائے جس سے کفار قریش مصالحت پر مجبور ہو جائیں۔ جیسا کہ غزوہ بدر کے بعد جب قریش کی شامی تجارت مدینہ کی راہ سے بند ہو گئی تو وہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ عراق کی راہ اختیار کریں جو دور کا راستہ تھا۔ چنانچہ ابوسفیان اور صفوان بن امیہ جو اب قریش کے سردار اور سرتاج تھے، انھوں نے اس خطرہ کا اعلان کیا کہ:

"ان اقمنا بمکۃ اکلنا رؤس اموالنا" [۱]

(اگر ہم مکہ میں بیٹھے رہے تو اپنی پونجی کھا جائیں گے)۔

چنانچہ بدر کے نو مہینے بعد انھوں نے اس کی تیاری کی۔ ابن ہشام میں منقول ہے:

"جب بدر کے واقعات ہو چکے تو قریش جس راستے سے شام کو جایا کرتے تھے اس راستے پر چل کر جانے سے ڈر کر انھوں نے عراق کا راستہ اختیار کیا۔ اور ان میں کے چند تاجر جن میں ابوسفیان بن حرب بھی تھا اور اس کے ساتھ بہت سی چاندی تھی اور چاندی ہی ان لوگوں کی تجارت کا بڑا حصہ ہوا کرتی تھی۔ ان لوگوں نے بنو بکر بن وائل کو ایک شخص فرات بن حیان کو کچھ معاوضہ دے کر ساتھ لے لیا۔ تاکہ وہ اس راستہ میں ان کی رہنمائی کرے۔" [۲]

طبقات ابن سعد میں ہے کہ:

"اس نے انھیں عراق کی راہ سے ذات عرق روانہ کیا۔" [۳]

مسلمانوں کی یہ بڑی کامیابی تھی کہ قریش اس راہ سے مرعوب اور خوف زدہ ہو گئے۔ چنانچہ جب رسول اللہ ﷺ کو قریش کے راستہ بدلنے کی اطلاع ملی تو حضور ﷺ نے ایک سو سواروں کا دستہ حضرت زید بن حارثہؓ کی قیادت میں قردہ کی طرف روانہ فرمایا۔ زیدؓ بن حارثہ نے ان کو روکا اور قافلہ کو پا لیا اور قوم کے بڑے بڑے لوگ بچ کر نکل گئے۔ یہ لوگ تمام مال و اسباب حضور ﷺ کی خدمت میں لے آئے۔ [۴]

---

[۱] تاریخ طبری، ۳/ ۹

[۲] البدایہ والنہایہ، ۴/۲۔۵

[۳] طبقات ابن سعد، ۳۶/۲

[۴] سیرت ابن ہشام، ۵۴/۳

ملحقہ قبائل سے سلسلہ جنبانی کا مقصد معاہدات اور سفارتی تعلقات کو استوار کرنا:

مدینہ کی چراگاہ پر کرز بن جابر فہری کا حملہ دراصل قریش مکہ کی جنگی تیاریوں کا ایک اعلان تھا۔ اس لیے حضور ﷺ نے حفظ ماتقدم کے طور پر آس پاس مختلف مقامات پر فوجی نقل وحرکت فرمائی۔ اس نقل وحرکت کا مقصد کوئی جنگ نہ تھا بلکہ ایک مقصد تو یہ تھا کہ جن قبائل سے اب تک کوئی معاہدہ نہیں ہوا ان سے معاہدہ ہو جائے۔ اور اگر معاہدہ ہو چکا ہو تو اس کی تجدید وتوثیق ہو جائے اور وہ کسی دھوکے میں آ کر قریش کا ساتھ نہ دیں۔

ایک اور مقصد یہ تھا کہ جہاں دشمنوں کی کچھ سازشی کارروائیوں کا علم ہوا وہاں حالات کا جائزہ لینے کے لیے کوئی فوجی دستہ پہنچ گیا۔

ایک مقصد یہ بھی تھا کہ آس پاس کی مختلف آبادیوں سے یہ خطرہ تھا کہ کہیں یہ قریش کا جنگ میں ساتھ نہ دیں۔ اس لیے ان پر اثر ڈالنا تھا کہ وہ اہل اسلام کو غافل نہ سمجھ لیں۔ بلکہ خود قریش کو بھی بتانا تھا کہ مسلمان جوابی کارروائیوں کے لیے دم خم رکھتے ہیں۔

ایک اور سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ شاید کوئی ایک فرد مل جائے جو دعوت اسلام پر لبیک کہنے والا ہو۔

چونکہ مدنی زندگی میں باقاعدہ ریاست وحکومت کا انداز پیدا ہو گیا تھا۔ اس لیے یہاں جو معاہدے ہوئے وہ محض قبائلی قسم کے نہ تھے بلکہ بین الاقوامی انداز کے تھے۔ خطرات کے پیش نظر اکثر مقامات پر تجدید معاہدہ بھی کی گئی۔

قبیلہ جہینہ سے معاہدہ:

مدینہ میں اطراف وجوانب میں رہنے والے جن قبائل سے سفارتی تعلقات استوار کیے گئے اور ان کے ساتھ معاہدے کیے گئے ان میں سب سے پہلا قبیلہ جہینہ کا تھا۔ یہ واقعہ یکم ہجری ۶۲۲ء کا ہے۔

محل وقوع:

یہ قبیلہ مدینہ منورہ سے ۸۰ میل کے فاصلے پر ینبوع کے قریب بحر احمر کے نزدیک آباد تھا۔ اسی کے قرب وجوار میں دوسرے دو قبیلے مدینہ اور بنو ضمرہ رہتے تھے۔ بنو ضمرہ سے بھی باہمی رفاقت کا معاہدہ ہوا۔ جسے بعد ازاں اس کے حلیف قبیلے بنو مدلج نے بھی تسلیم کر لیا۔[1]

جو قبیلے آمادہ اتحاد نہیں ہوئے ان سے غیر جانب داری کا پیمان لیا گیا اور طے پایا کہ وہ یا تو فریقین سے یکساں سلوک کریں گے یا پھر بالکل غیر جانبدار رہیں گے۔[2]

قبیلہ جہینہ کا وفد خدمت نبویؐ میں:

آنحضرت ﷺ کے سفر ینبوع میں قبیلہ جہینہ کا ایک وفد خدمت نبوی میں معاہدہ حلیفی کے لیے حاضر ہوا۔ آپ نے

---

[1] تاریخ طبری، ۲/ ۲۶۰

[2] البدایہ والنہایہ، ۳/۲۴۸

دریافت فرمایا ''تم کون لوگ ہو؟'' انہوں نے جواب دیا ''ہم بنی غیان ہیں''۔ غیان کے معنی سرکشی کے ہیں۔ اس لیے حضور ﷺ نے فرمایا۔ ''نہیں! تم بنی رشدان ہو۔''

رشدان کے معنی ہدایت پانے کے ہیں۔ یہ لوگ جس وادی میں رہتے تھے۔ اس کا نام غوی تھا۔ جس کے معنی گمراہی کے ہیں۔ آپ نے تبدیل فرما کر ''رشد'' رکھ دیا۔[1]

قبیلہ جہینہ سے معاہدہ کی شرائط:

قبیلہ جہینہ سے مندرجہ ذیل معاہدہ عمل میں آیا:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۱۔ قبیلہ جہینہ کی جان و مال کو امن حاصل ہوگا۔

۲۔ جو شخص ان پر زیادتی کرے یا حملہ آور ہو اس کے مقابلے میں ان کو مدد دی جائے گی۔

۳۔ لیکن جو زیادتی یا جنگ ان کے اہل و عیال کے درمیان ہو یا ان کے مذہبی معاملات سے متعلق ہو، اس میں امداد لازم نہ ہو گی۔

۴۔ ان لوگوں کے قریب وجوار میں جو نیک اور پرہیزگار لوگ ہوں گے ان کے بھی وہی حقوق ہوں گے جو جہینہ کو حاصل ہیں۔[2]

قبیلہ جہینہ کے لیے دوسرا فرمان رسالت ﷺ:

کچھ عرصہ کے بعد قبیلہ جہینہ کے اکثر لوگ مشرف بہ اسلام ہو گئے۔[3]

فتح مکہ کے بعد قبیلہ جہینہ کے ایک ہزار چار سو آدمی مسلمان ہوئے[4] تو سرور عالم ﷺ نے ان لوگوں کے لیے فرمان رسالت تحریر فرمایا۔ جس میں قبول اسلام کے بعد ان کے فرائض کی تفصیل بیان کی گئی۔ اس کا مضمون حسب ذیل ہے:

امان نامہ قبیلہ جہینہ کے مندرجہ ذیل افراد اور شاخوں کے لیے

۱۔ عمرو بن معبد از قبیلہ جہنی

۲۔ بنی حرقہ از قبیلہ جہنی

۳۔ بنی جرمز جہینہ

ان میں وہ فرقہ اللہ تعالیٰ اور محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی امان میں ہے، جو:

---

[1] طبقات ابن سعد، ۳۳۳/۱

[2] ایضاً، ۲۷۰/۱

[3] البدایہ والنہایہ، ۳/ ۲۲۸

[4] تاریخ طبری، ۱۲۲/۳

(الف) اسلام لانے کے بعد نماز قائم کرے، زکوٰۃ ادا کرتا رہے۔

(ب) اللہ اور اس کے رسول کا اطاعت گزار رہے۔

(ج) اور مال غنیمت میں سے خمس نکالتا رہے۔

(د) اپنے اموال میں سے رسول اللہ ﷺ کی پسندیدہ شے ان کے حضور پیش کرنے میں تامل نہ کرے۔

(ھ) اپنے اسلام کا اعلان کرے۔

(و) مشرکوں سے الگ رہے۔

(ز) مسلمانوں میں سے جس کا قرض واجب الادا ہو تو اس کو اصل رقم دلائی جائے گی اور رہن کا سود باطل ہوگا۔

(ح) پھلوں کی پیداوار میں سے عشر ادا کرنا ہوگا۔

(ط) جو شخص ان لوگوں میں شامل ہوگا اس کو بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے اور یہی امور ان پر بھی عائد ہوں گے۔[1]

معاہدہ بنوضمرہ/معاہدہ ابواء:

معاہدہ بنوضمرہ کا دوسرا نام معاہدہ ابواء بھی ہے۔[2]

محل وقوع:

ابواء نامی مقام میں جناب نبی کریم ﷺ کی والدہ ماجدہ کا مزار ہے۔ ابواء کا مرکزی مقام فرع ہے جو ایک اہم قصبہ ہے۔ یہ مقام مدینہ منورہ سے بجانب مکہ تقریباً ۸۰ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ انہی اطراف میں بنوضمرہ کا قبیلہ آباد تھا جو بہت بڑا اور بااثر قبیلہ تھا۔ مدینہ کے جنوب مغرب میں واقع یہ مقام اس لحاظ سے بھی اہم تھا کہ قریش کے تجارتی قافلے اسی راستے سے شام و مصر جایا کرتے تھے۔

مدینہ منورہ میں تشریف لانے کے بعد رسول اللہ ﷺ نے مدینہ منورہ سے ینبوع کا کئی مرتبہ سفر فرمایا۔

ینبوع کی بندرگاہ:

ینبوع مدینہ منورہ کی قدیم بندرگاہ ہے جو مدینہ منورہ سے ۱۲۰ میل کے فاصلے پر بحر احمر کے کنارے مکہ مکرمہ سے شام جانے والے قافلوں کا ایک بڑا اسٹیشن تھا۔ نہر سویز کی تعمیر سے قبل یورپ اور افریقہ کے قافلے زیادہ تر اسی راستے سے آتے جاتے تھے۔ اس راستے میں جو مختلف قبائل بستے تھے۔ ان میں آنحضرت ﷺ نے حلیف رہنے کے معاہدے فرمائے۔ بعض معاہدوں میں ہمیشہ حلیف رہنے اور باہمی فوجی امداد کا ذکر کیا۔ اور بعض قبائل سے صرف غیر جانبدار رہنے اور دشمن کو مدد نہ دینے کا وعدہ لیا گیا ہے۔

---

[1] طبقات ابن سعد، ۱/۲۷

[2] البدایہ والنہایہ، ۳/۲۳۶

معاہدہ کی اہمیت:

معاہدہ ابواء یا معاہدہ بنو ضمرہ سے قریش کی تجارت پر ایک ضرب کاری پڑی۔ علاوہ ازیں مدینہ کو یہاں سے بروقت اطلاعات بھی فراہم ہوسکتی تھیں۔

معاہدہ بن ضمرہ مدنی ریاست کی پہلی سیاسی مہم کا حامل ہے۔ اس معاہدے میں قیام امن کا حقیقی مقصد بھی کارفرما ہے۔ اور یہ داعیہ بھی کہ ہر اسلامی معاہدہ کو اسلامی اور اساسی مقاصد کے عین مطابق ہونا چاہیے۔

معاہدہ کن حالات میں ہوا؟

نبی کریم ﷺ اپنے سفارتی مشن اور تبلیغی مہم کو وسعت دینے اور پیش رفت کرنے کے ارادہ سے ۱۲ صفر ۲ ہجری بمطابق ۶۲۳ عیسوی غزوہ ابواء کے سلسلے میں ۷۰ جان نثاروں کے ہمراہ مقام ودان میں پہنچے[۱] ان میں انصار کا کوئی فرد نہ تھا۔ لڑائی کی نوبت تو نہ آئی لیکن آپ نے میثاق مدینہ کی کڑی کے طور پر مخشی بن عمرو ضمری، جو بنو ضمرہ کا سردار تھا اس کے ساتھ ایک تحریری معاہدہ کیا۔ جس میں جنگ نہ کرنے اور پر امن رہنے کا وعدہ لیا۔

معاہدہ ابواء یا معاہدہ بن ضمرہ کی دفعات:

معاہدہ ابواء کی دفعات حسب ذیل ہیں:

بسم اللہ الرحمن الرحیم

یہ تحریر اللہ کے رسول محمد کی جانب سے بنو ضمرہ کے لیے ہے۔

۱۔ ان لوگوں کو جان و مال کا تحفظ حاصل ہوگا۔

۲۔ جو شخص زیادتی کرتے ہوئے ان پر حملہ کرے گا، اس کے مقابلے میں ان کی مدد کی جائے گی۔

۳۔ ان لوگوں پر واجب ہوگا کہ ہمیشہ پیغمبر کی مدد کرتے رہیں اور خدا کا پیغمبر جب ان کو مدد کے لیے بلائے تو یہ لوگ مدد دیں۔ مگر مذہبی جنگوں میں مدد دینا ضروری نہ ہوگا۔

۴۔ یہ لوگ جب تک اپنے معاہدے پر قائم رہیں گے ان کی مدد کی جائے گی۔ (نیکی کرتے رہیں گے اور بری بات سے بچتے رہیں گے)

۵۔ اس معاہدے پر اللہ اور اس کے رسول کی ذمہ داری ہے۔[۲]

اسی طرح کے اور بھی متعدد معاہدے آپ نے بنو ضمرہ کے قرب و جوار کے قبیلوں سے فرمائے۔ ان سب معاہدات کے الفاظ قریب قریب وہی ہیں جو اوپر مذکور ہوئے۔[۳]

۱۔ تاریخ طبری، ۲/ ۲۵۹ (۱۲۶۶)

۲۔ طبقات ابن سعد، ۱/ ۲/ ۲۷۴۔۲۷۵

۳۔ ایضاً، ۱/ ۲/ ۲۷۴۔۲۷۰

اس سفارتی مہم کے سلسلے میں نبی کریم ﷺ مدینہ منورہ سے پندرہ دن باہر رہے تھے اور اپنی عدم موجودگی میں مدینہ منورہ کا امیر سعد بن عبادہ کو بنایا تھا۔ یہ پہلا سفارتی مشن ہے جس میں رسول اللہ ﷺ نے شرکت فرمائی۔ یہ سفارتی اور دعوتی مشن بنوضمرہ سے مصالحت کے سلسلے میں تھا۔ اور اس نظریہ سے ماتحت تھا کہ مدینہ سے باہر کے قبائل کو مدینہ پر حملہ کرنے سے مصالحت کے ذریعہ روک دیا جائے اور ان سے امن وامان کا معاہدہ ہو جائے[1]

معاہدہ بواط:

نبی کریم ﷺ ربیع الاول کے مہینہ میں ایک دستہ لے کر نکلے۔ آپ ﷺ کا مقصد قریش کے قافلوں کی روک تھام تھا۔ اس مہم میں بھی حضور ﷺ نے حضرت عثمان بن مظعون کو مدینہ میں اپنا نائب مقرر فرمایا۔

نبی کریم ﷺ بواط میں رضوی کے قرب وجوار پہنچے تو کسی قسم کی مزاحمت نہ ہوئی۔ آپ نے وہاں ربیع الثانی کا مہینہ اور جمادی الاول کے کچھ دن قیام فرمایا[2]

بنی زرعہ اور بنی ربعہ سے معاہدہ:

ہجرت مدینہ کے بعد سرور کائنات ﷺ نے جہینہ کی جن مختلف شاخوں سے جنگ کی صورت میں حلیف رہنے کا معاہدہ فرمایا، ان میں بنی زرعہ اور بنی ربعہ بھی تھے[3] اس معاہدے میں دشمنوں سے ان قبیلوں کی حفاظت اور امداد کا وعدہ کیا گیا ہے اور اس کے ساتھ ان کے اندرونی معاملات میں مداخلت نہ کرنے کی یقین دہانی بھی کی گئی ہے۔

معاہدے کا متن:

معاہدے کا متن حسب ذیل ہے:

۱۔ بنی زرعہ اور بنی ربعہ کی جان و مال کو امن حاصل ہوگا۔

۲۔ جو شخص ان پر حملہ آور ہوگا، اس کے مقابلے میں بنی زرعہ اور بنی ربعہ کی مدد کی جائے گی۔

۳۔ لیکن ان کے اندرونی جھگڑوں میں کوئی مداخلت نہیں کی جائے گی۔

۴۔ ان قبیلوں کے قرب وجوار میں جو نیک اور پرہیزگار لوگ ہوں گے ان کے بھی وہی حقوق ہوں گے جو ان قبیلوں کے لوگوں کو حاصل ہوں گے[4]

---

[1] البدایہ والنہایہ، ۳/۲۴۴

[2] سیرۃ النبویہ، ۲/۲۴۸

[3] طبقات ابن سعد، ۱/۲۷۰

[4] ایضاً، ۱/۲۷۰

معاہدہ بنی مدلج:

محل وقوع: یہ قبیلہ بھی مدینہ منورہ سے ۹ منزل پر جنوب مغرب میں تقریباً ۸۰ میل کے فاصلے ابواء اور بنوضمرہ کے پڑوس میں آباد تھا[1] یہیں سے مکہ مکرمہ سے تجارتی قافلے شام و مصر کو جایا کرتے تھے۔

معاہدہ بنومدلج: حضورؐ کے سفارتی مشن کی ایک کڑی:

جمادی الثانی بمطابق اکتوبر ۶۲۳ء کو جناب نبی اکرم ﷺ دوسو مہاجرین کے ساتھ قریش کے تجارتی قافلے کی ناکہ بندی کی خاطر مدینہ منورہ سے نکلے۔ اس میں امیہ بن خلف اور ایک ہزار پانچ اونٹ تھے۔ یہ غزوہ عشیرہ بھی کہلاتا ہے کاروان کی تلاش میں حضور وطن بنوینبوع سے گزر کر ضیرات یمامہ میں عشیرہ کے مقام پر پہنچ گئے۔ کاروان تو سمندر کے راستے سے کنارے کنارے جا کر نکل گیا اور لڑائی کی نوبت نہ آئی۔ البتہ اسی مقام پر حضور ﷺ نے بنومدلج سے معاہدہ طے فرمایا۔ یہ قبیلہ بنوضمرہ کا حلیف تھا۔ جو میثاق مدینہ میں ایک فریق تھا۔ اس لیے اس نے آسانی سے یہ شرائط قبول کرلیں۔ اس کی دوسری وجہ ایک دوسرے کے مذہب میں عدم مداخلت تھی تاکہ بہترین ہمسائیگی کا ثبوت دیا جاسکے[2]

معاہدہ بنوغفار:

محل وقوع: قبیلہ غفار مکہ مکرمہ سے شام و فلسطین کے کاروانی راستے پر آباد تھا۔

حالات: بنوغفار عرب کا ایک مشہور قبیلہ تھا۔ قبول اسلام سے قبل اس کا پیشہ راہزنی تھا۔ یہ لوگ قبیلوں اور قافلوں پر چھاپے مارتے اور لوٹ مار کرتے رہتے تھے۔ مشہور جلیل القدر صحابی حضرت ابوذر غفاریؓ اسی قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ شروع میں بہت بڑے راہزن تھے۔

فتح مکہ کے بعد چار سو آدمی دائرہ اسلام میں داخل ہوئے"[3]

نبی کریم ﷺ نے قبیلہ غفار کے بارے میں ارشاد فرمایا:

"غفار غفر الله لها" (غفار کو اللہ نے بخش دیا)[4]

معاہدے کی پیش کش:

قبیلہ بنوغفار نے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں وفد بھیج کر معاہدے کی پیش کش کی۔ حضور ﷺ نے منظور فرما کر معاہدہ تحریر فرمایا۔

---

[1] تاریخ طبری، ۲۶۰/۲ (۱۲۶۹)

[2] البدایہ والنہایہ، ۳/ ۲۴۶۔۲۴۷

[3] تاریخ طبری، ۳/ ۱۲۲

[4] طبقات ابن سعد، ۳۵۴/۱

معاہدے کا متن:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۱۔ بنو غفار مسلمانوں میں سے سمجھے جائیں گے۔ انھیں وہی حقوق حاصل ہوں گے جو مسلمانوں کو ہیں۔ اور بنو غفار پر بھی وہی امور عائد ہوں گے جو مسلمانوں پر عائد ہوں گے۔

۲۔ محمد نبی کریم ﷺ نے ان کی جان و مال کی حفاظت کے لیے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی ذمہ داری کا معاہدہ کیا ہے۔

۳۔ انھیں ایسے دشمن کے خلاف مدد دی جائے گی جو ان پر ظالمانہ حملہ آور ہو گا۔

۴۔ ان لوگوں پر پابندی ہے کہ جب اللہ کا نبی ان کو مدد کے لیے بلائے تو یہ مدد دیں۔ مگر مذہبی جنگوں میں ہر فریق غیر جانبدار رہے گا۔

۵۔ جو شخص اس معاہدے سے روگردانی کرے گا اس کے لیے یہ معاہدہ حجت نہ ہو گا۔

معاہدہ اشجع:

بنو اشجع قبیلہ غطفان کی ایک شاخ تھے۔ اور تجارتی شاہراہ کے متصل آباد تھے۔

معاہدہ کی وجوہات:

جب نبی کریم ﷺ نے قریش کی ناکہ بندی کی تو قریشی سلسلہ تجارت رک گیا۔ تو اس سے ان کی معاش پر بھی اثر پڑا۔ کیونکہ وہ تجارتی قافلوں کی خدمت کر کے اپنی روزی کمایا کرتے تھے۔ معاشی بحران سے دوچار ہو کر ان کا وفد مدینہ منورہ آیا۔ آپ نے ان سے معاہدہ فرمایا۔ ان کی طرف سے معاہدہ پر دستخط نعیم بن مسعود نے کیے۔ معاہدہ حضرت علیؓ نے تحریر فرمایا۔[۲]

معاہدہ کا متن:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یہ وہ حلفی معاہدہ ہے جو نعیم بن مسعود بن رخیلہ اشجعی نے طے کیا ہے۔ انھوں نے مدد و خیر خواہی پر اس وقت تک کے لیے حلفی معاہدہ کیا ہے جب تک کوہ احد اپنے مقام پر رہے اور سمندر کسی سیپ کو گیلا کرتا رہے۔[۳]

نعیم بن مسعود نے ستر ساتھیوں سمیت سنہ ۵ھ میں عین غزوہ خندق کے دوران اسلام قبول کیا۔[۴]

۱۔ طبقات ابن سعد، ۱/۲/۲۷

۲۔ ایضاً

۳۔ ایضاً

۴۔ ایضاً، ۱/۳۰۶

معاہدے کے وقت پورا قبیلہ اسلام نہ لایا تھا۔ تاہم معاہدے کی اساس اس فقرے سے واضح ہوتی ہے کہ:

"حالفه على النصر والنصيحة"[1]

یعنی حمایت ونصرت اور خیراندیشی وخیرسگالی کے وسیع تعلقات استوار ہوئے۔

مدینہ سے ملحقہ قبائل سے معاہدات پر ایک نظر:

ہمارے پیش روؤں کی ایک رائے یہ ہے کہ ان معاہدات سے یہ قبیلے اور علاقے درحقیقت مدینہ کے سیاسی معاہدکا جزو بن گئے تھے۔ اور متعلقہ علاقہ مدینہ کی سلطنت کا ایک حصہ ہو گیا تھا۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ معاہدات کے بعض اہم اجزاء اور بعض اصطلاحات دستوری معاہدہ سے ملتی جلتی ہیں۔ لیکن اگر بالکل ابتدائی دور کے متعلق ایسا نہ بھی تسلیم کیا جائے تو اس میں کوئی شک نہیں کہ بعد میں جہینہ سے حلیفانہ تعلقات کا ارتقاء اس نہج پر جاری رہا۔ کہ یہ لوگ دوسرے عرب قبائل سے بہت پہلے اسلام میں داخل ہوئے۔ اور ایک ہزار چار سو کی جمعیت نے مدینہ آ کر حضور کی خدمت میں تعاون پیش کیا۔[2]

عملاً غزوات میں حصہ لیتے رہے۔ اس قبیلہ کی مختلف شاخوں سے اسلامی ریاست کے معاملات کا جو ریکارڈ موجود ہے وہ اس کی توثیق کرتا ہے۔ مثلاً بنی الجرمز (جہینہ کی ذیلی شاخ) کو حضور نے امن وسلامتی کا تحریری پروانہ عطا کیا۔ بنی شیخ یا شمخ (جہینہ کی ذیلی شاخ) کو ان کا پورا علاقہ بطور جاگیر مستقل طور پر تفویض کر دیا۔ اسی طرح موجبہ بن حرملہ جہنی کو اس کے مسکن ذوالمرہ (بہ جانب ساحل) کے قریب جاگیر کا پروانہ عطا کیا گیا۔[3]

ابوبصیر اور ان کے ساتھیوں کے لیے جب معاہدہ حدیبیہ کی وجہ سے مدینہ جانے کا موقع نہ رہا تو وہ مکہ سے ہجرت کر کے اسی ساحلی علاقے میں آ گئے تھے۔[4] عین ممکن ہے کہ مجوسہ جیسے سرداروں کی حمایت بھی انھیں حاصل رہی ہو۔ اور وہ مقامی لوگوں کے تعلقات ہی سے قریشی قافلوں کی مزاحمت کرتے ہوں۔

تعلقات اور آگے بڑھے۔ میل جول کی وجہ سے دعوت کا کام جاری رہا۔ تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قبائل بحیثیت مجموعی اسلامی تحریک کے علم بردار بن گئے عقبہ جہنی کی بیعت اسلام کا حال ہمارے سامنے ہے۔ حضور کے دور آخر میں ایک نیا پروانہ بنی جرمز، بنی الحرقہ اور عمرو بن معبد جہنی کے نام جاری ہوا۔ جس میں وہ شرائط ہیں۔ جو مسلم قبائل پر عائد ہوتی تھیں۔ یعنی زکوٰۃ کی پابندی۔ خمس کی ادائیگی۔ مخالفین اسلام سے انقطاع۔ قرضوں کے سود کا ترک ان کے لیے لازم کیا گیا تھا۔[5]

---

[1] طبقات ابن سعد، ۱/۲/۲۷
[2] تاریخ طبری، ۳/ ۱۴۲
[3] طبقات ابن سعد، ۱/۲/۲۷
[4] سیرت ابن ہشام، ۳/ ۳۳۸
[5] طبقات ابن سعد، ۱/ ۲۷-۲۲/۲

بنونجار کے لوگوں نے حضور سے معاہدہ کیا۔ جس کی اساس اس جملے پر ہے کہ **انهم من المسلمین و علیهم ما علی المسلمین**[۱] ہماری رائے میں اگرچہ اس کے ایک جزو میں اس قبیلہ کے غیر مسلم عناصر کا لحاظ رکھا گیا ہے لیکن فی الحقیقت یہ قبیلہ گویا مدینہ کی ہیئت اجتماعیہ کا جزو بن گیا۔ اور کوئی وجہ نہیں کہ اس کے علاقہ کو مدینہ کے زیر نگین نہ سمجھا جائے۔

بنوضمرہ جس کی بہت سی شاخوں میں سے ایک بنونجار کی شاخ تھی۔ اس کا ایک ذیلی قبیلہ بنوعہد بن عدی بھی تھا۔ جس کا قیام حدود حرم میں تھا۔ اس شاخ نے قریش سے مجبوراً مصالحت کے باوجود مسلم حکومت سے دوستانہ تعلقات استوار کیے۔ قریش کے خلاف جنگ میں شامل ہونے سے استثنیٰ حاصل کر کے بقیہ ہر لحاظ سے حضور ﷺ کے ساتھ حلیفانہ روابط جوڑ لیا۔[۲]

قبیلہ مزینہ مدینہ سے صرف ۲۰ میل کی دوری پر فرع کی سمت میں بجانب شمال مغرب آباد تھا۔ سنہ ۵ھ میں یہ قبیلہ حلقۂ اسلام میں شامل ہوا۔[۳] لیکن ان سے حلیفانہ تعلقات لازماً ان کے ہمسایہ قبائل کے ساتھ ہی ساتھ آغاز پا چکے تھے۔ اس قبیلہ کے ایک سردار بلال بن حارث کو قبیلہ (یا قبیل) کی سونے کی کانیں حضور نے بطور جاگیر عطا کیں۔[۴]

قبیلہ غطفان کی ایک شاخ بنواشجع تھے۔ جیسا کہ ذکر کیا گیا ہے کہ معاشی بحران سے مجبور ہو کر ان کا وفد مدینہ پہنچا۔ درمعرکہ خندق سے قبل ہی انہوں نے اسلام قبول کر کے معاہدہ استوار کیا۔[۵]

اس قبیلہ کی ایک شاخ بنوعامر بن عکرمہ نے قافلوں کے پڑاؤ کا کاروبار چلانے کے لیے استحقاق خصوصی کا پروانہ حضور علیہ السلام سے حاصل کیا۔ اس شاخ کے ایک سردار کو بھی غزوہ خندق سے قبل جاگیر دی گئی۔[۶]

اب ہم چند حلیفانہ رابطوں کا ذکر کرتے ہیں۔ جو غزوہ خندق کے مابعد قائم ہوئے۔ قبیلہ خزاعہ یمن کی قحطانی نسل سے تعلق رکھتا تھا۔ اور بہت سی شاخوں پر مشتمل تھا۔ یہ لوگ مکہ کے اردگرد پھیلے ہوئے تھے۔ بنی مصطلق کے علاوہ اس قبیلہ کی اکثر شاخیں مسلمانوں سے اچھے روابط رکھتی تھیں۔ اسی واسطے کی بنا پر ایک طرف تو اس قبیلے نے جنگ احزاب کے لیے قریش کی تیاریوں کی اطلاع حضور ﷺ کو پہنچائی اور دوسری طرف حضور نے بھی فتح مکہ سے قبل ان کو ایک مکتوب میں اطمینان دلایا تھا کہ ان کو کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔ نیز اطلاع دی تھی کہ بنوکلاب اور بنوہوازن نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ لیکن وقت آنے سے قبل یہ بنوبکر کے ظلم و ستم کا نشانہ بنے اور ان کی مظلومی ہی فتح مکہ کا محرک بنی۔[۷]

---

[۱] طبقات ابن سعد، ۲۷۲/۱

[۲] ایضاً، ۲۸۸/۱

[۳] ایضاً، ۲۷۳/۱

[۴] رسول اکرم کی سیاسی زندگی، ص ۲۵۳

[۵] طبقات ابن سعد، ۲۴/۱

[۶] ایضاً، ۲۳/۱

[۷] ڈاکٹر حمید اللہ، رسول اکرم کی سیاسی زندگی، ص ۲۵۵

تبوک کے شمالی علاقے میں جذام، قضاعہ اور عذرہ کے قبائل آباد تھے۔ جنہوں نے اپنے مخاصمانہ رویہ سے خاصی مشکلات اسلامی حکومت کے لیے پیدا کی تھیں۔[1]

لوگوں نے مدینہ کے سفیر کو لوٹ لیا تھا۔ پھر تادیبی مہم ان کے خلاف بھیجی گئی۔ اس مہم کی زد میں غلطی سے بعض بے قصور لوگ بھی آئے۔ یہ لوگ مدینہ میں فریاد لے کر آئے اور تلافی کی گئی۔ اس طرح تعلقات کی راہیں بھی کھلیں۔ حضور ﷺ کی دستاویزات میں ایک مکتوب رفاعہ بن زید جذامی کے نام ملتا ہے۔ جس میں بڑا بھاری الٹی میٹم تھا۔ اس سردار کو مخاطب کر کے اس کی ساری قوم کو متنبہ کیا گیا ہے کہ یا تو وہ اسلامی مشن کو قبول کر کے اللہ اور رسول کی جماعت میں شریک ہو جائے ورنہ روگردانی کرنے کی صورت میں دو ماہ کی امان ہے۔ حالات کا اس نہج سے ارتقا بالآخر جس صورت پر منتج ہوتا ہے وہ یہ تھی کہ حضور ﷺ کی تبوک سے واپسی پر سنہ ۹ ہجری میں مالک بن احمر جذامی نے مدینہ میں آ کر حضور سے ملاقات کی اور پروانہ حاصل کیا۔ اس پروانہ میں وہ شرائط درج ہیں جو معمولاً صرف مسلم قبائل کے لیے ہوتی تھیں۔ یعنی ان لوگوں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ (ابن الاثیر، تاریخ الکامل) اسی طرح قضاعہ کا ایک سردار بریدہ بن الحصیب کسی مہم کے درمیان میں حضور علیہ السلام سے مدینہ کے باہر ہی ملا۔ اور اس نے اپنی قوم کی طرف سے قبول اسلام کا قول لے کر پروانہ حاصل کر لیا۔

سنہ ۶ھ میں قبیلہ کلب کی طرف حضور ﷺ نے عبدالرحمٰن کو ایک دعوتی مہم پر بھیجا۔ نتیجہ حسب منشا نکلا۔ اور سردار نے اظہار وفاداری اور استحکام رابطہ کے لیے اپنی بیٹی کا نکاح عبدالرحمٰن بن عوف سے کر دیا۔ اسی طرح بارگاہ نبوی سے ایک پروانہ کلبیوں کے نومسلم سردار حارث بن قطان کے نام جاری ہوا۔ جو دومۃ الجندل کے قرب و جوار کے کلبیوں سے متعلق ہے۔ خود اکیدر (والی دومۃ الجندل) سے معاہدہ ہوا۔ قوم نے اسلام قبول کیا۔[2]

جزیہ دینے کی شرط پر سرداری پر بحال رکھا گیا۔[3]

بہرحال بعد میں اس نے اپنے اسلام یا معاہدہ اطاعت سے انحراف کیا۔ اور حضرت خالدؓ کے ہاتھوں قتل ہوا۔ بعد میں اس کے قلعے اور افتادہ زمینوں کو اسی کلبیوں کے سردار حارث بن قطن کی تحویل میں دے دیا گیا۔

اہل طائف کے عمومی قبول اسلام سے قبل صرد بن عبداللہ یمنی اسلامی مشن کے علمبرداروں میں آ ملے۔ حضور ﷺ نے ان کو اس علاقے میں فوجی کارروائیوں کے لیے کمانڈ تفویض کی۔ حضور ہی کے اذن سے انھوں نے جرش کے قلعے کا محاصرہ کیا۔ جو معاہدہ صلح پر منتج ہوا۔[4]

۱۔ طبقات ابن سعد، ۱/۳۵۴

۲۔ البدایہ والنہایہ، ۳/۱۷۹

۳۔ تاریخ طبری ۳/۱۴۷

۴۔ طبقات ابن سعد، ۱/۳۲۷

بنوازد جو عمان شہر میں آباد تھے اور عبید اور جعفر نامی دو اشخاص ان کے رئیس تھے۔ ان کی طرف عمرو بن العاص حضور ﷺ کا نامہ دعوت لے کر سنہ ۸ ہجری میں گئے۔ انہوں نے اسلام قبول کر لیا[1]

علاوہ ازیں فوجی کارروائی کے نتیجے میں جہاں کہیں کسی گروہ نے اطاعت قبول کرنے، مصالحت کرنے کی خواہش کی، وہاں فوراً اس کے لیے راستہ دیا گیا۔ مدینہ کی مستقل پالیسی یہ تھی کہ جو محارب بھی صلح کا خواہاں ہو اس کی خواہش امن کا احترام کیا جائے۔ چنانچہ متعدد قبائل نے میدان جنگ میں اترنے کے بعد یا تو سیاسی اطاعت اختیار کی یا اسلام قبول کیا۔ اس سلسلے کی ایک نمایاں مثال خیبر اور ملحقہ علاقہ کے یہودیوں کی ہے۔ کہ مفتوح ہونے پر جب انھوں نے وہیں رہنے کی درخواست کی تو شرائط طے کر کے ان کو رکھ لیا گیا۔

ان سارے واقعات کو سامنے رکھتے ہوئے یہ ماننا پڑتا ہے کہ تصادم سے بچ کر صلحیانہ تعلقات پیدا کرنا حکومت مدینہ کی سرگرمیوں کا اہم ترین شعبہ تھا۔ اور حضور علیہ السلام اور آپ ؐ کے رفقاء نے بہت ساری مہمات اسی شعبہ کار کے لیے اٹھائیں اور متعدد سفر کیے۔ یہ سرگرمیاں اسلامی ریاست کے امن پسندانہ نقطہ نظر کا بڑا بین ثبوت ہیں۔ پھر اس سلسلے میں حضور ﷺ نے ایک اصولی و نظریاتی ریاست کے تقاضے سامنے ہونے کے باوجود پالیسی میں یہاں تک وسعت رکھی کہ اسلام نہ لانے والے قبائل کی طرف سے محض سیاسی حلیفی کو بھی قبول کر لیا۔ اور متعدد صورتوں میں غیر مسلم سرداروں اور حاکموں کو اپنی طرف سے مامور یا بحال فرمایا۔ مدعا یہی تھا کہ تصادم کے مواقع کم سے کم رہ جائیں۔ بعد کا یہ فیصلہ تو بہت سارے تلخ تجربات کی روشنی میں کیا گیا۔ کہ کم سے کم جو سرزمین اسلامی تحریک کے گھر کی حیثیت رکھتی ہے، اس کے ماحول کو پاک اور پر امن رکھنے کے لیے اسے مخالف عناصر سے خالی کرا لیا جائے۔ ورنہ ان کی غدارانہ حرکات مسلمانوں کے لیے نقصان دہ ہوں گی۔

اوپر کے روابط کا تجزیہ کر کے دیکھیں تو یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ جہاں کہیں اسلام پہنچتا وہاں سے مدینہ کو سیاسی اطاعت از خود حاصل ہوتی۔ اور اسی طرح جہاں بھی سیاسی حلیفی کا تعلق قائم ہو گیا، وہاں بھی کچھ ہی مدت میں اسلام کا پرچم لہرانے لگا۔ اس کی وجہ ظاہر ہے کہ قبائل کا جب مدینہ سے میل جول بڑھتا گیا تو وہ اسلامی نظریہ حیات کے امتیازات کو سر کی آنکھوں سے دیکھ کر متاثر ہوتے ہوں گے۔ نیز ان کے اندر تحریک کے کارکنوں کو تبلیغی کام کرنے کے لیے پر امن فضا حاصل ہوتی گئی۔ دین و سیاست کی یہی وحدت تھی جس نے دس برس میں ہزاروں لوگوں کو اسلام کے رنگ میں رنگ دیا۔

معاہدہ حدیبیہ:

نبی کریم ﷺ نے مدینہ منورہ پہنچ کر مدینہ کی خارجی حفاظت کے لیے یہ تدبیر اختیار فرمائی تھی کہ مدینے سے باہر قبائل کو مصالحت کا پیغام دیا جائے اور ایسی صورت اختیار کی جائے کہ قریش جن کے فخر اور نخوت کا پارہ سارے قبائل عرب سے اونچا ہے وہ بھی مصالحت پر آمادہ ہو جائیں۔

---

[1] تاریخ طبری، ۳/ ۱۳۹

چنانچہ حضور ﷺ نے اس مقصد کے پیش نظر بذات خود مدینہ منورہ سے قبائل عرب کا سفر کیا اور مختلف قبائل سے مصالحت فرمائی۔

قریش سے مصالحت کا مسئلہ نہایت اہم تھا۔ ان کے لیے براہ راست پیغام مصالحت کے بجائے ایسے اسباب کا پیدا کرنا مناسب سمجھا گیا جو ان کو صلح پر مجبور کر دیں۔

غزوہ خندق کے بعد حضور ﷺ نے یہ اعلان فرمادیا کہ:

الآن نغزوهم ولا يغزوننا نحن نسير اليهم[1]

''اب ہم ان لوگوں پر حملہ کریں گے وہ لوگ ہم پر حملہ نہیں کریں گے۔''

یعنی نبی کریم ﷺ نے اس بات کا پورا پورا اندازہ فرمالیا کہ قریش میں اب اس کی طاقت نہیں رہی کہ وہ اپنی جنگی طاقت سے اسلام اور مسلمانوں کا استیصال کر سکیں گے۔ بلکہ ہم ہی ان پر چڑھائی کریں گے[2]

اندریں حالات نبی کریم ﷺ کے سامنے دو صورتیں تھیں:۔

۱۔ فدائیوں اور جانثاروں کی جماعت کو لے کر ان پر حملہ آور ہوں اور ان کے ساتھ بھی تادیبی کارروائی کریں اور ان کے ظالمانہ سلوک اور مسلمانوں کے ان جانی اور مالی نقصان کا بھرپور انتقام لیں جو انہوں نے مسلسل ابتدا بعثت سے غزوہ خندق تک پورے اٹھارہ سال پہنچائے۔

۲۔ صلح کا پیغام دیا جائے اور اس طریقہ سے دیا جائے کہ مؤثر اور کارگر ہو۔

نبی کریم ﷺ نے تادیب کی پہلی صورت کے مقابلہ میں مصالحت کی دوسری صورت کو پسند فرمایا۔ اس کی بھی دو وجوہات تھیں:

۱۔ اول یہ کہ حضور ﷺ کا مقصد صرف یہ تھا کہ ''عالمی مشن کی عالمی وتبلیغی دعوت'' کی راہ سے مزاحمت ختم ہو جائے۔ اور قریش دعوت حق کو کھلے دل سے بلا جبر و اکراہ اختیار کریں۔

۲۔ دوم یہ کہ نبی کریم ﷺ صلح ہی کو عالمی مشن کی دعوت کی کامیابی اور اثر اندازی کے لیے اختلاط، آپس کا میل جول، صلح و آشتی اور وسعت قلبی سے باہمی تبادلہ خیال اور گفتگو کے مواقع کو ضروری سمجھتے تھے۔ جو مصالحت ہی کی راہ سے حاصل ہو سکتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ رسول اللہ ﷺ نے مشرکین مکہ کی ہر وہ شرط قبول فرمائی جو بظاہر مسلمانوں کے خلاف تھی۔[3]

صلح حدیبیہ سے واپس مدینہ منورہ راستے ہی میں مصالحت پر ان الفاظ میں مبارک باد دی گئی:[4]

---

[1] الجامع الصحیح للبخاری، کتاب المغازی، باب غزوہ خندق (۴۱۱۰) الکتب الستہ، ص ۳۳۷

[2] زاد المعاد، ۳۰۲/۲

[3] ایضاً، ۳۱۹/۲

[4] سیرت ابن ہشام، ۳۳۳/۲

إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا[1]

"صلح حدیبیہ کے ذریعہ ہم نے آپ کو کھلی فتح دے دی"۔

اب تک مسلمان اور کفار ملتے جلتے نہ تھے۔ اب صلح کی وجہ سے باہم آمد و رفت شروع ہوئی۔ خاندانی اور تجارتی تعلقات کی وجہ سے کفار مدینہ منورہ میں آتے، مہینوں قیام کرتے اور مسلمانوں سے ملتے جلتے تھے۔ دینی مسائل کا تذکرہ بھی جاری رہتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ہر مسلمان اخلاص، حسن عمل، نیکوکاری، پاکیزہ اخلاق کی ایک زندہ تصویر تھا۔ جو مسلمان مکہ مکرمہ جاتے تھے ان کی صورتیں یہی مناظر پیش کرتی تھیں۔ اس سے خود بخود کفار کے دل اسلام کی طرف کھنچے آتے تھے اور مخفی طور پر جو مسلمان تھا وہ بھی ظاہر ہو گیا[2]۔

اس سے پہلے مسلمانوں کی جو تعداد تھی اس کے مساوی یا اس سے بھی زیادہ لوگ ان دو برسوں میں داخل اسلام ہوئے[3]۔

حضور ﷺ نے چودہ سو صحابہ کے ساتھ "عمرہ" کا عزم کیا اور اس کے ذیل میں پیغام صلح کو رکھا۔ آگے چل کر نبی کریم ﷺ کا یہ اندازہ صحیح ثابت ہوا کہ قریش کے قومی مزاج میں مصالحت کی قبولیت کی استعداد پیدا ہو گئی تھی[4]۔

جب حدیبیہ میں حضور ﷺ نے قریش کو "پیغام صلح" دیا تو پس و پیش کے بعد یہ پیغام کامیاب ہوا۔ اور معاہدہ صلح پرسکون فضا میں طے ہوا۔

حدیبیہ میں سفارتی سرگرمیاں

دربار رسول اللہ میں قریش کا پہلا سفر:

حدیبیہ میں پہنچتے ہی سفارتی سرگرمیاں شروع ہو گئیں۔ سب سے پہلے قبیلہ خزاعہ کے سردار بدیل بن ورقاء اپنے چند اہم ساتھیوں سمیت حضور ﷺ سے آکر ملے اور آپ کی آمد کا مقصد دریافت کیا۔ ساتھ ہی قریش کے لشکر اور ان کے آپ کو مکہ میں داخل ہونے کے عزم کے متعلق بتایا۔ حضور ﷺ نے اسے بتایا کہ:

"ہم صرف زیارت حرم کے لیے آئے ہیں اور اس کی تعظیم ہمارے پیش نظر ہے۔ جنگ مقصود نہیں"[5]۔

بدیل نے قریش کو بتایا:

"دیکھو جلد بازی نہ کرو۔ محمد (ﷺ) جنگ کے لیے نہیں، زیارت کے لیے آئے ہیں"[6]۔

---

1. الفتح ۱:۴۸
2. زاد المعاد، ۳۱۸/۲
3. سیرت ابن ہشام، ۳۳۶/۳۔۳۳۷
4. تاریخ طبری، ۶/۳
5. ابن اثیر، ۸۳/۲
6. سیرت ابن ہشام، ۳۲۵/۳

اس پر قریش بہت بگڑے اور کہا کہ:

"اگر چہ آپ جنگ و جدل کے ارادے سے نہیں آئے لیکن ہم ان کو مکہ میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔"[۱]

قریش کی دوسری سفارت:

اس کے بعد قریش نے عامر بن لوئی قبیلے کے مکرز بن حفص کو پیغمبر اسلام کے پاس بھیجا۔ یہ اپنے قبیلے کے شاہسواروں اور جنگ جو لوگوں میں سے تھا۔[۲] اسے دیکھ کر حضور ﷺ نے فرمایا:

"یہ شخص عہد شکنی کرنے والا ہے۔"[۳]

وہ جب حضور ﷺ کے پاس آیا اور بات چیت کی تو حضور نے اس سے بھی وہی مدعا بیان کیا جو بدیل سے فرمایا تھا۔ اس نے بھی جا کر قریش کو حضور ﷺ کے مدعا سے مطلع کر دیا۔[۴]

قریش کا تیسرا سفیر دربار رسولؐ میں:

مکرز کے بعد قریش نے حلیس بن علقمہ کو بھیجا جو کہ ان دنوں احابیش کا سردار تھا اور بنی حارث کا ایک فرد تھا۔ قریش کا مقصد یہ تھا کہ اگر محمد (ﷺ) نے حلیس کو ٹھکرا دیا تو یہ قبیلہ ہمارا طرفدار ہو جائے گا۔ حضور ﷺ نے اسے دیکھ کر فرمایا کہ:

"یہ شخص عبادت گزار قوم سے تعلق رکھتا ہے۔ اسے قربانی کے جانور دکھا دیے جائیں۔"[۵]

حلیس نے جب قربانی کے جانوروں کا گلہ قلادہ سمیت وادی میں متحرک دیکھا تو وہ بہت متاثر ہوا۔ وہ رسول اللہ ﷺ تک پہنچے بغیر ہی واپس چلا گیا۔ اس نے قریش کو مسلمانوں کے مکہ میں داخلہ کے سوال پر آمادہ کرنے کی کوشش کی۔ اور اس نے صاف صاف کہہ دیا کہ ان زائرین حرم کو روکنا صحیح نہیں۔ قریش نے کہا کہ:

"تم تو نرے دیہاتی ہو تمہیں کسی بات کا علم نہیں۔"[۶]

قریش کا چوتھا سفیر دربار رسالت میں:

عروہ بن مسعود ثقفی بھی مجلس میں موجود تھا۔ اس نے جب رسول اللہ ﷺ کی شرائط صلح سنی تو وہ اٹھ کھڑا ہوا اور یوں گویا ہوا:

---

[۱] سیرت ابن ہشام، ۳۲۵/۳

[۲] الاشتقاق، ۱۱۵/۱

[۳] البدایہ والنہایہ، ۱۶۶/۴

[۴] سیرت سیرت ابن ہشام، ۳۲۶/۳

[۵] ایضاً، ۳/ ۳۲۶

[۶] ایضاً، ۳۲۶/۳

''کیوں قریش! کیا میں تمہارا باپ اور تم میرے بچے نہیں ہو؟ لوگوں نے کہا''ہاں'' عروہ نے کہا ''میری نسبت تم کو کوئی بدگمانی تو نہیں''۔ سب نے کہا''نہیں''۔ اس پر عروہ نے کہا کہ محمد (ﷺ) نے جو پیغام بھیجا ہے وہ پسندیدہ، مستحسن اور قابل قبول ہے۔ اگر تم مجھ کو اجازت دو تو میں ان سے گفتگو کروں اور دیکھوں کہ مصالحت کا کیا تقاضا ہے۔''[۱]

عروہ جب حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو اس نے کہا:

''اے محمدؐ! اگر آپ نے اپنی ہی قوم کو تباہ کر دیا تو یہ کون سا اچھا کارنامہ ہوگا۔ یہ جو اوباش سے لوگ آپ نے اکٹھے کر لیے ہیں۔ یہ چند روز میں الگ ہو جائیں گے تو آپ تنہا رہ جائیں گے۔ یاد رکھیں کہ قریش چیتے کی کھالوں میں ملبوس ہیں اور وہ آپ کو مکہ میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔''[۲]

حضور ﷺ نے عروہ کے سامنے بھی اپنا موقف بیان کر دیا۔ دوران ملاقات عروہ نے ایسے بھی روح پرور مناظر دیکھے کہ مسلمان آپ ﷺ کے لعاب دہن کو نیچے نہیں گرنے دیتے۔ آپ وضو کرتے ہیں تو وضو کا پانی نیچے گرنے نہیں دیتے۔ بلکہ عقیدت کیش ہاتھوں ہاتھ لے لیتے ہیں۔ اور چہرہ اور ہاتھوں میں مل لیتے ہیں[۳]۔ ان باتوں سے وہ بے حد متاثر ہوا اور اس نے واپس جا کر بیان کیا کہ محبت و اطاعت کا جو منظر وہاں میری نگاہوں سے گزرا ہے وہ تو قیصر و کسریٰ اور نجاشی جیسے بڑے بڑے بادشاہوں کے درباروں میں بھی نہیں پایا جاتا۔ محمدؐ کے ساتھی تو اس پر جان چھڑکتے ہیں اور ایک ایک اشارے پر کٹ مرنے کے لیے تیار ہیں۔ اس کے سامنے کوئی شخص اونچی آواز میں بولنے تک کی جرأت نہیں کرتا۔ بہتر ہے کہ تم اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرو۔ میری رائے ہے کہ ان سے صلح کر لو جس طرح بھی ہے۔

رسول اللہ ﷺ کا سفیر قریش مکہ کی طرف:

قریش کے پے در پے سفیروں کی آمد اور ان کی واپسی کے بعد رسول مقبول ﷺ نے یہ اندازہ لگایا کہ چونکہ معاملہ ناتمام رہ گیا ہے اور ہو سکتا ہے کہ واپس جا کر قریش کے سفیر ان پر پوری کیفیت ظاہر نہ کرتے ہوں۔ لہٰذا اپنا سفیر بھیج کر حالات کا پوری طرح جائزہ لینا چاہیے۔ چنانچہ حضور نے خراش بن امیہ خزاعی کو بلا کر اسے اپنے ثعلب نامی اونٹ پر اپنی طرف سے پیام صلح لے کر قریش کی طرف بھیجا۔ کچھ لوگوں نے حضور ﷺ کے اس اونٹ کو مار ڈالا جس پر سوار ہو کر خراش شہر میں گئے تھے۔ خود خراش کو بھی شہید کر دینے کا ارادہ کیا مگر احابیش کی مداخلت پر وہ ایسا نہ کر سکے۔ اور وہ ناکام واپس آ گئے۔[۴]

۱؎ زادالمعاد، ۳۰۵/۲

۲؎ البدایہ والنہایہ، ۱۶۶/۴

۳؎ الجامع الصحیح للبخاری، کتاب الشروط، باب الشروط فی الجہاد، (۳۲)(۲۷۳۱) الکتب الستۃ، ص ۲۱۷

۴؎ سیرت ابن ہشام، ۳۲۸/۳

رسول اللہ ﷺ کی سفارت کے جواب میں قریش مکہ کی شرارت:

رسول اللہ ﷺ کے سفیر کے واپس چلے جانے کے بعد قریش نے اپنے چالیس یا پچاس نوجوانوں کا ایک دستہ بھیجا کہ مسلمانوں پر شب خون ماریں۔ انھوں نے پہلے تو مسلمانوں پر پتھراؤ کیا اور تیر برسائے۔ اس پر مستزاد یہ کہ اشتعال انگیز کلمات بکتے پھرے۔ سب گرفتار کر لیے گئے۔ آپ نے سب کو چھوڑ دیا اور معافی دے دی۔[۱]

عثمانؓ، سفیر رسولؐ اور بیعت رضوان:

آخر کار نبی کریم ﷺ نے حضرت عمرؓ کو مسلمانوں کا نکتہ نظر واضح کرنے کے لیے مکہ بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ فاروق اعظم نے عرض کی کہ میرے متعلق قریش کی برہمگی حضور سے پوشیدہ نہیں۔ مکہ میں میرے خاندان عدی کا کوئی آدمی بھی موجود نہیں۔ البتہ آپ کی خدمت میں ایک ایسے شخص کا نام پیش کرتا ہوں جو اس کام کے لیے نہایت موزوں اور اہم ہے۔ اور مکہ میں بھی نہایت عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ وہ حضرت عثمان بن عفان ہیں۔

نبی کریم ﷺ نے حضرت عمرؓ کے مشورے کو قبول فرمایا اور حضرت عثمانؓ بن عفان کو سفیر بنا کر شرفائے مکہ سے مذاکرات کی خاطر روانہ فرمایا اور یہ تاکید فرمائی کہ قریش کو سمجھائیں کہ ہم صرف عمرہ کے لیے آئے ہیں۔ لڑنا ہمارا مقصود نہیں ہے۔ مکہ میں داخلہ سے قبل حضرت عثمانؓ کی ملاقات ان کے ایک عزیز ابان بن سعید بن العاص سے ہوگئی۔ جنھوں نے ان کو مکہ میں اپنے ہاں پناہ دی۔ تاکہ وہ رسول اللہ ﷺ کا پیغام عمائدین قریش کو پہنچا سکیں۔[۲]

وہ مکہ ہی میں تھے کہ غلط خبر مشہور ہوگئی کہ حضرت عثمانؓ قتل کر دیے گئے ہیں۔ حضور ﷺ نے فوراً جماعت کو اکٹھا کیا اور فرمایا کہ اب ہم فیصلہ کن جنگ کے بغیر یہاں سے نہیں ہٹیں گے۔[۳]

یہ کہہ کر حضور نے ایک ببول کے درخت کے نیچے بیٹھ کر صحابہ سے جاں نثاری کی بیعت لی۔[۴]

رسول اللہ ﷺ نے عثمان کی طرف سے خود بیعت لی تھی وہ یوں کہ اپنے بائیں ہاتھ کو عثمان کا داہنا ہاتھ قرار دیا۔[۵]

اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:

لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ[۶]

''اللہ مومنوں سے خوش ہو گیا جب وہ درخت کے نیچے تم سے بیعت کر رہے تھے۔''

۱۔ سیرت ابن ہشام، ۳۲۹/۳

۲۔ ایضاً

۳۔ ایضاً

۴۔ تاریخ طبری، ۷۸/۳

۵۔ سیرت ابن ہشام، ۳۳۰/۳

۶۔ الفتح ۱۸:۴۸

اس وقت نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

''آج کے دن تم لوگ تمام زمین والوں سے افضل ہو۔''

بعد میں معلوم ہوا کہ حضرت عثمانؓ کی شہادت کی خبر بے بنیاد تھی۔

رسول اللہ ﷺ کی حکمت عملی:

قریش کی پیدل اور سوار فوج اس وقت مکہ معظمہ سے کافی دور تھی۔ رسول اللہ ﷺ کے لیے یہ بہت اچھا موقع تھا کہ آپ حضرت عثمانؓ کی شہادت کی خبر کو جنگ کے لیے وجہ جواز بنا کر بزور مکہ معظمہ میں داخل ہو کر اسے فتح کر لیتے۔ اس وقت مکہ معظمہ کی فتح میں ذرا بھی شک وشبہ کی گنجائش نہ تھی۔ لیکن اس میں زبردست خون ریزی ہوتی۔ مگر چونکہ آپ کا مقصد محض فتوحات حاصل کرنا نہ تھا بلکہ امن وآشتی کا قیام اور فساد وطغیان کی بیخ کنی کرنا تھا۔ اس لیے آپ نے بہر طور مصالحت ہی کو پسند فرمایا۔

رسول اللہ ﷺ نے تمام غزوات میں اس بات کو مدنظر رکھا ہے کہ مفتوحہ علاقوں کے لوگ حقیقی اور مستقل امن سے قریب تر ہوں اور اسلام کے عملی اصولوں کو اختیار کر کے اپنے کو مفتوح ومغلوب نہ سمجھیں بلکہ اسلامی مساوات کے رشتے میں منسلک ہو کر ''کل مومن اخوۃ'' کا نمونہ بن جائیں اور دنیا کی عظمی وقیادت کے منصب جلیلہ پر فائز ہو کر دارین کی کامیابی حاصل کریں۔ اس لیے اس موقع پر بھی حضور نے صلح کو جنگ پر ترجیح دی۔

قریش کے سفیر سہیل بن عمرو:

شروع میں اگرچہ قریش کو یہی اصرار تھا کہ مسلمان مکہ مکرمہ میں قدم نہیں رکھ سکتے۔ مگر جب انھیں رسول اللہ ﷺ کی تیاری کا حال معلوم ہوا تو مرعوب اور خوفزدہ ہو گئے اور صلح کے لیے نامہ پیام کا سلسلہ شروع کیا[1] اور مسلمانوں کے ساتھ تجدید مذاکرات کے لیے سہیل بن عمرو کو حضور ﷺ کی خدمت میں صلح کا سفیر بنا کر بھیجا۔

سفیروں کی کانفرنس:

بحث وتمحیص کے بعد بالآخر چند شرطوں پر اتفاق ہوا۔ سرور عالم ﷺ نے حضرت علیؓ کو بلا کر معاہدہ لکھنے کا حکم دیا۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت علیؓ سے فرمایا ''لکھو بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ سہیل نے کہا ہم بسم اللہ الرحمن الرحیم نہیں جانتے۔ آپ ''باسمک اللھم'' لکھیے۔ حضور ﷺ نے حضرت علیؓ سے فرمایا 'اچھا یہی لکھ دو'۔ اس کے بعد آپ نے لکھوایا کہ ''یہ وہ معاہدہ ہے جو محمد رسول اللہ اور سہیل بن عمرو کے درمیان طے پایا''۔ سہیل نے کہا ''اگر ہم آپ کو پیغمبر تسلیم کرتے تو پھر جھگڑا کیا تھا۔ آپ صرف اپنا اور اپنے والد کا نام لکھوائیے۔ رحمت عالم ﷺ نے فرمایا ''گو تم جھٹلاتے ہو، لیکن خدا کی قسم میں خدا کا پیغمبر ہوں۔'' یہ فرما کر آپ نے حضرت علی سے فرمایا کہ ''اچھا اسی طرح لکھو۔''[2]

---

[1] واقدی محمد بن عمر وابن واقد، کتاب المغازی، مطبع جامعہ آکسفورڈ لندن ۱۹۶۶ء، ۶۰۵/۲

[2] البدایہ والنہایہ ۱۷۵/۲

مسلم شریف میں حضرت براء بن عازب کی روایت ہے کہ:

''حضور ﷺ نے حضرت علیؓ سے فرمایا کہ رسول اللہ کے الفاظ کو مٹادو۔ حضرت علی نے عرض کی کہ میری مجال نہیں ہے۔ تو آپ نے فرمایا کہ ''وہ جگہ مجھ کو بتادو'' جب آپ کو وہ جگہ بتادی گئی تو آپ نے خود مٹادیا۔''[1]

شرائط صلح حدیبیہ:

حسب ذیل شرائط پر معاہدہ لکھا گیا:

۱۔ یہ وہ صلح نامہ ہے جس میں محمد بن عبداللہ اور سہیل بن عمرو نے صلح کی ہے۔

۲۔ دونوں نے دس سال تک ہتھیار رکھ دینے کا عہد کیا۔

۳۔ اس مدت میں فریقین کا ہر شخص مامون و محفوظ ہوگا اور کوئی کسی سے تعرض نہیں کرے گا۔ جانبین کی آمدورفت میں کسی کو روک ٹوک نہ ہوگی۔

۴۔ اس طور پر کہ نہ خفیہ چوری ہو، نہ خیانت ہو۔

۵۔ یہ معاہدہ جانبین کے درمیان ایک صندوق کی مانند ہے۔ (انسداد فتنہ کے لحاظ سے ایک بند صندوق کا حکم رکھتا ہے جس میں باہر سے کوئی غداری داخل نہ ہو سکے گی۔)

۶۔ قبائل عرب کو اختیار ہوگا کہ وہ چاہے تو محمد (ﷺ) کے ساتھ معاہدہ میں شامل ہو جائیں۔ چاہے قریش کے ساتھ معاہدہ میں شریک ہو جائیں۔ (قبیلہ خزاعہ نے اعلان کر دیا کہ ہم محمدؐ کے ساتھ معاہدہ میں شامل ہیں تو بنو بکر نے قریش کے ساتھ رہنے کا اعلان کر دیا)۔

۷۔ قریش کا اگر کوئی شخص اپنے ولی کی اجازت کے بغیر مدینہ منورہ میں محمدؐ کے پاس جائے گا تو وہ اسے واپس کر دیں گے۔ لیکن اگر کوئی شخص اسلام چھوڑ کر قریش کے پاس مکہ میں چلا جائے تو وہ اس کو واپس نہیں کریں گے۔

۸۔ اس سال محمد (ﷺ) اپنے اصحاب سمیت واپس چلے جائیں اور مکہ میں داخل نہ ہوں۔

۹۔ اگلے سال مکہ آئیں اور صرف تین دن قیام کر کے واپس چلے جائیں۔

۱۰۔ ہتھیار ساتھ نہ لائیں، صرف تلوار ساتھ لائیں جو مسافروں کا ہتھیار ہے۔ وہ بھی اس طرح کہ وہ نیام میں ہو اور نیام تھیلے میں ہو۔

عین اسی حالت میں جب کہ معاہدہ لکھا جا رہا تھا سفیر قریش سہیل بن عمرو کے صاحبزادے ابوجندل بیڑیاں پہنے ہوئے موقع پر آپہنچے۔ ان کو مارا پیٹا گیا تھا اور وہ مظلومی کا ایک مجسمہ تھے۔ انھوں نے اپنے آپ کو سرور عالم ﷺ اور مسلمانوں کے سامنے

---

[1] ابن اثیر الجزری علی بن ابی الکرم، تاریخ الکامل، ج ۲، ص ۸۴

پیش کر دیا۔ سہیل بن عمرو نے کہا کہ معاہدہ کی مجوزہ شرط کے مطابق یہی پہلا شخص ہے جسے آپ کو واپس کرنا ہوگا۔ حضور نے معاملہ سلجھانے کے لیے فرمایا کہ "ابھی معاہدہ لکھا نہیں جا چکا۔ اس لیے معاہدہ لکھے جانے اور دستخط ہو جانے کے بعد سے اس پر عمل شروع ہونا چاہیے۔ سو ابو جندل کو مستثنیٰ رہنے دو۔[1]

سہیل نے کہا تو پھر کوئی مصالحت نہیں ہو سکتی۔ پھر آپ ﷺ نے نرمی سے یہ بھی فرمایا کہ اچھا اسے میری خاطر میرے ساتھ آنے دو۔ مگر سہیل نہیں مانا۔ مجبوراً حضور ﷺ نے اس ظالمانہ مطالبہ کو بڑے مصالح کی خاطر قبول کر لیا۔ اب ابو جندل نے اراکین وفد کو مخاطب کر کے کہا کہ:

> "مسلمانو! تم مجھے مشرکوں کے حوالے کر رہے ہو جو مجھے ایمان سے ہٹانے کے لیے مجھ پر تشدد کریں گے۔"[2]

حضور ﷺ نے نہایت نرمی سے ابو جندل کو سمجھایا اور ساتھ ہی تسلی کے لیے اسے یہ ضمانت عطا فرمائی کہ:

> "ہم نے معاہدہ میں ایک بات تسلیم کر لی ہے تو اب عہد شکنی نہیں کر سکتے۔ تمہارے لیے اور تمہارے مظلوم بے بس ساتھیوں کے لیے بلاشبہ اللہ تعالیٰ کوئی راہ نجات نکالے گا۔ ذرا صبر سے کام لو۔"[3]

اراکین مشن اسلامی کا اضطراب اس وقت آخری حد کو چھو رہا تھا اور قریش کے خلاف ساری جماعت کے جذبات مجتمع ہو کر جس شخص کے اندر کھول رہے تھے وہ حضرت عمرؓ تھے۔ ان کا کوئی ذاتی اور نفسانی معاملہ نہیں تھا۔ ان کے اندر حمیت حق ہی کام کر رہی تھی۔ پیچ و تاب کے عالم میں انھوں نے پہلے ابو بکرؓ سے پھر رسول اکرم ﷺ سے یوں بات چیت کی:

> "یا رسول اللہ! کیا ہم حق پر نہیں ہیں؟ اور کیا کفار باطل پر نہیں ہیں؟" آپ نے فرمایا "ہاں ایسا ہی ہے" تو حضرت عمرؓ نے عرض کیا "پھر ہم دین کے بارے میں یہ ذلت کیوں گوارا کریں اور جب تک کہ ہمارے اور ان کے درمیان میں اللہ فیصلہ نہ فرما دے ہم کیوں اس سال واپس جائیں۔"

اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

> "میں اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں۔ میں ہرگز اس کے حکم کے خلاف نہیں کروں گا اور اللہ ہرگز مجھ کو برباد نہیں کرے گا۔"[4]

معاہدہ حدیبیہ برکات کا معاہدہ:

حدیبیہ کا یہ سفر بہت خیر و برکت کا موجب رہا۔ رسول اللہ ﷺ نے معاندین کے ساتھ معاہدہ کرنے میں فیاضی، احتیاط اور حملہ آوروں کی معافی میں عفو سے کام لیا۔

---

[1] زاد المعاد ۲/۳۰۷

[2] ایضاً

[3] سیرت ابن ہشام، ۳۲۳/۳

[4] الجامع الصحیح للبخاری، کتاب الشروط، باب الشروط فی الجہاد ..... (۲۷۳۲) المکتبۃ السلفیۃ، ص ۲۱۸

دو ہفتہ قیام کرنے کے بعد حدیبیہ ہی سے حضور مدینہ منورہ کو واپس تشریف لے گئے۔ اس معاہدہ کے بعد سورہ فتح کا نزول حدیبیہ میں ہوا۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا یا رسول اللہؐ! کیا یہ معاہدہ ہمارے لیے فتح ہے۔ فرمایا "ہاں" [۱]

صلح سے قبل کفار مکہ سے ہر بات چھپی ہوئی تھی۔ اس لیے اسلام اور مسلمان کا نور ان سے پوشیدہ تھا۔ صلح کی وجہ سے جب عداوت اور منافرت دلوں سے دور ہوئی تو اب کچھ ہوش آیا اور اللہ والوں کی پیشانی کا نور ان کو نظر آیا۔[۲]

رسول اللہ ﷺ جب مدینہ پہنچے تو ابو بصیر مشرکین کی قید و بند سے بھاگ کر مدینہ پہنچے۔ قریش نے فوراً دو آدمی ان کو لانے کے لیے پیچھے روانہ کیے۔ حضور نے از روئے معاہدہ ابو بصیر کو ان دونوں آدمیوں کے سپرد کر دیا۔ اور ابو بصیر سے فرمایا کہ میں وعدہ خلافی نہیں کر سکتا۔ تم چلے جاؤ اور صبر کرو۔ اللہ تعالیٰ سے امید رکھو عنقریب اللہ تعالیٰ تمہاری نجات کی صورت پیدا فرما دے گا۔[۳]

یہ دونوں آدمی ابو بصیر کو لے کر روانہ ہوئے۔ جب ذوالحلیفہ میں پہنچے تو دم لینے کے لیے ٹھہر گئے اور کھجوریں کھانے لگے۔ ابو بصیر نے ان میں سے ایک سے کہا کہ تمہاری تلوار بہت عمدہ معلوم ہوتی ہے۔ اس نے تلوار کو نیام سے نکال کر کہا کہ ہاں خدا کی قسم! یہ بہت عمدہ تلوار ہے بارہا اس کو میں آزما چکا ہوں۔ ابو بصیر نے کہا مجھ کو بھی دکھلا دو۔ اس نے تلوار ابو بصیر کو دے دی۔ ابو بصیر نے تلوار لے کر فوراً ہی اس پر ایک وار کیا اور اس کو ٹھنڈا کر دیا۔ دوسرا شخص یہ واقعہ دیکھتے ہی بھاگ گیا اور مدینہ منورہ میں حضور ﷺ کی خدمت میں پہنچ گیا۔ اتنے میں ابو بصیر بھی وہاں پہنچ گئے اور عرض کی یا رسول اللہ! آپ نے اللہ تعالیٰ کے عہد کو پورا فرمایا اور مجھے مشرکین کے حوالہ کیا لیکن اللہ تعالیٰ نے میری مدد فرمائی اور ان سے نجات دی۔[۴]

ابو بصیرؓ ساحل سمندر پر جا کر ٹھہر گئے۔ جس راستے میں قریش کے کاروان تجارت شام کو آتے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہاں مکہ کے بے کس اور بے بس مسلمانوں کا جتھہ جمع ہو گیا۔ قریش کا جو قافلہ وہاں سے گزرتا اس کو لوٹ لیتے اور گزر اوقات کرنے لگے۔ قریش نے مجبور ہو کر حضور ﷺ کی خدمت میں آدمی بھیجے کہ ہم معاہدہ کی اس شق کو واپس لیتے ہیں۔ اس پر حضور ﷺ نے ابو بصیر کو خط لکھوا کر روانہ کیا۔ جس وقت وہ والا نامہ ابو بصیر کو ملا وہ زندگی کی آخری سانس لے رہے تھے۔ وہ مکتوب گرامی پڑھتے جاتے تھے اور خوش ہوتے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ وہ فوت ہو گئے اور خط ان کے سینے پر تھا۔[۵]

معاہدہ کی اہمیت و افادیت:

۱۔ ایسی صلح اور معاہدہ دراصل جہاد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کیونکہ جہاد سے مقصود کفر اور غیر مسلموں کے شر کو دور کرنا ہے جو اس قسم کے معاہدہ سے حاصل ہوتا ہے۔[۶]

۱۔ طبقات ابن سعد، ۹۸/۲

۲۔ زاد المعاد، ۳۱۸/۲

۳۔ سیرت ابن ہشام، ۳۲۷/۳

۴۔ ایضاً، ۳۲۷/۳

۵۔ السہیلی، عبدالرحمٰن بن احمد۔ الروض الانف، مطبع الجمالیہ، مصر، ۱۹۱۳ء، ۲۳۳/۲

۶۔ زاد المعاد، ۳۱۴/۲۔۳۱۵

۲۔ اگر صلح اور معاہدہ کرنے میں اسلام، ملک وملت اور عوام کا فائدہ نہ ہو تو صلح اور معاہدہ کرنا جائز نہیں۔ کیونکہ ایسی صلح اور معاہدہ مسلمانوں کی تذلیل کا سبب ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَلَا تَهِنُوا وَتَدْعُوا إِلَى السَّلْمِ وَأَنْتُمُ الْأَعْلَوْنَ [۱]

''تم سستی نہ کرو اور صلح کی طرف بلاؤ اور تم ہی غالب رہو گے۔''

یعنی دفاعی تدابیر رکھنے اور ساز و سامان کی فراہمی کے باوجود قدرت رکھتے ہوئے غیر مسلموں سے صلح جائز نہیں ہے۔ ایسے حال میں صلح کرنا مصلحت نہیں بلکہ بزدلی ہے۔

۳۔ ضرورت کے وقت دینی بھلائی کی خاطر غیر مسلموں سے صلح اور معاہدہ جائز ہے۔ بلکہ مستحب ہے خواہ بلا معاوضہ ہو یا کچھ دے دلا کر یا لے کر ہو۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے ہجرت مدینہ کے بعد یہود مدینہ سے کچھ لیے دیے بغیر معاہدہ فرمایا[۲] اور پھر صلح حدیبیہ میں یہی طریق اختیار کیا گیا۔ نجران کے نصاریٰ سے حضور ﷺ نے مال ٹھہرا کر صلح فرمائی[۳]۔ اور غزوہ خندق میں عیینہ بن حصن سے مدینہ کی ثلث کھجوریں دے کر صلح کا ارادہ فرمایا[۴]

معلوم ہوا کہ تینوں طرح صلح اور معاہدہ جائز ہے۔

۴۔ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے مابین اگر کوئی معاہدہ یا صلح کسی مدت معینہ تک طے پا جائے تو ضبط تحریر میں لے آنا مناسب ہے۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے صلح حدیبیہ کے وقت کیا۔

۵۔ شرائط صلح میں سے کسی شرط کے خلاف کرنا بدعہدی اور عہد شکنی ہے۔ اس بنا پر رسول اللہ ﷺ نے ابو جندلؓ اور ابو بصیرؓ کو یہ کہہ کر واپس کیا کہ ہم عہد کر چکے ہیں۔ اس کے خلاف نہیں کریں گے۔

۶۔ امیر لشکر کے لیے اس بات کی اجازت ہے کہ وہ دشمن کے حالات سے باخبر ہونے کے لیے اپنے جاسوسوں کو روانہ کرے۔

۷۔ شریف النفس غیر مسلم سے ضرورت کے وقت مدد لینا جائز ہے۔ جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے خزاعی کے جاسوسوں کی مدد لی۔ چونکہ وہ کافروں کے قریب آ جا سکتے ہیں۔ اس لیے آسانی سے ان کی خبریں معلوم کر سکتے ہیں۔[۵]

۸۔ اگر سربراہ حکومت مصلحت کے تقاضوں کے پیش نظر دشمن سے صلح کرنے میں پہل کرے تو جائز ہے۔[۶]

معاہدہ حدیبیہ کی رو سے مسلمانوں کا حق زیارت کعبہ تسلیم کر لیا گیا۔ جس کے معنی یہ ہوئے کہ اسلام کو بھی ایک مذہب کی حیثیت سے تسلیم کر لیا گیا۔ قریش سے دس برس تک جنگ نہ کرنے کے عہد پر دستخط کرانا حضور ﷺ کی سیاست کاری کی بہت بڑی دلیل ہے۔ قریش کی جانب سے لڑائی کا خطرہ ٹل جانے کے باعث مسلمان دل جمعی سے تبلیغ اسلام کر سکتے تھے۔

۱۔ محمد ۴۷: ۳۵

۲۔ سیرت ابن ہشام، ۱۴۷/۲

۳۔ طبقات ابن سعد، ۳۵۸/۱

۴۔ تاریخ طبری، ۴۸/۳

۵۔ فتح الباری، ۲۲۶/۵

۶۔ زاد المعاد، ۳۱۸/۲

قریش تجارتی اور خاندانی تعلقات کی بنا پر مدینہ میں آ کر قیام کرتے اور مسلمانوں کے اخلاق و تعلیمات سے متاثر ہوتے۔ اسلام کے متعلق اعلانیہ مناظرے ہونے لگے اور مخفی طور پر جو مسلمان تھا وہ بھی ظاہر ہو گیا۔[۱]

معاہدہ حدیبیہ کے بعد نبی کریم ﷺ نے عامۃ الناس کو اسلام کی دعوت دینے کے ساتھ ساتھ قرب و جوار کے جاگیرداروں اور بادشاہوں کو بھی اسلام کی دعوت بھیجی۔

اسی معاہدہ کے بعد قریش کے دو نامور جرنیل خالد بن ولید اور عمرو بن العاص نے اسلام قبول کیا۔[۲]

تین برسوں ہی میں پورا جزیرہ نمائے عرب سرنگوں ہو گیا۔ اور پندرہ برس میں اسلامی ریاست تین براعظموں پر پھیل گئی۔

فتح مبین:

صلح حدیبیہ کو قرآن کریم نے "فتح مبین" اور "نصر عزیز" کے ناموں سے یاد کیا ہے:

إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا ○ [۳] وَيَنصُرَكَ اللَّهُ نَصْرًا عَزِيزًا [۴]

یہ معاہدہ فتح عظیم کا مقدمہ تھا۔ قرآن مجید نے اسے فتحاً قریباً سے تعبیر دی۔ ابن ہشام نے اس سے مراد فتح مکہ لی ہے[۵]۔ حافظ ابن قیم نے لکھا ہے کہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس سے مراد فارس اور روم کی فتوحات ہیں[۶] اور بعض فتح خیبر کے بعد آفاق عالم پر فتوحات کا سلسلہ مراد لیتے ہیں۔[۷]

رسول اللہ ﷺ کی سیاست خارجہ کا شاہکار:

اس معاہدے کے طے کرنے میں نبی کریم ﷺ کی سیاسی حکمت اور قائدانہ بصیرت نے آنے والوں کے لیے رہنمائی کی راہ متعین کر دی۔ مدینہ منورہ کے شمال میں بڑھتے ہوئے صیہونی خطرے کے پیش نظر مسلمانوں کو ہر قیمت پر قریش سے صلح کرنی تھی۔ تاکہ ایک طرف سے سکون و آرام میسر آنے کے بعد دوسرے دشمن پر کاری ضرب لگائی جا سکے۔ ورنہ اس بات کا خطرہ تھا کہ کہیں صیہونی طاقتوں کا قریش سے اتحاد مسلمانوں کے لیے پریشانی کا باعث نہ بن جائے۔ اس لیے آپ نے ابو جندل کو سہیل کے حوالے کر کے معاہدہ پر دستخط ثبت کر دیے اور وہیں سے واپسی اختیار کی۔ اس طرح آپ کی حکمت عملی نے قریش اور صیہونی مرکز کو پاش پاش کر دیا۔

۱۔ زاد المعاد، ۲/۳۱۵

۲۔ ابن حجر عسقلانی۔ فتح الباری، احیاء التراث العربی بیروت، لبنان، ۱۹۸۸ء، ۷/۳۳۵

۳۔ الفتح ۴۸:۱

۴۔ الفتح ۴۸:۳

۵۔ سیرت ابن ہشام، ۳/۳۳۷

۶۔ زاد المعاد، ۲/۳۲۲

۷۔ ایضاً، ۲/ ۳۲۲

یہ سیاست کاری کا شاہکار تھا۔ قریش کا چڑھتا ہوا جوش اور بخار اس صلح کے (Safty Value) سے خارج ہو گیا۔ عین اس لمحے خیبر کے یہودیوں اور مکے کے قریشیوں میں اتحاد ہو کر ایک نئے طاقت ور محاصرہ مدینہ کی جو تجویز تیار ہو چکی تھی۔ وہ روک دی گئی۔ کیونکہ قریش نے اپنی منہ مانگی شرطوں کے ملنے اور تجارت کا شمالی راستہ کھلنے پر وعدہ کیا تھا کہ وہ دس سال تک آنحضرت ﷺ سے نہ تو خود جنگ کریں گے اور نہ کسی کو کوئی خفیہ یا اعلانیہ مدد دیں گے۔ بلکہ مسلمانوں کی جنگوں میں بالکل غیر جانبدار رہیں گے۔ اس صلح سے حضور ﷺ کو یہ فائدہ ہوا کہ سفارتی مشنوں کی تشکیل کے لیے ہاتھ کھل گئے۔ خطرے کے مرکز خیبر کو ہمیشہ کے لیے مٹا دیا گیا۔

معاہدات بنو عریض و بنو غازیہ:

آپ ﷺ نے بحرین کے یہودیوں، بنو عریض اور بنو غازیہ کے ساتھ اطاعت، جزیہ اور اپنے دین پر استقرار کی صورت میں معاہدہ کیا۔

خیبر کا معاہدہ:

حدیبیہ سے واپسی کے دوران میں اللہ تعالیٰ نے ایک اور بڑی فتح کی خوشخبری بھی سنائی۔ آپ ﷺ نے اس خوشخبری سے یہی نتیجہ نکالا کہ یہ فتح خیبر کی بشارت ہے۔ کچھ دنوں کی تیاری کے بعد آپ ﷺ انھی جانثاروں سمیت خیبر پر حملہ آور ہوئے اور تقریباً دو ماہ بعد خیبر کے بارہ قلعے مکمل طور پر مفتوح ہو گئے۔ اہل خیبر نے نبی اکرم ﷺ سے معاہدہ صلح کی درخواست کی جو قبول کر لی گئی۔

معاہدہ خیبر میں تین باتیں سامنے آئیں: اولاً یہ کہ جونہی دشمن نے شکست تسلیم کی، فوراً لڑائی روک دی گئی۔ دوم یہ کہ معاہدے میں مفتوح کی خواہشات کو پوری طرح ملحوظ خاطر رکھا گیا۔ انھوں نے جو زرخیز زمینوں پر بحال رہنے کی درخواست کی تو وہ بھی قبول کر لی گئی۔ سوم یہ کہ مفتوح قلعوں سے ہتھیار لے گئے تاکہ وہ دوبارہ فساد کا باعث نہ بن سکیں [1]

تبوک کا معاہدہ صلح:

رجب ۹ھ میں تبوک کا صلح نامہ عمل میں آیا جب حضور ﷺ تبوک پہنچے تو یحنہ بن رویہ، فرمانروائے ایلہ خود حاضر ہوا۔ اس نے صلح پر آمادگی ظاہر کی۔ آپ ﷺ نے درخواست کو شرف قبول عطا کیا اور اس صلح نامہ میں منظور فرمایا کہ یحنہ بن رویہ، اہل ایلہ اور شام اور یمن میں ان کے حلیف، اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے امن میں ہیں۔

اس عہد نامہ کا ایک ایک لفظ انسانیت، امن اور خوشحالی کے نظام کا آئینہ دار ہے۔ [2]

---

[1] معاہدات عہد نبوی ﷺ، ص ۳۵۳

[2] اسلام کا نظام حکومت، ص ۳۶۶

معاہدہ فدک:

فدک چھوٹی سی بستی تھی جو خیبر کے شمال میں واقع تھی۔ یہاں بھی یہودی رہتے تھے۔ جب انھوں نے سنا کہ خیبر کے یہودیوں کو شکست ہو چکی ہے تو انھوں نے رسول اللہ ﷺ کے پاس وفد روانہ کیا اور گزارش کی کہ ان سے بھی اہل خیبر کی سی شرائط پر صلح کر لی جائے، چنانچہ آپ نے اس سے بھی انہی شرائط پر معاہدہ فرمالیا۔

معاہدہ تیماء:

وادی خیبر کے شمال میں تیماء کی ایک چھوٹی سی بستی تھی، جس میں یہودی آباد تھے۔ انھوں نے بھی لڑائی کے بغیر اطاعت قبول کر لی اور ان کے لیے بھی وہی شرائط رکھی گئیں جو اہل فدک کے لیے رکھی گئی تھیں کہ نہ ان پر ظلم ہوگا اور نہ وہ جلاوطن کیے جائیں گے۔

معاہدہ جرباء اور اذرح:

شام کی دو بستیاں جرباء اور اذرح ہیں جن کے ساتھ معاہدہ غزوہ تبوک کے دوران طے پایا۔ ان پر سالانہ سو دینار جزیہ لگایا گیا اور ان کے بدلے ان کو تمام اطراف اور تمام دشمنوں سے حفاظت کا یقین دلایا گیا تھا۔ ان کے امان نامے میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ اگر مملکت مدینہ کا کوئی شخص سزا سے خائف ہو کر ان کے پاس آ کر پناہ لے تو اسے حکومت مدینہ کے حوالے کر دیا جائے گا۔[1]

سینٹ کیتھرائن سے معاہدہ:

ہجرت کے چھٹے برس رسالت مآب ﷺ نے سینٹ کیتھرائن، متصل کوہ سینا کے راہبوں اور تمام عیسائیوں کو ایک فرمان عطا فرمایا کہ جو قلیل و کثیر اشیاء (منقولہ و غیر منقولہ) ان کے گرجاؤں، نمازوں اور رہبانیت کی ساری جگہیں ان کے تحت ہیں۔ اور جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے ہمسایہ ہیں، وہ سب انہی عیسائیوں کی رہیں گی یعنی نہ ان کے حقوق میں کوئی تغیر و تبدل کیا جائے گا اور نہ ان کی سلطنت میں نہ اس چیز میں جس پر وہ تھے۔ جب تک وہ خیر خواہی کریں گے اور جو حقوق ان پر واجب ہیں ان کی اصلاح کریں گے تو نہ ان پر کسی ظلم کا بار پڑے گا اور نہ وہ خود ظلم کریں گے۔

یہ معاہدہ لفظاً و معناً حریت، رواداری اور مساوات کا اتنا عظیم چارٹر ہے، جس کی نظیر تاریخ عالم پیش کرنے سے قاصر ہے۔ اس کی رو سے عیسائیوں کو ایسی مراعات حاصل ہو گئیں جو ان کو اپنے حکمرانوں کے عہد میں بھی حاصل نہ تھیں۔ اس معاہدے نے عدم تعمیل کرنے والے مسلمانوں کو سخت سزا کا مستحق قرار دیا۔ ایسا مسلمان اللہ کے عہد کو توڑنے والا، اس کے احکامات کی خلاف ورزی کرنے والا اور اپنے دین کو ذلیل کرنے والا ہوگا۔ یہ معاہدہ رواداری کی ایک قابل فخر یادگار ہے۔ اس معاہدے نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ وہ عیسائیوں کی عبادت گاہوں کو منہدم کر کے وہاں مساجد تعمیر نہیں کریں گے۔ ایسی عیسائی عورتیں جو مسلمانوں کے عقد میں

---

[1] ڈاکٹر حمید اللہ، مجموعہ الوثائق السیاسیہ فی العہد النبوی والخلافۃ الراشدہ، قاہرہ، مطبعۃ لجنۃ التالیف، ۱۹۴۱ء۔ شمارہ: ۱۹، ص ۶۸

آ ئیں وہ اس معاہدے کی رو سے اپنے مذہب پر قائم رہ سکتی تھیں۔

مسلمانوں پر بھی یہ ذمہ داری ڈالی گئی کہ وہ عیسائیوں کو ان کے معاہد کی مرمت میں مدد دیں گے[1]

معاہدۂ ایلہ:

ایلہ شام میں خلیج عقبہ کے سرے پر ایک مقام ہے۔ آپ ﷺ نے ایلہ کے حاکم یوحنا بن روبہ کو ایک مکتوب مبارک ارسال کیا۔ یوحنا (متنصر) آپ ﷺ کا مکتوب مبارک وصول کرنے کے بعد آپ ﷺ کی خدمت میں بمقام تبوک حاضر خدمت ہوا۔ آپ ﷺ نے یوحنا کو مہمان کا درجہ دیا، اس سے کمال التفات سے پیش آئے اور اسے ایک عبا عنایت فرمائی اور باہم گفت و شنید کے بعد معاہدہ طے پایا جس میں یوحنا بن روبہ اور اہل ایلہ کے علاوہ ان کے حلیف اہل شام، اہل یمن اور اہل بحیر کے لیے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف سے امان کی ضمانت دی گئی[2]

اس عہد نامے کا ایک ایک لفظ انسانیت، امن اور خوشحالی کے نظام کا آئینہ دار ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک غیر مسلم حکومت بھی اسلام کے نظام امن میں برابر کی حصہ دار ہو سکتی ہے۔ اس سے وہ الزام بھی باطل ہو جاتا ہے کہ اسلام نے مذہبی تشدد اور تلوار کی قوت سے غلبہ پایا۔ اسلام کی اور اسلامی حکومت کی اصل ذمہ داری انسانیت کو امن دینا ہے۔ اگر دنیا کی طاقتیں اس صداقت کو محسوس کر لیں تو وہ خود یہ اعتراف کریں گی کہ اسلام انسانیت کی بہتری کے علاوہ کوئی دوسرا مقصد نہیں رکھتا۔

معاہدۂ مقنا:

ایلہ کے قریب ایک اور اہم ریاست مقنا کی تھی، جو شام کے ساحل پر واقع تھی، اسی دوران میں جب آپ ﷺ مہم تبوک کی لشکر گاہ میں موجود اور آس پاس کے علاقوں کی تسخیر میں مصروف تھے، اہل مقنا کی طرف سے ایک وفد بارگاہ رسالت میں باریاب ہوا۔ جس کی سربراہی عبید بن یاسر بن نمیر کر رہا تھا۔ انھوں نے اپنی قوم کی طرف سے مملکت مدینہ کے لیے اطاعت کا پیغام پہنچایا۔ آپ ﷺ نے ان کو معاہدہ لکھ دیا، جس میں ان کے حقوق و فرائض کا ذکر تھا۔[3]

معاہدہ نجران:

آپ ﷺ نے اہل نجران سے ۱۰ھ میں درج ذیل معاہدہ کیا کہ نجران اور اس کے حلقے کے لوگ اللہ کے جوار اور محمد ﷺ کی ذمہ داری میں ہیں، ان کی جانیں، اموال، زمینیں، مذہب حاضر و غائب، گرجے اور مملکات کی حفاظت کی جائے گی۔ کسی پادری کو اس کے مؤقف سے کسی راہب کو اس کی رہبانیت سے، کسی کاہن کو اس کی کہانت سے ہٹایا نہ جائے گا۔ جو کچھ بھی کم و بیش ان کے قبضہ میں ہے، اس پر غارت گری نہ ہوگی، جاہلیت کے کسی جرم یا خون کا مواخذہ نہیں کیا جائے گا۔ نہ فوجی خدمات پر بلایا جائے گا

---

[1] طبقات ابن سعد، ۲/۴۳

[2] زاد المعاد، ۳/۴۳

[3] معاہدات نبوی، ص ۳۵۷/ الوثائق السیاسیہ، شمارہ ۳۳، ۳۴، ص ۳۲ ـ ۳۸

نہ ہی کوئی عشر لگایا جائے گا اور نہ کوئی لشکر زمین پامال کرے گا۔ اگر کوئی اپنا حق مانگے تو دونوں کے درمیان انصاف کیا جائے گا اور نہ تم پر کوئی ظلم ہونے دیا جائے گا اور نہ تمہیں ظلم کرنے دیا جائے گا۔

اس معاہدہ کو ایک معیاری حیثیت حاصل ہے۔ غیر مسلموں کے ساتھ جو اسلامی سیادت میں آ چکے تھے، ایسا معاہدہ رواداری، فراخ دلی اور حسن سلوک کی ناقابل فراموش یادگار ہے۔[1]

ان معاہدات کے علاوہ آنحضرت ﷺ نے معاہدہ بنو غفار، معاہدہ خزاعہ، معاہدہ وادی القریٰ، معاہدہ مزینہ، معاہدہ جرش، معاہدہ اسلم، معاہدہ ثقیف اور معاہدہ دومۃ الجندل کیے، اور آپ ﷺ نے جس طرح معاہدوں کا احترام کیا اور جس طرح ان پر عمل درآمد فرمایا اس کی شہادت دشمن بھی دیتے ہیں۔ آپ ﷺ کے کسی حلیف کو آپ ﷺ سے معاہدہ کی خلاف ورزی کی شکایت نہ ہوئی، بلکہ اگر فریق ثانی بھی کسی قسم کی کوتاہی کرتا تو آپ ﷺ اسے نرمی سے سمجھاتے، لیکن وہ اگر کسی طرح باز نہ آتا تو مجبور ہو کر آپ ﷺ اس پر لشکر کشی کرتے۔

اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ تاریخ اسلام کے ان معاہدات نبوی کو آپ ﷺ کی جنگی حکمت عملی کے ساتھ گہرا رابطہ تھا۔ آپ ﷺ کے مقابلے میں اگر دو جماعتیں برسرپیکار ہوتیں تو آپ ﷺ نے مدینہ منورہ تشریف لاتے ہی وہاں پر آباد مختلف قبائل اور اقوام سے جو معاہدات کیے، انھوں نے ان فریقوں کو آپ ﷺ کے مخالفین سے الگ کر دیا۔ غرض آپ ﷺ کے تمام معاہدات واضح اور منظم طور پر اس سلسلے کی کڑیاں ہیں جس کا مقصد دنیا میں عدل و انصاف اور امن و امان کا قیام و رواج کرنا تھا۔

---

[1] حمید اللہ، ڈاکٹر۔ سیاسی وثیقہ جات، لاہور، زریں آرٹ پریس، ۱۹۶۰ء، ص ۹۹

فصل سوم

غیر مسلموں کی عہد شکنی اور اس کے نتائج

عمومی عہد شکنی کی فضا:

ہجرت مدینہ کے بعد جب نبی کریم ﷺ نے مسلمانوں کے مابین عقیدے، سیاست اور نظام کی وحدت کے ذریعے ایک نئے اسلامی معاشرے کی بنیادیں مستحکم کر لیں تو پھر غیر مسلموں کے ساتھ اپنے تعلقات منظم کرنے کی طرف توجہ فرمائی۔ اس سے نبی کریم ﷺ کا مقصود یہ تھا کہ ساری دنیا امن وسلامتی کی سعادتوں سے بہرہ ور ہو اور اس کے ساتھ ساتھ مدینہ اور اس کے گرد و پیش کا علاقہ ایک پر امن وفاقی وحدت میں منظم ہو جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے آپ ﷺ نے اہل مدینہ اور ارد گرد کے قبائل سے معاہدات کیے۔ مدینے کے قریب ترین پڑوسی یہود کے تین قبیلے بنو قینقاع، بنو نضیر اور بنو قریظہ تھے ان کے ساتھ نبی کریم ﷺ نے میثاق مدینہ کے نام سے معاہدہ کیا جس کی رو سے یہ لوگ مسلمانوں اور تمام اہل مدینہ کے ساتھ دوستانہ تعلقات رکھنے کے پابند تھے ان کے درمیان ناحق ہنگامہ آرائی اور کشت وخون حرام تھا۔ اس معاہدے کی ایک نمایاں شق یہ تھی:

> معاہدے کے تمام شرکاء کے باہمی تعلقات خیر خواہی، خیر اندیشی اور فائدہ رسانی کی بنیاد پر ہوں گے گناہ پر نہیں۔[۱]

لیکن اس کے برخلاف مدینہ سے ملحقہ یہود کے تینوں قبائل نے یکے بعد دیگرے معاہدہ کی عہد شکنی کی۔ غزوہ بدر سے پہلے انہوں نے اپنی عداوت خفیہ رکھی مگر غزوہ بدر کے بعد یہ لوگ کھل کر نبی کریم ﷺ کی بے ادبی، مسلمانوں کا تمسخر اور معاہدے کی خلاف ورزی کرتے نظر آنے لگے۔

بنو قینقاع کی عہد شکنی:

قبائل یہود میں سب سے جری اور بہادر بنو قینقاع شمار ہوتے تھے۔ یہ لوگ مدینہ کے اندر ہی رہتے تھے اور ان کا محلہ انہی کے نام سے موسوم تھا۔ یہ لوگ پیشے کے لحاظ سے سونار، لوہار اور برتن ساز تھے۔ ان پیشوں کے سبب ان کے ہر آدمی کے پاس وافر مقدار میں سامان جنگ موجود تھا ان کے مردان جنگی کی تعداد سات سو تھی۔ غزوہ بدر میں جب اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح سے ہمکنار کیا تو ان لوگوں کا حسد اور بغض ان کی زبانوں اور حرکتوں سے ظاہر ہونے لگا۔

صفی الرحمن مبارک پوری لکھتے ہیں:

> ''جب اللہ تعالیٰ نے میدان بدر میں مسلمانوں کو فتح سے ہمکنار کیا تو ان کی سرکشی میں شدت آ گئی۔ انہوں نے اپنی شرارتوں، خباثتوں اور لڑانے بھڑانے کی حرکتوں میں وسعت اختیار کر لی اور خلفشار پیدا کرنا شروع کر دیا۔ چنانچہ جو مسلمان ان کے بازار میں جاتا اس سے وہ مذاق واستہزاء کرتے اور اسے

---

[۱] سیرت ابن ہشام، ۵۰۳/۱

اذیت پہنچاتے حتیٰ کہ مسلمان عورتوں سے بھی چھیڑ چھاڑ شروع کردی"۔[۱]

نبی کریم ﷺ نے بنوقینقاع کو ان کے بازار میں جمع کرکے نصیحت فرمائی ان کو رشد و ہدایت کی دعوت دیتے ہوئے ظلم و بغاوت کے انجام سے ڈرایا لیکن ان کی بدمعاشی اور غرور میں کمی کی بجائے اور اضافہ ہی ہوا۔

امام ابوداؤد نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کی ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے قریش کو بدر کے دن شکست دے دی اور آپ مدینہ تشریف لائے تو بنوقینقاع کے بازار میں یہود کو جمع کیا اور فرمایا اے جماعت یہود اس سے پہلے اسلام قبول کرلو کہ تم پر بھی ویسی ہی مار پڑے جیسی قریش پر پڑ چکی ہے۔ انہوں نے کہا اے محمدؐ! تمہیں اس بناء پر خود فریبی میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے کہ تمہاری مڈبھیڑ قریش کے اناڑی اور ناآشنائے جنگ لوگوں سے ہوئی اور تم نے انہیں مار لیا۔ اگر تمہاری لڑائی ہم سے ہوگئی تو پتا چل جائے گا کہ ہم مرد ہیں اور ہمارے جیسے لوگوں سے تمہیں پالا نہ پڑا تھا۔

اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:

قُل لِّلَّذِينَ كَفَرُوا سَتُغْلَبُونَ وَتُحْشَرُونَ إِلَىٰ جَهَنَّمَ ۚ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ○ قَدْ كَانَ لَكُمْ آيَةٌ فِي فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا ۖ فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَأُخْرَىٰ كَافِرَةٌ يَرَوْنَهُم مِّثْلَيْهِمْ رَأْيَ الْعَيْنِ ۚ وَاللَّهُ يُؤَيِّدُ بِنَصْرِهِ مَن يَشَاءُ ۗ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّأُولِي الْأَبْصَارِ ○[۲]

نبی کریم ﷺ کے وعظ کے جواب میں بنوقینقاع کا جارحانہ جواب صاف صاف اعلان جنگ اور صلح نامہ سے انحراف ہی تھا۔ مزید براں بنوقینقاع نے صرف اسی جواب پر اکتفا نہ کیا بلکہ نبی ﷺ کو نہایت بے ادبی اور درشتی سے واپس کیا۔

قرآن نے ان کے متعلق یوں راہنمائی فرمائی:

وَإِمَّا تَخَافَنَّ مِن قَوْمٍ خِيَانَةً فَانبِذْ إِلَيْهِمْ عَلَىٰ سَوَاءٍ ۚ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْخَائِنِينَ ○ وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا سَبَقُوا ۚ إِنَّهُمْ لَا يُعْجِزُونَ ○ وَأَعِدُّوا لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم مِّن قُوَّةٍ وَمِن رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُونَ بِهِ عَدُوَّ اللَّهِ وَعَدُوَّكُمْ وَآخَرِينَ مِن دُونِهِمْ لَا تَعْلَمُونَهُمُ اللَّهُ يَعْلَمُهُمْ ۚ وَمَا تُنفِقُوا مِن شَيْءٍ فِي سَبِيلِ اللَّهِ يُوَفَّ إِلَيْكُمْ وَأَنتُمْ لَا تُظْلَمُونَ ○[۳]

"اگر کبھی تمہیں کسی قوم سے خیانت کا اندیشہ ہو تو اس کے معاہدے کو اعلانیہ اس کے آگے پھینک دو یقیناً اللہ خائنوں کو پسند نہیں کرتا۔ منکرین حق اس غلط فہمی میں نہ رہیں کہ وہ بازی لے گئے یقیناً وہ ہم کو ہرا نہیں سکتے۔ اور تم لوگ جہاں تک تمہارا بس چلے زیادہ سے زیادہ طاقت اور تیار بندھے رہنے والے گھوڑے ان کے مقابلے کے لیے مہیا رکھو تاکہ اس کے ذریعے سے اللہ کے اور اپنے دشمنوں کو اور ان

---

[۱] الرحیق المختوم، ص ۳۹۱

[۲] آل عمران ۳: ۱۲-۱۳

[۳] انفال ۸: ۵۸-۶۰

دوسرے اعداء کو خوف زدہ کر دو جنھیں تم نہیں جانتے مگر اللہ جانتا ہے۔ اللہ کی راہ میں جو کچھ تم خرچ کرو گے اس کا پورا پورا بدل تمہاری طرف پلٹایا جائے گا اور تمہارے ساتھ ہرگز ظلم نہ ہوگا۔"

نبی کریم ﷺ نے بنو قینقاع کی بدتمیزی اور درشتی پر صبر کیا اور اپنے غصے کو پی لیا اور دوسرے مسلمانوں نے بھی آپ کی اتباع میں صبر و تحمل کا مظاہرہ کیا مگر یہود نے اس رویہ سے سبق حاصل کرنے کی بجائے تھوڑے ہی عرصے بعد مدینے میں بلوہ اور ہنگامہ بپا کر دیا اور بھرے بازار میں ایک مسلمان عورت کی عزت پر حملہ کر کے اپنے ہی ہاتھوں اپنی قبر کھود لی۔

ابن ہشام نے ابوعون سے روایت کی ہے کہ:

ایک عرب عورت بنو قینقاع کے بازار میں کچھ سامان لے کر آئی اور بیچ کر (کسی ضرورت کے لیے) ایک سنار کے پاس جو یہودی تھا، بیٹھ گئی۔ یہودیوں نے اس کا چہرہ کھلوانا چاہا مگر اس نے انکار کر دیا۔ اس پر اس سنار نے چپکے سے اس کے کپڑے کا نچلا کنارہ پچھلی طرف باندھ دیا اور اسے کچھ خبر نہ ہوئی۔ جب وہ اٹھی تو اس سے بے پردہ ہوگئی اور یہودیوں نے قہقہہ لگایا۔ اس پر اس عورت نے چیخ پکار مچائی جسے سن کر ایک مسلمان نے اس سنار پر حملہ کیا اور اسے مار ڈالا۔ جواباً یہودیوں نے اس مسلمان پر حملہ کر کے اسے مار ڈالا۔ اس کے بعد مقتول مسلمان کے گھر والوں نے شور مچایا اور یہود کے خلاف مسلمانوں سے فریاد کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں اور بنی قینقاع کے یہودیوں میں بلوہ ہو گیا۔[1]

مذکورہ حالات میں نبی کریم ﷺ کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ اب بنو قینقاع کو ان کی بدعہدی، گستاخی اور ایک عورت کی عزت پر حملہ اور صحابی رسول کے قتل کی سزا دینے کے لیے آپ ﷺ نے بنو قینقاع سے جنگ کی۔ بنو قینقاع کی عہد شکنی کا اشارہ قرآن میں بھی آ چکا تھا۔ آپ ﷺ نے مدینے کا انتظام ابولبابہ بن عبدالمنذر کو سونپا اور خود حضرت حمزہ بن عبدالمطلب کے ہاتھ میں مسلمانوں کا پھریرا دے کر اللہ کے لشکر کے ہمراہ بنو قینقاع کا رخ کیا۔[2]

بنو قینقاع سب سے پہلے یہود تھے جنھوں نے بدعہدی اور جنگ کی۔ نبی کریم ﷺ نے ان کا پندرہ دن تک محاصرہ کیا پھر اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں رعب ڈال دیا۔ چنانچہ بنو قینقاع نے خود ہی اس شرط پر ہتھیار ڈالنے کی پیش کش کر دی کہ رسول اللہ ﷺ ان کی جان، مال، آل واولاد اور عورتوں کے بارے میں جو فیصلہ کریں گے انہیں منظور ہوگا۔ اس کے بعد آپ کے حکم سے ان سب کو باندھ لیا گیا۔

نبی کریم ﷺ اور آپ کے صحابہ کی عادات و اطوار مکمل اسلامی ہونے کی وجہ سے نرم اور شائستہ تھیں۔ بنو قینقاع انہیں مسلمانوں کی کمزوری سمجھ کر دلیر ہو گئے تھے اور ایسی حرکات کے مرتکب ہو چکے تھے کہ انہیں مزید مہلت دینا ناممکن تھا۔ نبی کریم نے ان پر حملہ کر کے انہیں یہ بتلا دیا کہ مسلمان ظلم اور بے غیرتی کو کبھی برداشت نہیں کرتے۔ لیکن اس موقع پر بھی نبی رحمت ﷺ نے انتہائی سزا دینے کی بجائے بنو قینقاع کو اپنے جنگجو مردوں، عورتوں اور بچوں سمیت تین دن میں مدینہ سے نکل جانے کی اجازت مرحمت فرمادی۔

---

[1] سیرت ابن ہشام، ۲/۴۷۔۴۸

[2] الرحیق المختوم، ص ۳۹۳

آپ ﷺ اگر چاہتے تو بنو قینقاع کو ان کی بدعہدی، نبی اکرم ﷺ کی گستاخی، عورت کی عزت پر حملہ اور صحابی رسول کے قتل کے بدلے ان کے جنگجوؤں کو قتل، عورتوں کو لونڈیاں اور بچوں کو غلام بھی بنا سکتے تھے۔ مگر نبی رحمت نے اتنی بڑی معافی اور وہ بھی اپنے آستین کے دشمن رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی کی لجاجت بھری درخواست پر دی۔ اس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔

رسول اللہ ﷺ نے اس منافق کے ساتھ (جس کے اظہار اسلام پر ابھی کوئی ایک ہی مہینہ گزرا تھا) رعایت کا معاملہ کیا اور اس کی خاطر ان سب کی جان بخشی کردی البتہ انہیں حکم دیا کہ وہ مدینہ سے نکل جائیں اور آپؐ کے پڑوس میں نہ رہیں۔ چنانچہ یہ سب اذرعات شام کی طرف چلے گئے اور تھوڑے ہی دنوں بعد وہاں اکثر کی موت واقع ہوگئی۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کے اموال ضبط کر لیے جس میں سے تین کمانیں، دو زرہیں، تین تلواریں اور تین نیزے اپنے لیے منتخب فرمائے اور مال غنیمت میں سے خمس بھی نکالا۔ غنائم جمع کرنے کا کام محمد بن مسلمہ نے انجام دیا۔[1]

بنو نضیر کی عہد شکنی:

بنو نضیر صدیوں سے مدینہ میں آباد تھا جب نبی کریم ﷺ نے مدینہ میں قبائل یہود سے معاہدہ کیا تو یہ قبیلہ بھی اس معاہدہ میں شامل تھا اس معاہدہ کی ایک بنیادی شرط یہ تھی کہ فریقین ایک دوسرے کے خلاف کسی قسم کی معاندانہ کارروائی نہیں کریں گے۔ علامہ ابن حجر لکھتے ہیں ''ان سے اس بات پر مصالحت کی تھی کہ نہ وہ آپ سے جنگ کریں گے اور نہ آپؐ کے خلاف آپ کے دشمنوں کی اعانت کریں گے۔''[2]

قبیلہ بنو نضیر کے یہود اسلام اور مسلمانوں سے جلتے بھنتے رہتے تھے۔ وہ مسلمانوں سے سخت کینہ اور عداوت رکھتے تھے وہ مسلمانوں کو اذیت دینے کے لیے طرح طرح کے حیلے اور تدبیریں کرتے رہتے تھے۔ بنو قینقاع کی جلاوطنی اور کعب بن اشرف کے قتل سے ان کے حوصلے ٹوٹ چکے تھے۔ لیکن غزوہ احد کے بعد ان کی جرأت پلٹ آئی تھی اب یہ لوگ کھل کر عداوت اور بدعہدی پر اتر آئے تھے۔

بنی نضیر نے مدینہ کے منافقین اور مکے کے مشرکین سے پس پردہ ساز باز کی اور مسلمانوں کے خلاف مشرکین کی حمایت میں کام کیا۔[3] نبی کریم ﷺ نے ان کی خفیہ سازشوں سے آگاہی کے باوجود صبر سے کام لیا۔ لیکن رجیع اور معونہ کے حادثات کے بعد یہود کی جرأت و جسارت حد سے بڑھ گئی اور انہوں نے نبی ﷺ کی ذات اقدس کو ہی ختم کرنے کا پروگرام بنالیا۔ بنو نضیر صرف کفار مکہ سے ساز باز پر ہی نہ رکے بلکہ انہوں نے آپ ﷺ کو نعوذ باللہ قتل کرنے کی متعدد بار کوششیں کیں۔ ایک مرتبہ آپ ﷺ کو کہلا بھیجا کہ آپ اپنے ساتھ تین آدمی لائیے اور ہم تین عالم لائیں گے۔ بحث مباحثہ ہوگا۔ اگر آپ نے اپنے دین کی حقانیت ثابت کردی تو ہم ایمان لے آئیں گے اور پس منظر منصوبہ یہ تھا کہ جب آپ ﷺ تشریف لائیں گے تو آپ اور آپ کے ساتھیوں کو

---

[1] زاد المعاد ۲/۱۷۱

[2] فتح الباری، ۷/۱۳۱

[3] سنن ابی داؤد، کتاب الخراج، باب خبر النضیر (۳۰۰۴) الکتب الستہ، ص ۱۴۴۹

خنجروں کے وار سے شہید کر ڈالیں گے۔ اس منصوبے کی اطلاع بنو نضیر ہی کی ایک عورت نے اپنے مسلمان بھائی کو دی جو آپ ﷺ تک پہنچائی گئی جس کے بعد آپ ﷺ نے جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔[1]

دوسری مرتبہ بنو نضیر نے آپ ﷺ کو شہید کرنے کی گھناؤنی سازش اس وقت کی جب آپ ﷺ بنو عامر کے دو آدمیوں کی دیت کا معاملہ طے کرنے کے لیے بنو نضیر کے ہاں تشریف لے گئے۔ اس کی صورت یہ تھی کہ مکان کی چھت سے ایک شخص آپ ﷺ پر پتھر پھینک کر شہید کر ڈالے۔ آپ ﷺ کو وحی الٰہی سے اس سازش کا علم ہو گیا اور آپ ﷺ وہاں سے اٹھ کر چلے گئے۔[2]

بنو نضیر کی سازشیں حد سے بڑھ گئیں تو آپ ﷺ کا صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا کیونکہ مدینہ طیبہ میں امن و سلامتی کو خطرہ پڑ گیا تھا اور بنو نضیر کی مسلسل بدعہدیوں اور سازشوں سے یہ اندیشہ رہنے لگا تھا کہ کہیں یہ آستین کے سانپ بیرونی حملہ کے وقت مدینہ کی سلامتی کو خطرہ میں نہ ڈال دیں۔ اس لیے آپ ﷺ نے ان کی طرف پیغام بھیجا کہ تم لوگ مدینہ سے نکل جاؤ تم اب یہاں میرے ساتھ نہیں رہ سکتے۔ تمہیں دس دن کی مہلت ہے اس کے بعد جو شخص پایا جائے گا اس کی گردن ماردی جائے گی۔

اس نوٹس کے بعد یہود کو جلاوطنی کے سوا کوئی چارہ کار سمجھ میں نہیں آیا۔ چنانچہ وہ چند دن تک سفر کی تیاریاں کرتے رہے۔ لیکن اسی دوران مار آستین دشمن اسلام رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی نے ان کو کہلا بھیجا کہ اپنی جگہ برقرار رہو، ڈٹ جاؤ اور گھر بار نہ چھوڑو۔ میرے پاس دو ہزار مردان جنگی ہیں جو تمہارے ساتھ تمہارے قلعے میں داخل ہو کر تمہاری حفاظت میں جان دے دیں گے اور اگر تمہیں نکالا ہی گیا تو ہم بھی تمہارے ساتھ نکل جائیں گے۔ اور تمہارے بارے میں کسی سے ہرگز نہیں دبیں گے اور اگر تم سے جنگ کی گئی تو ہم تمہاری مدد کریں گے۔ اور بنو قریظہ اور بنو غطفان جو تمہارے حلیف ہیں وہ بھی تمہاری مدد کریں گے۔ رئیس المنافقین کے اس پیغام سے بنو نضیر کے حوصلے بلند ہو گئے۔ ان کے سردار حیی بن اخطب نے رسول اللہ ﷺ کو جوابی پیغام بھیجا کہ ہم اپنے دیار سے نہیں نکلتے آپ کو جو کرنا ہو کر لیں۔[3]

یہود کے اس جواب سے ان کی سرکشی اور عہد شکنی کا اندازہ خوب تر ہو سکتا ہے۔ ان حالات کے بعد ان کے خلاف کسی قسم کی کارروائی نامناسب نہیں رہتی۔ ان کو تہ تیغ کرنے میں مسلمان حق بجانب تھے۔ جب آپ ﷺ کو حیی بن اخطب کا جوابی پیغام ملا تو آپ لڑائی کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے اور حضرت ام مکتوم کو مدینہ کا انتظام سونپ کر بنو نضیر کی طرف روانہ ہو گئے۔ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں علم تھا بنو نضیر کے علاقے میں پہنچ کر ان کا محاصرہ کر لیا گیا۔

بنو نضیر نے اپنے قلعوں اور گڑھیوں میں پناہ لی اور قلعہ بند ہو کر فصیل سے تیر اور پتھر برساتے رہے چونکہ درمیان میں موجود کھجور کے باغات ان کے لیے ڈھال کا کام دے رہے تھے اس لیے آپؐ نے حکم دیا کہ ان درختوں کو کاٹ کر جلا دیا جائے۔ آپ ﷺ کا یہ عمل اللہ کے اذن سے تھا جیسا کہ ارشاد ہے:

---

[1] سنن ابی داؤد، کتاب الخراج، باب خبر النضیر (۳۰۰۴) الکتب الستۃ، ص ۱۴۳۹

[2] تاریخ الرسل والملوک، ۳ر ۴۷

[3] الرحیق المختوم، ص ۲۸۰

مَا قَطَعْتُم مِّن لِّينَةٍ أَوْ تَرَكْتُمُوهَا قَائِمَةً عَلَىٰ أُصُولِهَا فَبِإِذْنِ اللَّهِ وَلِيُخْزِيَ الْفَاسِقِينَ ۝ [1]

''تم نے لینہ (کھجور) کے جو درخت کٹوائے اور جس قدر قائم رہنے دیے سب اللہ کے حکم سے تھا تاکہ اللہ فاسقوں کو رسوا کرے۔''

بنونضیر کی مدد کو منافقین اور بنوغطفان نہ آئے کوئی بھی انہیں مدد دینے یا ان کی مصیبت ٹالنے پر آمادہ نہ ہوا۔ ان کے وعدہ مدد کی تمثیل قرآن نے یوں بیان کی ہے:

كَمَثَلِ الشَّيْطَانِ إِذْ قَالَ لِلْإِنسَانِ اكْفُرْ فَلَمَّا كَفَرَ قَالَ إِنِّي بَرِيءٌ مِّنكَ [2]

''جیسے شیطان انسان سے کہتا ہے کفر کرو اور جب وہ کفر کر بیٹھتا ہے تو شیطان کہتا ہے میں تم سے بری ہوں۔''

محاصرے نے طول نہیں پکڑا اللہ نے ان کے دلوں میں رعب ڈال دیا۔ ان کے حوصلے ٹوٹ گئے وہ ہتھیار ڈالنے پر آمادہ ہو گئے اور انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو کہلوا بھیجا کہ ہم مدینے سے نکلنے کو تیار ہیں۔

عبداللہ بن ابی بن سلول بنونضیر کی طرف سے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں یہ پیام لایا کہ بنونضیر اپنی جانوں کی امان اور اس قدر مال و اسباب کی حفاظت چاہتے ہیں جس قدر اونٹ اٹھا کر لے جاسکیں۔ آپ ﷺ نے ان کی درخواست قبول کر لی۔ یہ لوگ چھ سو اونٹوں پر لد لدا کر روانہ ہو گئے۔ بیشتر یہود اور ان کے اکابر مثلاً حی بن اخطب اور سلام بن ابی الحقیق نے خیبر کا رخ کیا۔ ایک جماعت ملک شام روانہ ہوئی۔ صرف دو آدمیوں یعنی یامین بن عمرو اور ابوسعید بن وہب نے اسلام قبول کیا۔ لہٰذا ان کے مال کو ہاتھ نہیں لگایا گیا۔ [3]

نبی رحمت ﷺ نے بنونضیر کے معاندانہ رویے، معاہدے کی خلاف ورزی، خوف و دہشت گردی کی فضا بنانے اور دشمنانِ اسلام سے مکمل ساز باز جیسے گھناؤنے جرائم کے مرتکب ہونے کے باوجود ان کا صرف محاصرہ کر کے ان کو اپنی ہی تجویز کے مطابق سزا دے کر یہ ثابت کیا کہ اسلام دینِ امن و سلامتی ہے اس کا مقصد خوں ریزی یا غارت گری ہرگز ہرگز نہیں ہے۔

بنوقریظہ کی عہد شکنی:

بنوقریظہ کو مدینے میں میثاقِ مدینہ کی رو سے جان و مال اور مذہب ہر چیز میں امن و آزادی حاصل تھی۔ ان پر نبی کریم ﷺ کا ایک نمایاں احسان یہ بھی تھا کہ بنوقریظہ رتبہ میں دوسرے یہودی قبیلہ بنی نضیر سے کم سمجھے جاتے تھے یعنی بنونضیر کا کوئی آدمی بنوقریظہ کے کسی آدمی کو قتل کر دیتا تو اس کو صرف آدھا خون بہا دینا پڑتا بخلاف اس کے بنوقریظہ پورا خون بہا ادا کرتے تھے۔ آنحضرت ﷺ

---

[1] الحشر ۵:۵۹

[2] الحشر ۱۶:۵۹

[3] الرحیق المختوم، ص ۴۸۲

نے ان کا درجہ بنو نضیر کے برابر کر دیا تھا۔[1]

قریش مکہ کی تحریض و تہدید پر یہ لوگ آمادہ بغاوت تو ہوئے لیکن دوبارہ تجدید معاہدہ کر کے امن حاصل کر چکے تھے۔ غزوہ احزاب کے موقعہ پر بنو نضیر کے سردار حیی بن اخطب کے بہکاوے میں آ کر انہوں نے نہایت نازک حالات میں معاہدہ توڑ کر مسلمانوں کے لیے بہت مسائل پیدا کیے۔ حیی بن اخطب نے بنو قریظہ کے سردار کعب بن اسد قرظی کو بہت اصرار کر کے نقض عہد پر آمادہ کر لیا۔ البتہ اسے اس مقصد کے لیے اس سے یہ عہد و پیمان بھی کرنا پڑا کہ اگر قریش نے محمد کو ختم کیے بغیر واپسی کی راہ لی تو وہ بنو قریظہ کے قلعے میں داخل ہو جائے گا اور جو انجام ان کا ہوگا وہی اس کا ہوگا۔[2]

اس کے بعد بنو قریظہ عملی طور پر مسلمانوں کے خلاف جنگی کاروائیوں کا حصہ بن گئے۔

حضرت صفیہ بنت عبدالمطلب رضی اللہ عنہا حضرت حسانؓ کے فارع نامی قلعے کے اندر تھیں۔ حضرت حسانؓ عورتوں اور بچوں کے ساتھ وہیں تھے۔ حضرت صفیہ کہتی ہیں کہ ہمارے پاس سے ایک یہودی گزرا اور قلعے کا چکر کاٹنے لگا یہ اس وقت کی بات ہے جب بنو قریظہ رسول اللہ ﷺ سے کیا ہوا عہد و پیمان توڑ کر آپؐ سے برسر پیکار ہو چکے تھے اور ہمارے اور ان کے درمیان کوئی نہ تھا جو ہمارا دفاع کرتا۔ رسول اللہ ﷺ مسلمانوں سمیت دشمن کے بالمقابل پھنسے ہوئے تھے۔ اگر ہم پر کوئی حملہ آور ہو جاتا تو آپؐ انہیں چھوڑ کر نہیں آ سکتے تھے۔ اس لیے میں نے کہا اے حسان یہ یہودی .... جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں قلعے کا چکر لگا رہا ہے اور مجھے خدا کی قسم اندیشہ ہے کہ یہ باقی یہود کو بھی ہماری کمزوری سے آگاہ کر دے گا۔ ادھر رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام اس طرح پھنسے ہوئے ہیں کہ ہماری مدد کو نہیں آ سکتے لہٰذا آپ جائیے اور اسے قتل کر دیجیے۔ حضرت حسان نے کہا واللہ آپ جانتی ہیں کہ میں اس کام کا آدمی نہیں۔ حضرت صفیہ کہتی ہیں اب میں نے خود اپنی کمر باندھی پھر ستون کی ایک لکڑی لی۔ اس کے بعد قلعے سے اتر کر اس یہودی کے پاس پہنچی اور لکڑی سے مار مار کر اس کا خاتمہ کر دیا۔ اس کے بعد قلعے میں واپس آئی اور حسان سے کہا جائیے اس کے ہتھیار اور اسباب اتار لیجیے چونکہ وہ مرد ہے اس لیے میں نے اس کے ہتھیار نہیں اتارے۔ حسان نے کہا مجھے اس کے ہتھیار کی کوئی ضرورت نہیں۔[3]

رسول اللہ ﷺ کی پھوپھی کے اس جانبازانہ کارنامے کا بچوں اور عورتوں کی حفاظت پر اچھا اثر پڑا اور یہودیوں پر خوف طاری ہو گیا کہ قلعے میں اسلامی لشکر موجود ہے اس لیے انہوں نے دوبارہ ادھر کا رخ نہیں کیا۔ البتہ یہ لوگ مشرکین مکہ کے لشکر کو مسلسل رسد پہنچاتے رہے حتیٰ کہ مسلمانوں نے ان کی رسد کے بیس اونٹوں پر قبضہ بھی کر لیا۔[4]

رسول اللہ ﷺ نے بنو قریظہ کے نقض عہد کی خبر سنتے ہی سعد بن معاذ و سعد بن عبادہ و خوات بن جبیر و عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہم کو بنو قریظہ کا حال معلوم کرنے کی غرض سے روانہ کیا۔ ان لوگوں نے بنو قریظہ کو جیسا سنا تھا ویسا ہی پایا۔

---

[1] سنن ابی داؤد، کتاب الدیات، باب النفس بالنفس (۴۴۹۴) الکتب الستۃ، ص ۱۵۵۲

[2] سیرت ابن ہشام ۲/۲۲۰، ۲۲۱

[3] ایضاً، ۲/۲۲۸

[4] الرحیق المختوم، ص ۵۰۰

آپ ﷺ کو بنو قریظہ کی غداری اور عہد شکنی سے بہت صدمہ ہوا۔ درحقیقت اس وقت مسلمان بہت نازک صورت حال میں پھنس گئے تھے۔ پیچھے بنو قریظہ تھے جن کا حملہ روکنے کے لیے ان کے اور مسلمانوں کے درمیان کوئی نہ تھا اور آگے مشرکین کا لشکر جرار تھا جنہیں چھوڑ کر ہٹنا ممکن نہ تھا۔ پھر مسلمان عورتیں اور بچے تھے جو کسی خاص حفاظتی انتظام کے بغیر بدعہد یہودیوں کے قریب ہی تھے۔ اس لیے لوگوں میں سخت اضطراب برپا ہوا۔ جس کی کیفیت قرآن میں یوں بیان ہوئی ہے:

وَإِذْ زَاغَتِ الْأَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوبُ الْحَنَاجِرَ وَتَظُنُّونَ بِاللَّهِ الظُّنُونَا ○ هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُونَ وَزُلْزِلُوا زِلْزَالًا شَدِيدًا ○[1]

''اور جب نگاہیں کج ہو گئیں، دل حلق میں آ گئے اور تم لوگ اللہ کے ساتھ طرح طرح کے گمان کرنے لگے۔ اس وقت مومنوں کی آزمائش کی گئی اور انہیں شدت سے جھنجوڑ دیا گیا۔''

پھر اس نازک موقع پر منافقین کے نفاق نے بھی سر نکالا وہ نبی کریم کے وعدوں پر شک کرتے اور اپنے گھروں کے غیر محفوظ ہونے کا بہانہ کر کے جنگ سے فرار چاہنے لگے۔ قرآن کریم نے ان کا نقشہ یوں کھینچا ہے:

وَإِذْ يَقُولُ الْمُنَافِقُونَ وَالَّذِينَ فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ مَّا وَعَدَنَا اللَّهُ وَرَسُولُهُ إِلَّا غُرُورًا ○ وَإِذْ قَالَت طَّائِفَةٌ مِّنْهُمْ يَا أَهْلَ يَثْرِبَ لَا مُقَامَ لَكُمْ فَارْجِعُوا وَيَسْتَأْذِنُ فَرِيقٌ مِّنْهُمُ النَّبِيَّ يَقُولُونَ إِنَّ بُيُوتَنَا عَوْرَةٌ وَمَا هِيَ بِعَوْرَةٍ إِن يُرِيدُونَ إِلَّا فِرَارًا ○[2]

''اور جب منافقین اور وہ لوگ جن کے دلوں میں بیماری ہے کہہ رہے تھے کہ ہم سے اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے جو وعدہ کیا ہے وہ فریب کے سوا کچھ نہیں اور جب ان کی ایک جماعت نے کہا کہ اے اہل یثرب! تمہارے لیے ٹھہرنے کی گنجائش نہیں لہٰذا واپس چلو اور ان کا ایک فریق نبی سے اجازت مانگ رہا تھا۔ کہتا تھا ہمارے گھر خالی پڑے ہیں حالانکہ وہ خالی نہیں پڑے تھے۔ یہ لوگ محض فرار چاہتے تھے۔''

لشکر کی یہ حالت کرنے میں بنو قریظہ کی بدعہدی اور غداری کا نمایاں دخل تھا۔ آپ ﷺ بنو قریظہ کی بدعہدی کی خبر سن کر پریشانی کے عالم میں چادر سے چہرہ مبارک کپڑے سے ڈھانپ کر دیر تک چت لیٹے رہے اس سے لوگوں میں اضطراب اور بڑھ گیا۔ لیکن پھر آپ اللہ اکبر کہتے ہوئے اٹھے مسلمانوں کو اللہ کی مدد اور فتح کی خوشخبری دیتے ہوئے ان نازک حالات سے نمٹنے کا پروگرام بنایا اللہ تعالیٰ کی مدد تیز ہوا اور فرشتوں کی صورت میں آئی کفار کو محاصرہ چھوڑ کر گھر کی راہ لینی پڑی۔ اللہ تعالیٰ کی مدد کا ذکر قرآن کریم میں یوں آیا ہے:

---

[1] الاحزاب ۳۳: ۱۰۔۱۱

[2] الاحزاب ۳۳: ۱۲۔۱۳

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ جَاءَتْكُمْ جُنُودٌ فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيحًا وَجُنُودًا لَّمْ تَرَوْهَا ۝[1]

"اے ایمان والو اللہ کے اس احسان کو یاد کرو جب کہ تم پر فوجیں آ پڑیں تو ہم نے ان پر آندھی بھیجی اور فوجیں بھیجیں جو تم کو دکھائی نہیں دیتی تھیں۔"

نبی کریم ﷺ غزوہ خندق سے واپس تشریف لا کر ظہر کے وقت حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے مکان میں غسل فرما رہے تھے کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام تشریف لائے اور فرمایا کیا آپ نے ہتھیار رکھ دیے حالانکہ ابھی فرشتوں نے ہتھیار نہیں رکھے اور میں بھی قوم کا تعاقب کر کے بس واپس چلا آ رہا ہوں۔ اٹھیے اور اپنے رفقاء کو لے کر بنو قریظہ کا رخ کیجیے میں آگے آگے جا رہا ہوں۔ ان کے قلعوں میں زلزلہ برپا کر دوں گا اور ان کے دلوں میں رعب و دہشت ڈالوں گا یہ کہہ کر حضرت جبرائیل فرشتوں کے جلو میں روانہ ہو گئے۔[2]

آپ ﷺ نے اس موقعہ پر مدینہ کا انتظام ابن ام مکتوم کو سونپا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو جنگ کا پھریرا دے کر آگے روانہ کیا۔ وہ جب بنی قریظہ کے قلعوں کے قریب پہنچے تو بنو قریظہ نے رسول اللہ پر نعوذ باللہ گالیوں کی بوچھاڑ کر دی۔ طبری کے مطابق:

حتی اذا دنا من الحصون سمع منها مقالة قبيحة لرسول الله ﷺ منهم[3]

"یہاں تک کہ وہ جب ان کے قلعوں کے پاس پہنچے تو ان سے رسول اللہ ﷺ کی شان میں نازیبا کلمات سننے کو ملے۔"

بنو قریظہ کا محاصرہ ایک ماہ تک جاری رہا پھر وہ لوگ حضرت سعد بن معاذ کے فیصلے پر رضامند ہو گئے۔

حضرت سعد بن معاذ نے ان کے لیے جو فیصلہ کیا وہ تورات کے عین مطابق تھا یعنی یہ کہ تمام لڑنے والے قتل کیے جائیں، عورتیں اور بچے قید ہوں، مال و اسباب غنیمت قرار دیا جائے۔

تورات کتاب تثنیہ اصحاح ۲۰ آیت ۱۰ میں ہے:

"جب کسی شہر پر حملہ کرنے کے لیے تو جائے تو پہلے صلح کا پیغام دے اگر وہ صلح تسلیم کر لیں اور تیرے لیے دروازے کھول دیں تو جتنے لوگ وہاں موجود ہوں سب تیرے غلام ہو جائیں گے، لیکن اگر صلح نہ کریں تو ان کا محاصرہ کر اور جب تیرا اللہ تجھ کو ان پر قبضہ دلا دے تو جس قدر مرد ہوں سب کو قتل کر دے، باقی بچے، عورتیں، جانور اور جو چیزیں شہر میں موجود ہوں، سب تیرے لیے مال غنیمت ہوں گی۔"

---

[1] الاحزاب ۳۳: ۱۲-۱۳
[2] الرحیق المختوم، ص ۴۰۹
[3] تاریخ طبری ۱۴۸۲/۳

حضرت سعد کے اس فیصلے پر آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ تم نے یہ آسمانی فیصلہ کیا۔[۱]

اس فیصلے کی حقانیت کا اقرار قبیلہ بنونضیر کے یہودی سردار حی بن اخطب نے مقتل کی طرف جاتے ہوئے آنحضرت کی طرف نظر اٹھا کر یوں کیا:

اما و اللہ ما لمت نفسی فی عداوتک و لکنہ من یخذل اللہ یخذلہ

ہاں اللہ کی قسم مجھ کو اس کا افسوس نہیں کہ میں نے تیری عداوت کی لیکن بات یہ ہے جو شخص اللہ کو چھوڑ دیتا ہے اللہ بھی اس کو چھوڑ دیتا ہے۔

پھر اس نے لوگوں کی طرف مخاطب ہو کر کہا:

ایھا الناس انہ لا باس بامر اللہ کتاب و قدر و ملحمۃ کتبھا اللہ علی بنی اسرائیل

لوگو اللہ کے حکم کی تعمیل میں کچھ مضائقہ نہیں یہ ایک حکم الٰہی تھا۔ یہ لکھا ہوا تھا ایک سزا تھی جو اللہ نے بنی اسرائیل پر لکھی تھی۔[۲]

حضرت سعد بن معاذ کا فیصلہ انتہائی عدل و انصاف پر مبنی تھا۔ کیونکہ بنو قریظہ نے مسلمانوں کی موت و حیات کے نازک ترین لمحات میں جو خطرناک بدعہدی کی تھی وہ تو تھی ہی اس کے علاوہ انہوں نے مسلمانوں کے خاتمے کے لیے ڈیڑھ ہزار تلواریں، دو ہزار نیزے، تین سو زرہیں اور پانچ سو ڈھالیں مہیا کر رکھی تھیں جن پر فتح کے بعد مسلمانوں نے قبضہ کر لیا۔

یہود خیبر کی بدعہدی اور فتنہ انگیزی:

خیبر مدینہ کے شمال میں تقریباً ایک سو میل کے فاصلے پر ایک بڑا شہر تھا یہاں یہود کے بہت مضبوط قلعے تھے جن میں سے بعض کے آثار اب تک باقی ہیں۔ خیبر کے قریبی نخلستان اور کھیتیاں بہت زرخیز تھیں اب یہ صرف ایک بستی سی رہ گئی ہے جس کی آب و ہوا قدرے غیر صحت مند ہے۔

خیبر سازشوں اور دسیسہ کاریوں کا گڑھ، فوجی انگیخت کا مرکز اور لڑانے بھڑانے اور جنگ کی آگ بھڑکانے کی کان تھا۔[۳]

عرب میں یہودی قوت کا یہ سب سے بڑا مرکز تھا۔ مدینہ سے جب رؤسائے بنونضیر جلاوطن ہو کر خیبر میں آباد ہوئے تو انہوں نے تمام عرب کو اسلام کی مخالفت پر برانگیختہ کر دیا جس کا پہلا مظہر احزاب کا معرکہ تھا۔ ان رؤساء میں سے حی بن اخطب جنگ قریظہ میں قتل ہوا۔[۴] حی بن اخطب جب اپنی فتنہ انگیزی اور بنو قریظہ کو بدعہدی پر آمادہ کر کے ان کا دست و بازو بن کر اس جرم کی پاداش میں قتل ہو چکا تو اس کے بعد ابورافع سلام بن ابی الحقیق اس کا جانشین ہوا یہ بہت بڑا تاجر اور صاحب اثر تھا۔ اس نے قبیلہ غطفان کو جو عرب کا بہت بڑا صاحب اثر قبیلہ تھا اسے اسلام دشمنی پر آمادہ کیا۔

۱۔ سیرت النبی ۱/۴۷۱

۲۔ سیرت النبی ۱/۴۷۰

۳۔ الرحیق المختوم، ص ۵۹۱

۴۔ سیرۃ النبی ۱/۴۹۲

سن چھ ہجری میں سلام نے خود جا کر قبیلہ غطفان اور ان کے آس پاس کے قبیلوں کو اسلام کے مقابلے کے لیے آمادہ کیا یہاں تک کہ ایک عظیم الشان فوج نے کر مدینہ پر حملہ کی تیاریاں کیں۔[1]

ابو رافع سلام بن ابی الحقیق کا ایک بہت بڑا قبیح عمل یہ بھی تھا کہ وہ آپ ﷺ کو ایذا پہنچایا کرتا تھا اور آپ ﷺ کے دشمنوں کو مقابلہ میں مدد دیا کرتا تھا:

كان ابورافع يوذى رسول الله و يعين عليه[2]

"ابو رافع آنحضرت ﷺ کو ایذا پہنچایا کرتا تھا اور آپؐ کے دشمنوں کو مقابلہ میں مدد دیا کرتا تھا۔"

یہ سلام اپنے اس قبیح جرم کی بدولت سن ۶ ہجری میں حضرت عبداللہ بن عتیک ایک خزرجی انصاری کے ہاتھ سے اپنے قلعہ میں سوتا ہوا مارا گیا۔[3] سلام کے بعد یہودیوں نے اسیر بن رزام کو مسند ریاست پر بٹھایا۔ یہ اسلام دشمنی اور بدعہدی میں اپنے پیش رو سے بھی زیادہ ثابت ہوا۔ اس نے قبائل یہود کو جمع کر کے یہ پالیسی بیان دیا:

"میرے پیشرووں نے محمد کے مقابلے میں جو تدبیریں اختیار کیں وہ غلط تھیں صحیح تدبیر یہ ہے کہ خود محمد کے دارالریاست پر حملہ کیا جائے اور میں یہی طریقہ اختیار کروں گا۔"[4]

اسیر بن رزام نے اپنے اس مذموم مقصد کی خاطر قبیلہ غطفان اور دیگر قبائل میں دورہ کر کے ایک فوج گراں تیار کی۔ نبی کریم ﷺ کو یہ خبریں پہنچیں تو آپ نے افواہ پر اعتماد نہیں کیا بلکہ عبداللہ بن رواحہ کو تحقیق حال کے لیے بھیجا جنھوں نے اپنے چند ساتھیوں سمیت چھپ کر اسیر بن رزام کی زبانی اس کے مذموم مشورے اور تدبیریں سنیں اور صورت حال سے آپ ﷺ کو آگاہ فرمایا۔ آنحضرت ﷺ نے اس نازک صورت حال میں بھی چاہا کہ جنگ سے گریز کیا جائے اور معاہدہ کے ذریعے امن و امان کی صورت حال پیدا کی جائے۔ آپؐ نے حضرت عبداللہ بن رواحہ کو ۳۰ آدمی دے کر خیبر روانہ کیا ان لوگوں نے اسیر سے کہا کہ آنحضرت ﷺ نے ہمیں اس لیے بھیجا ہے کہ تم اگر حاضر ہو جاؤ تو خیبر کی حکومت تم کو دے دی جائے چنانچہ وہ تیس آدمی لے کر خیبر سے نکلا اور احتیاط کی بنا پر مخلوط قافلہ اس طرح چلا کہ دو دو شخص ہمرکاب چلتے تھے جن میں ایک یہودی اور ایک مسلمان ہوتا تھا۔ راستے میں اسیر نے اپنے ہمرکاب عبداللہ بن انس سے تلوار چھیننے کی کوشش کی جس سے اس کی بدعہدی عیاں ہوگئی۔ چنانچہ مڈبھیڑ میں ایک کے سوا سب یہودی مسلمانوں کے ہاتھ سے مارے گئے۔[5]

خیبر کے یہودی جب اس نادر موقعہ کو بھی ہاتھ سے گنوا چکے اور اپنی اسلام دشمنی اور آپؐ پر حملہ کرنے کے لیے بنو غطفان کو خیبر کی نصف پیداوار کے بدلے مدینہ پر حملہ کرنے کے لیے آمادہ کر چکے تو آپ ﷺ نے بنو غطفان کے ایک طاقت ور قبیلہ

---

[1] طبقات ابن سعد، ص ۶۶/۲

[2] الجامع الصحیح للبخاری، کتاب المغازی، باب قتل ابی رافع (۳۳۰) الکتب الستۃ، ص ۳۳۰

[3] سیرۃ النبی ۲۹۲/۱

[4] زرقانی علی المواہب، ۱۹۷/۲

[5] سیرت النبی، ۲۹۳/۱

بنوفزارہ کو جو خود خیبر میں جا کر ان کے دست و بازو بننے کا اعلان کر چکا تھا اسے خط لکھا کہ تم خیبر والوں کی مدد سے باز آ ؤ۔ خیبر فتح ہوگا تو تم کو بھی حصہ دیا جائے گا۔ لیکن بنوفزارہ نے انکار کیا۔[1]

غطفان کے قبیلہ کی خیبر والوں کے ساتھ شرکت جنگ کا دیباچہ ثابت ہوئی۔ اس قبیلہ کے چند آدمیوں نے مدینہ کی چراگاہ پر چھاپہ مارا اور ۲۰ اونٹنیوں کو پکڑ کر لے گئے اور حضرت ابوذر کے صاحبزادے کو جو اونٹنیوں کی حفاظت پر مامور تھے، قتل کر دیا اور ان کی بیوی کو پکڑ کر لے گئے۔[2]

مذکورہ حالات اور ماضی کے تلخ حقائق کی روشنی میں خیبر پر چڑھائی ناگزیر ہوگئی تھی، اس لیے آپ ﷺ نے سن ۷ ہجری میں خیبر کی طرف پیش قدمی کی۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح سے ہم کنار کیا۔ خیبر کے کچھ قلعات بزور تیغ مفتوح ہوئے اور بعض بصلح و امن۔ جو قلعے صلح و امن سے فتح ہوئے ان کے رہنے والے یہودیوں سے یہ طے پایا کہ نصف پیداوار زراعت و کھجور وغیرہ مسلمانوں کو خراج میں دیا کریں اور نصف خود لیا کریں۔ چنانچہ اسی اقرار و عہد پر خیبر کے یہودی حضرت عمر بن خطاب کی خلافت کے آخر زمانے تک رہے۔ جب جناب موصوف کو یہ معلوم ہوا کہ آنحضرت ﷺ نے اپنے مرض الموت میں ارشاد فرمایا تھا:

لَا يَبْقَى دِيْنَانِ بِاَرْضِ الْعَرَبِ[3]

''سرزمین عرب میں دو دین نہ رہیں گے۔''

فتح خیبر کے وقت بھی یہود اسلام دشمنی اور بدعہدی کی بری مثال قائم کرنے سے باز نہ آئے جس کی چند مثالیں درج ذیل ہیں:

ایک دن زینب جو سلام بن مشکم کی بیوی اور مرحب کی بھاوج تھی۔ نبی کریم ﷺ کی چند صحابہ کے ساتھ دعوت کی، آپ نے فرط کرم سے قبول فرمایا۔ زینب نے کھانے میں زہر ملا دیا تھا۔ آپ نے ایک لقمہ کھا کر ہاتھ کھینچ لیا لیکن بشر بن براء نے پیٹ بھر کر کھایا اور زہر کے اثر سے بالآخر ہلاک ہوگئے۔ نبی کریم ﷺ نے زینب کو بلا کر پوچھا، اس نے جرم کا اقبال کیا، یہود نے کہا ہم نے اس لیے زہر دیا تھا کہ اگر آپ پیغمبر ہیں تو زہر خود اثر نہ کرے گا اور پیغمبر نہیں ہیں تو ہم کو آپ کے ہاتھ سے نجات مل جائے گی۔

آپ ﷺ کبھی اپنی ذات کے لیے کسی سے انتقام نہیں لیتے تھے۔ اس بنا پر آپ نے زینب سے تعرض نہیں فرمایا۔ لیکن جب تین دن کے بعد بشر زہر کے اثر سے انتقال کر گئے تو وہ قصاص میں قتل کر دی گئی۔[4]

کنانہ بن ابی الحقیق کو اس شرط پر امان دی گئی تھی کہ وہ کسی قسم کی بدعہدی اور خلاف بیانی نہ کرے گا[5]۔ کنانہ نے یہ بھی منظور کیا تھا (بلکہ ایک روایت میں ہے) کہ اگر اس کے خلاف اس نے کچھ کیا تو وہ قتل کا مستحق ہوگا[6]۔ لیکن کنانہ بن ابی الحقیق نے

---

[1] معجم البلدان لفظ خیبر کی ذیل میں موسیٰ بن عقبہ کی مغازی سے ۴۲۳/۱

[2] سیرۃ النبی، ۲۹۵/۱

[3] موطا امام مالک، کتاب الجامع، باب اجلاء الیھود من المدینۃ، حدیث رقم ۱۳۸۸

[4] سیرت النبی ۳۰۱/۱

[5] سنن ابی داؤد، کتاب الخراج، باب ما جاء فی حکم ارض خیبر (۳۰۰۶) الکتب الستۃ، ص ۱۴۴۹

[6] طبقات ابن سعد، غزوہ خیبر، ص ۸۱ ''س''

بدعہدی کا ارتکاب کیا، یہود اس بات کا عہد کر چکے تھے کہ وہ کوئی مال آپ سے نہیں چھپائیں گے۔ آپ ﷺ نے ابن ابی الحقیق سے معاہدہ صلح کرتے وقت یہ فرمایا تھا ''اگر تم لوگوں نے مجھ سے کچھ چھپایا تو پھر اللہ اور اس کے رسول بری الذمہ ہوں گے۔ یہود نے یہ شرط منظور کر لی اور مصالحت ہو گئی۔'' [۱] لیکن اس معاہدے کے علی الرغم کنانہ بن ابی الحقیق نے ایک کھال غائب کر دی جس میں مال اور حی بن اخطب کے زیورات تھے۔ [۲]

کنانہ نے بدعہدی کی اور جو امن اس کو دیا گیا تھا ٹوٹ گیا۔ کنانہ کا ایک اور سنگین جرم یہ تھا کہ اس نے محمود بن مسلمہ کو چکی کا پاٹ گرا کر شہید کیا تھا۔ آپؐ نے کنانہ کو محمد بن مسلمہ کے سپرد کیا تا کہ اپنے بھائی محمود بن مسلمہ کے عوض اس کو قتل کریں چنانچہ محمد بن مسلمہ نے اس کی گردن مار دی۔ [۳]

فتح خیبر کے بعد آنحضرت ﷺ نے چند روز خیبر میں قیام کیا۔ اگر چہ یہود کو کامل امن و امان دیا گیا اور ان کے ساتھ ہر طرح کی مراعات کی گئی تاہم ان کا رویہ اور طرزِ عمل مفسدانہ اور باغیانہ رہا۔ جس کی اول مثال زینب یہودیہ کا آپؐ اور آپ کے ساتھیوں کو زہر دینا ہے۔ پھر ایک دفعہ صحابہ میں سے حضرت عبداللہ بن سہیل اور حضرت محیصہ قحط سالی کے زمانے میں خیبر گئے۔ یہود نے حضرت عبداللہ کو دھوکے سے قتل کر کے ایک نہر میں ڈال دیا۔ حضرت محیصہؓ نے نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں آ کر قصہ بیان کیا۔ آپ نے فرمایا تم قسم کھا سکتے ہو کہ یہودیوں نے قتل کیا؟ عرض کیا حضور وہ تو پچاس مسلمانوں کو قتل کر کے بھی جھوٹی قسم کھا لیں گے۔ لیکن آنحضرت ﷺ نے یہود سے تعرض نہیں کیا اور بیت المال سے مقتول کا خون بہا دلا دیا۔ [۴]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں یہود نے حضرت عبداللہ بن عمر کو سوتے میں کوٹھے پر سے گرا دیا کہ ان کا ہاتھ اور پاؤں ٹوٹ گیا۔ اس طرح یہود ہمیشہ فساد انگیزیاں کرتے رہتے تھے۔ مجبور ہو کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں شام کے اضلاع میں جلاوطن کر دیا۔ [۵]

قریش مکہ اور بنو بکر کی عہد شکنی:

فصل دوم میں معاہدہ حدیبیہ کا ذکر تفصیل سے کیا جا چکا ہے۔ اس معاہدے کی ایک شق یہ تھی کہ قبائل عرب کو اختیار ہو گا کہ وہ نبی کریم ﷺ یا قریش مکہ دونوں میں سے جس کے ساتھ چاہیں شامل ہو سکتے ہیں۔ وہ جس کے ساتھ اپنا الحاق کر لیں گے اسی کا حصہ سمجھے جائیں گے۔ ان پر ہونے والی زیادتی پورے فریق پر زیادتی سمجھی جائے گی۔ اس اصول کے تحت بنو خزاعہ نبی کریم ﷺ کے ساتھ اور بنو بکر قریش مکہ کے ساتھ مل گئے اور معاہدہ حدیبیہ کا باقاعدہ حصہ بن گئے۔

---

۱ زاد المعاد، ۱۳۶/۲

۲ الرحیق المختوم، ص ۲۰۲

۳ سیرت ابن ہشام، ۲۳۲/۳

۴ سیرت النبی، ۳۰۲/۱

۵ ایضاً

معاہدہ حدیبیہ کو قریش مکہ اور ان کا حلیف قبیلہ بنوبکر نبھا نہ سکا اور دونوں نے مل بھگت کر کے مسلمانوں کے حلیف قبیلہ بنوخزاعہ پر حملہ کر دیا۔

ابن سعد کے مطابق صلح حدیبیہ کے بیسویں مہینے جب شعبان ۸ھ آیا تو بنونفاثہ نے جو بنوبکر میں تھے اشراف قریش سے گفتگو کی کہ بنوخزاعہ کے مقابلہ میں آدمیوں اور ہتھیاروں سے ان کی مدد کریں۔ قریش نے ان سے وعدہ کر لیا۔ ابو تیر میں چھپ کے بھیس بدلے ہوئے ان کے پاس پہنچ گئے، صفوان بن امیہ، حویطب بن عبدالعزیٰ اور مکرز بن حفص بن الاخیف اس جماعت میں تھے۔ ان لوگوں نے رات کے وقت بنوخزاعہ پر حملہ کیا جب کہ وہ لوگ غافل اور امن میں تھے۔ ان کے بیس آدمی قتل کر دیے۔[1]

بنوبکر اور بنوخزاعہ میں پرانی دشمنی تھی۔ صلح حدیبیہ نے لوگوں کو مطمئن کیا تو بنوبکر کی توجہ اپنی پرانی رقابت اور انتقام کی طرف ہوئی۔ چنانچہ وہ بنوخزاعہ پر حملہ آور ہو گئے۔ رؤسائے قریش نے اعلانیہ ان کو مدد دی۔ عکرمہ بن ابی جہل، صفوان بن امیہ اور سہیل بن عمرو وغیرہ نے راتوں کو صورتیں بدل کر بنوبکر کے ساتھ تلواریں چلائیں۔[2]

بنوبکر نے قریش مکہ کی اعانت سے معاہدہ حدیبیہ کی صریح خلاف ورزی کی تھی۔ ان لوگوں نے بنوخزاعہ کو حرم میں بھی معاف نہیں کیا۔ چنانچہ بنوخزاعہ کے سردار عمرو بن سالم فریاد لے کر نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اشعار میں اپنے ساتھ ہونے والے ظلم کی داستان سنائی۔ آپ ﷺ کو سخت رنج ہوا آپ نے قریش کے پاس قاصد بھیجا اور تین شرطیں پیش کیں کہ ان میں سے کوئی منظور کی جائے:

i۔ مقتولوں کا خون بہا دیا جائے۔

ii۔ قریش بنوبکر کی حمایت سے الگ ہو جائیں۔

iii۔ اعلان کر دیا جائے کہ حدیبیہ کا معاہدہ ٹوٹ گیا ہے۔

قرطہ بن عمر نے قریش کی زبان سے کہا کہ "صرف تیسری شرط منظور ہے۔"[3]

قاصد کی واپسی کے بعد قریش کو ندامت اور فکر لاحق ہوئی۔ ابوسفیان نے تجدید معاہدہ کے لیے مدینہ کا سفر بھی کیا مگر پانی سر سے گزر چکا تھا۔ بنوخزاعہ کے مقتولین کا بدلہ لینے کے لیے قریش مکہ اور ان کے حلیف قبیلہ بنوبکر کو سبق سکھانا ضروری ہو گیا تھا۔ جس کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح مکہ سے ہمکنار کیا۔

---

[1] طبقات ابن سعد، ۱/۳۴۷

[2] طبری، ۳/۱۲۰

[3] زرقانی علی المواہب، ۲/۳۳۶

باب پنجم

عہد خلافت راشدہ اور قرن اول میں شامل اموی دور کے غیر مسلموں سے تعلقات ومعاہدات

فصل اول

خلافت راشدہ میں غیر مسلموں سے تعلقات و معاہدات

فصل دوم

قرن اول میں شامل اموی حکمرانوں کے غیر مسلموں سے تعلقات و معاہدات

فصل اول

خلافت راشدہ میں غیر مسلموں سے تعلقات و معاہدات

غیر مسلموں سے تعلقات کا جائزہ:

خلافت راشدہ سے مراد پہلے چار خلفاء کا دور حکومت ہے۔ اس دور کو بھی ہمارے لیے نبی کریم ﷺ نے مشعل راہ قرار دیا ہے۔ ارشاد نبوی ﷺ ہے:

علیکم بسنتی و سنة خلفاء الراشدین[1]

"تم پر میری اور خلفاء راشدین کی سنت پر عمل کرنا لازم ہے۔"

خلفاء راشدین کا دور حکومت کمال اتباع رسول کا دور تھا۔ اس دور میں غیر مسلموں سے تعلقات و معاہدات کے حوالے سے انہیں اصول و ضوابط کو مدنظر رکھا گیا جو عہد رسالت میں تھے۔ عہد رسالت میں غیر مسلموں سے تعلقات خیر خواہی عدل و احسان، رواداری اور احترام انسانیت کی بنیاد پر تھے۔ اور سختی تھی تو صرف فتنہ پرداز، معاشرتی امن تباہ کرنے والوں کے لیے یا پھر حملہ آوروں کے لیے۔ عہد خلفاء راشدین میں بھی ہمیں انہیں اصولوں کی پاسداری نظر آتی ہے۔

ذیل میں چار خلفاء راشدین کے دور میں غیر مسلموں سے تعلقات کا جائزہ لیا جاتا ہے۔

پہلے خلیفہ راشد حضرت ابوبکر صدیقؓ

نبی کریم ﷺ کے وصال کے بعد آپ کے قدیم رفیق اور جانثار ساتھی حضرت ابوبکر صدیق آپؐ کے جانشین مقرر ہوئے۔ ان کا نام عبداللہ، کنیت ابوبکر اور صدیق لقب ہے۔ آپ قریش کی شاخ بنی تیم سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ کا گھرانہ زمانہ جاہلیت سے نہایت معزز چلا آتا تھا۔ قریش کے نظام سیاسی میں خون بہا کے مال کی امانت داری کا عہدہ آپ ہی کے گھر میں تھا۔[2]

آپ ابتدا ہی سے سلیم الفطرت تھے۔ زمانہ جاہلیت میں بھی آپ کا دامن عرب کی مروجہ برائیوں سے پاک رہا اور لوگوں پر آپ کے حسن خلق، راست بازی اور متانت و سنجیدگی کا سکہ بیٹھا ہوا تھا اور اشراف مکہ میں آپ بڑی عزت و احترام کی نظر سے جانے جاتے تھے۔

آپ تقریباً نبی اکرم ﷺ کے ہم عمر تھے۔ طبیعت میں بھی نبی کریم ﷺ سے بہت زیادہ یگانگت پائی جاتی تھی۔ اس لیے دونوں میں کافی گہرے تعلقات اور روابط پیدا ہو گئے تھے۔[3]

---

[1] سنن ابی داؤد، کتاب السنۃ، باب فی لزوم السنۃ (۴۶۰۷) الکتب الستۃ، ص ۱۵۶۱

[2] المتقی علی علاؤ الدین بن حسام الدین، کنز العمال فی سنن الاقوال والافعال، حیدر آباد، مطبع دائرۃ المعارف الاسلامیہ، ۱۳۱۲ھ، ۳۲۰/۲

[3] کنز العمال، ۳۲۰/۲

نبی کریم ﷺ سے گہرے تعلقات کے ساتھ ساتھ کسی صحابی کی دعوت اسلام کے لیے خدمات ابوبکر صدیق کے برابر نہیں تھیں۔ کنز العمال میں ہے:

''قریش کے سن رسیدہ لوگوں میں سب سے پہلے اسلام قبول کیا اور مکہ کی پرخطر اور مظلومیت کی زندگی کے ہر مرحلہ میں نبی کریم ﷺ کے پشت پناہ رہے۔ تبلیغ اسلام میں آپ کی رفاقت کرتے جہاں نبی کریم تشریف لے جاتے، ساتھ جاتے اور اپنے جاننے والوں سے حضور ﷺ کا تعارف کراتے۔''[1]

ہجرت کے بعد جب نبی کریم ﷺ نے مسجد نبوی کی تعمیر کا ارادہ کیا تو اس کی زمین کی قیمت جو دو یتیموں کی ملکیت تھی حضرت ابوبکر نے ادا کی اس طرح مدینہ میں پہلا خانہ خدا حضرت ابوبکر صدیق کی مدد سے تعمیر ہوا۔[2]

بعض مواقع پر گھر کا سارا اثاثہ خدا کی راہ میں پیش کر دیا۔ جب نبی کریم ﷺ نے پوچھا کہ کچھ اہل وعیال کے لیے بھی چھوڑا ہے تو عرض کیا ان کے لیے اللہ اور اس کا رسول کافی ہے۔[3]

فتح مکہ کے بعد سنہ ۹ھ میں سب سے پہلا موقع تھا کہ کعبۃ اللہ کو کفر وشرک کی ظلمتوں سے بالکل پاک وصاف کر دیا جائے اور ارکان حج سنت ابراہیمی کے مطابق ادا ہوں۔ چنانچہ اس سال ذی الحجہ کے اوائل میں نبی کریم ﷺ نے تین سو مسلمانوں کا ایک قافلہ حج کے لیے روانہ فرمایا تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اس کے امیر الحج مقرر ہوئے۔[4]

دور صدیقی میں غیر مسلموں سے تعلقات:

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کے وصال ۱۲ ربیع الاول سنہ ۱۱ ہجری کے بعد خلیفہ مقرر ہوئے تو اس وقت بہت ہی نازک حالات کا انہیں سامنا کرنا پڑا۔ نبی کریم ﷺ کے کئی سربرآوردہ لیڈران کے انتخاب سے ناراض ہو کر ترک موالات کیے ہوئے تھے۔ مدینہ سے باہر کونے کونے سے خاص وعام اسلام کی بندشوں سے نکلنے کے اعلان کر رہے تھے۔ سرکاری آمدنی جو زکوٰۃ کی صورت میں اکٹھی ہوتی تھی بہت کم رہ گئی تھی۔ منافقین اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے خیال کر رہے تھے کہ جلد ہی اس مذہب کی بساط الٹ جائے گی۔ براعظم کے بیشتر عربوں نے راہ ارتداد اختیار کر لی تھی یا زکوٰۃ روک لی تھی۔[5] نبی کریم ﷺ کے مقرر کردہ معلم قرآن اور عاملین زکوٰۃ اپنے اپنے صدر مقامات سے بھاگ آئے تھے۔[6]

---

[1] کنز العمال، ۳۱۹/۲

[2] فتح الباری، ۱۱۶/۷

[3] جامع ترمذی، کتاب المناقب، باب رجاءہ ﷺ ان یکون ابوبکر ممن یدعی من جمیع ابواب الجنۃ (۳۶۷۵) الکتب الستۃ، ص ۲۰۳۰

[4] تاریخ طبری، ۱۵۴/۲

[5] ایضاً ۲۲۱/۳

[6] ایضاً، ص ۲۲۲

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا جنہوں نے اس تمام فتنے کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا یوں بیان کرتی ہیں:

"جب نبی کریم ﷺ نے وفات پائی تو نفاق نے ہر طرف سر بلند کیا اور بہت سے قبائل مرتد ہو گئے۔ انصار بھی الگ ہو گئے۔ اس وقت میرے باپ (ابوبکرؓ) پر ایسی مصیبت نازل ہوئی کہ اگر بلند اور مضبوط پہاڑوں پر نازل ہوتی تو انہیں بھی ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دیتی۔"[1]

حضرت ابوبکر صدیقؓ نے بڑی دلیری اور نہایت استقامت کے ساتھ اس ہولناک طوفان کا نہایت ناموافق حالات کے باوجود کامیاب مقابلہ کیا اور ارتداد کے طوفان کو جس نے پورے عرب کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا اپنے ایمان اور عزم و ثبات کے جذبے کے ساتھ روک دیا۔ طبری لکھتے ہیں:

تین ماہ تک ابوبکر صدیق نے رسول اللہ ﷺ کی طرح سفیروں کے ذریعے بگڑتے حالات کا مقابلہ کیا یعنی بغاوت کا مقابلہ کرنے کے لیے مناسب احکامات لگاتار بھیجتے رہے۔[2]

اسی نازک مرحلے پر جب ہر طرف سے ارتداد کی خبریں آ رہی تھیں۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کو یہ مشورے دیے گئے کہ وہ اس لشکر کو واپس بلا لیں جسے رسول اللہ ﷺ نے سات سو سوار دے کر حضرت اسامہ بن زید کی سرکردگی میں شام کی طرف روانہ کیا تھا۔ یہ لشکر ابھی ذی خشب تک پہنچا تھا کہ رسول کریم ﷺ کا وصال ہو گیا۔ فتنہ ارتداد کے پیش نظر صحابہ نے اس لشکر کی روانگی کو حالات کے موافق نہ سمجھا اور حضرت ابوبکر صدیق سے پرزور درخواست کی کہ اس مہم کو فی الحال روک دیا جائے۔ صحابہ کی یہ بات سن کر حضرت ابوبکر نے فرمایا:

"اس خدا کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اگر صحرا کے کتے شہر میں گھس آئیں اور ازواج مطہرات کے پاؤں تک بھی پہنچ جائیں تب بھی میں اس لشکر کو واپس نہیں بلاؤں گا جس کا پیغمبر خدا ﷺ روانہ ہونے کا حکم دے چکے ہیں۔"[3]

اس کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے حضرت اسامہ کو روانہ ہونے کا حکم دیا۔ جب یہ لشکر کسی ایسے قبیلے کے پاس سے گزرتا جو مرتد ہونا چاہتا تھا تو وہ لوگ آپس میں کہتے کہ: "اگر اہل مدینہ کے پاس طاقت اور قوت نہ ہوتی تو ایسے نازک وقت میں وہ اس لشکر کو ہرگز اپنے سے جدا نہ کرتے پس روم سے جنگ ہونے تک مسلمانوں سے کچھ نہ کہو بعد میں دیکھا جائے گا۔ جب مسلمان رومیوں کو شکست دے کر واپس آئے تو یہ دیکھا کہ وہ لوگ اسلام پر قائم ہیں۔"[4]

لشکر اسامہ کی کامیاب واپسی کے اچھے اثرات مرتب ہوئے لیکن پھر بھی ہر شہر اور قصبہ فتنہ ارتداد کی لپیٹ میں آیا ہوا تھا۔ حضرت ابوبکرؓ کے دور کے فتنہ پردازوں کو تین قسموں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

---

[1] تاریخ الخلفاء، ص ۵۳

[2] تاریخ طبری، ۳/ ۲۶۳

[3] ایضاً، ۳/ ۲۱۳

[4] تاریخ الخلفاء، ص ۵۴، ۵۵

۱۔ منکرین خلافت:

بعض بدوی قبائل ایسے تھے جو نبی کریمؐ کی حکومت پر تو جس طرح ہوسکا راضی ہوگئے تھے مگر آپ کے وصال کے بعد کسی شخص کے غلبے کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ وہ مدینہ کی موجودہ حکومت کو اس بات کا حقدار نہیں سمجھتے تھے کہ وہ ان پر حکمرانی کرے۔

۲۔ منکرین زکوۃ:

زکوۃ کو بعض قبیلے ایک ناقابل برداشت بوجھ اور نہایت نامناسب ٹیکس سمجھتے تھے اور اسے کسی صورت سے بھی ادا کرنے کو تیار نہ تھے۔ رسول کریم ﷺ کو تو انہوں نے زکوۃ ادا کردی تھی مگر آپؐ کے جانشین کو وہ اس کا ہرگز مستحق نہ سمجھتے تھے۔

۳۔ جھوٹے نبی:

بہت سے جھوٹے نبی پیدا ہو کر مسلمانوں سے برسرپیکار ہوگئے۔ فتوحات اور مال غنیمت حاصل کرنے کے شوق میں ہزاروں عرب مرتد ہو کر ان کے ساتھ شامل ہوگئے اور ہر طرف ملک میں جنگ و جدال کا بازار گرم ہوگیا۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ کا غیر مسلموں سے مثبت رویہ:

مذکورہ تینوں قسم کے فتنہ پرداز اپنے غلط عقیدہ کے باوجود اگر اپنے گھروں میں پرامن بیٹھے رہتے تو ان کے خلاف حضرت ابوبکر صدیقؓ سخت اقدام نہ کرتے اور لا اکراہ فی الدین کے مسلمہ اسلامی اصول پر عمل پیرا رہتے۔ لیکن جب ان لوگوں نے باقاعدہ جتھے بنا کر ارتداد کے ساتھ ساتھ فساد، فتنہ انگیزی، قتل و غارت گری اور لوٹ مار کا بازار گرم کردیا۔ تو پھر ان سے سختی سے نمٹنا ہر لحاظ سے روا اور درست اقدام ٹھہرا۔

اس کے باوجود حضرت ابوبکر صدیقؓ نے ان لوگوں میں سے صرف باغیوں، سرکشوں اور فتنہ پردازوں کے استیصال اور ان کے علاوہ وہ لوگ جو مختلف وجوہ سے اسلام سے منحرف ہو چکے تھے، ان کو دوبارہ اسلام میں داخل کرنے کا لائحہ عمل بنایا۔ اس سلسلے میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کے مرتدین پر لشکر کشی سے قبل ان کے لیے تبلیغی اور اصلاحی خطوط اور اسلامی سپہ سالاروں کے لیے ضابطہ اخلاق آپ کی غیر مسلموں کے لیے ہمدردی اور اچھے تعلق کی اعلیٰ مثال ہے۔

ذیل میں ان خطوط اور ضابطہ اخلاق کا ذکر کیا جاتا ہے۔ طبری کے مطابق:

لشکروں کی روانگی سے قبل حضرت ابوبکر صدیقؓ نے بطور اتمام حجت مرتدین کو آخری موقع دینے کے لیے انہیں دوبارہ اسلام لانے اور امن سے رہنے کی دعوت دی۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے بہت سے تبلیغی خطوط لکھوائے اور اپنے قاصدوں کے ہاتھ ان تمام علاقوں میں بھیج دیے جہاں ارتداد اور فتنہ و فساد کے شعلے زور شور سے بھڑک رہے تھے۔ خصوصاً حجاز اور یمن کے تمام قبائل۔ اس کارروائی کے علاوہ انہوں نے ان خطوط کی ایک ایک نقل لشکروں کے تمام سرداروں کو بھی دے دی اور ان سے کہہ دیا کہ جب تمہاری فوج دشمن کے سامنے جا کر خیمہ زن ہو تو لڑائی ہونے سے پہلے ہی خط مرتدین کے لشکر کو با آواز بلند سنادینا تاکہ ہر شخص پر

ذاتی طور سے بھی اتمام حجت ہو جائے اور کسی شخص کو یہ عذر نہ رہے کہ مجھ تک اسلام کی تبلیغ نہیں پہنچی [1]

حضرت ابوبکر صدیق ؓ نے اپنے خطوط میں نبی کریم ﷺ کے بشیر اور نذیر ہونے اور آپ کی وفات کے حوالے سے آیات قرآنیہ بھی لکھتے تھے۔ ان آیات کے لکھنے سے مقصود یہ تھا کہ ان لوگوں کی غلط فہمی کو دور کیا جائے جو یہ کہتے تھے کہ اگر محمد سچے نبی ہوتے تو کبھی نہ مرتے۔

اپنے خطوط کے آخر میں تحریر فرمایا تھا:

مجھے معلوم ہے کہ تم میں سے بعض لوگوں نے قبول اسلام کے بعد اسے ترک کر دیا ہے اور وہ شیطان کے بہکاوے میں آ گئے ہیں۔ میں نے مہاجرین، انصار اور تابعین کے مشترکہ لشکر کو فلاں شخص کی قیادت میں تمہاری طرف بھیجا ہے اور اسے حکم دیا ہے کہ وہ اس وقت تک جنگ و جدل سے اپنا دامن بچائے جب تک تم کو اسلام قبول کرنے کی دعوت نہ دے دے جو شخص اس کی بات مان لے گا اور دوبارہ اپنے اسلام کا اقرار کرلے گا اور فتنہ و فساد اور بغاوت سے باز آ جائے گا اس سے کوئی تعرض نہیں کیا جائے گا۔ خط سننے کے بعد جو لوگ اذان دیں ان سے ہاتھ روک لیا جائے اگر وہ اسلام قبول کریں تو ان کا اسلام قبول کر لیا جائے [2]

مرتدین کے نام تبلیغی خطوط کے علاوہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مزید احتیاط کے طور پر تمام فوجی کمانڈروں کے لیے ایک تبلیغی ہدایت نامہ تحریر فرمایا اور اس کی ایک ایک نقل ہر کمانڈر کو دے دی گئی اور ان کو تاکید کر دی گئی کہ ان ہدایات پر سختی سے عمل کریں تاکہ کسی بھی غیر مسلم کے ساتھ زیادتی نہ ہونے پائے۔ اس عہد نامے کی عبارت یہ تھی:

یہ عہد ابوبکر خلیفہ رسول اللہ ﷺ کی طرف سے ہے اور فلاں شخص سے لیا جاتا ہے جبکہ وہ ان لوگوں سے لڑنے جا رہا ہے جنہوں نے اسلام کو چھوڑ دیا ہے۔ فلاں شخص سے یہ عہد لیا جاتا ہے کہ جہاں تک اس کے امکان میں ہو گا وہ ظاہر اور پوشیدہ اللہ تعالیٰ کا تقویٰ اختیار کرے گا۔ وہ خدا کی راہ میں ہر طرح کوشاں رہے گا اور لوگوں سے خدا کے لیے لڑے گا جو اسلام کو چھوڑ کر شیطان کے پیرو ہو گئے ہیں۔ البتہ اتمام حجت کے لیے وہ ان کو پہلے اسلام کی طرف بلائے گا اگر وہ دائرہ اسلام میں آ جائیں گے تو ان سے کوئی تعرض نہ کرے گا۔ وہ مسلمانوں کو اس بات کی تاکید کرے گا کہ وہ نیک صحبت اختیار کریں اور اپنے ساتھیوں سے نرمی کا برتاؤ کریں۔ [3]

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے تمام فوجی کمانڈروں نے مذکورہ عہد نامہ کی پابندی کی انہوں نے جنگی کارناموں کے ساتھ ساتھ ہر ہر قبیلے میں جا کر تبلیغ کی اور انہیں راہ راست پر دوبارہ لگا دیا۔

---

[1] تاریخ طبری، ۲۲۵/۳

[2] ایضاً ۲۲۶/۳، ۲۲۷

[3] ایضاً ۲۲۶/۳

دورِ صدیقی کے اہم معاہدات

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنی کمال فراست اور قوت ایمانی سے تمام فتنوں کو دبا کر ملک میں امن و امان قائم کر دیا۔ آپ کے دور میں غیر مسلم رعایا پر امن رہی اور اس پرفتن دور میں انہوں نے کسی قسم کی ہنگامہ آرائی نہیں کی تھی۔ لہٰذا ان کے ساتھ وہ معاہدات جو نبی کریم ﷺ سے ہوئے تھے ان پر عمل درآمد کرتے ہوئے ان سے کوئی تعرض نہیں کیا گیا۔ اندرونی خلفشار روکنے کے لیے سپہ سالاروں کو تبلیغی خطوط اور ضابطہ اخلاق دیے گئے اور انہیں اسلام میں لانے اور فتنہ پردازوں کو دوبارہ اسلام میں لانے کے لیے ابلاغ کے تمام تقاضے پورے کیے گئے۔

جزیرۃ العرب سے باہر جب اسلامی فوجیں مصروف جہاد ہوئیں تو انہوں نے مفتوحہ علاقوں میں غیر مسلم رعایا سے معاہدات کیے اور ان کی توثیق دربارِ خلافت سے حاصل کی۔ وہ معاہدات جو عہد صدیقی میں ہوئے ان کی تعداد کافی ہے۔ جن میں سے چند معاہدے جن میں باقی تمام معاہدوں کا خلاصہ آ جاتا ہے اور جن سے غیر مسلموں سے مسلمانوں کا فراخ دلی کا رویہ واضح ہوتا ہے ذیل میں ان کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ جب خلیفہ اول کے فرمان کے مطابق دمشق اور شام کی سرحدوں سے عراق اور ایران کی طرف لوٹے تو راستے میں باشندگان عانات کے ساتھ یہ معاہدہ کیا:

اہل عانات سے معاہدہ:

۱۔ ان کے گرجے اور خانقاہیں منہدم نہیں کی جائیں گی۔

۲۔ وہ ہماری نماز پنج گانہ کے سوا ہر وقت اپنا ناقوس بجا سکتے ہیں۔ ان پر کوئی پابندی نہیں۔

۳۔ وہ شوق سے اپنی عید پر صلیب نکالیں

۴۔ مسلمان مسافر کی ضیافت کریں۔

۵۔ وقت پڑنے پر مسلمانوں کی جان و مال کی نگہداشت کریں۔[۱]

دورِ صدیقی کا اہم معاہدہ:

حضرت ابو بکر صدیق کے زمانہ خلافت کا اہم واقعہ صلح حیرہ ہے۔ اسلامی فوج کے کمانڈر خالد بن ولید کے ہاتھوں یہ شہر فتح ہوا تو اہل حیرہ نے عمرو بن عبدالمسیح اور ایاس بن قبیصہ کی معرفت صلح کی گفتگو کی اور خالد بن ولید اور ان کے درمیان یہ معاہدہ طے پایا جو حسب ذیل ہے:

یہ معاہدہ ہے خالد بن ولید اور عدی اور عمرو پسران عدی اور عمرو بن عبدالمسیح اور ایاس بن قبیصہ اور حیری بن اکال کے درمیان! خالد کے علاوہ باقی پانچ افراد حیرہ کے سربراہ ہیں۔ اہل حیرہ نے انہیں اس معاہدے کے لیے برضا و رغبت منتخب کیا ہے۔

---

[۱] الوثائق السیاسیہ، ص ۳۲۳ وثیقہ ۲۹۸

شرائط معاہدہ حسب ذیل ہیں:

پانچوں اشخاص سالانہ ایک لاکھ نوے ہزار درہم بطور جزیہ عوام اور اپنے علماء اور زاہدوں کی طرف سے مسلمانوں کو پیش کریں۔ البتہ ان کے تارک دنیا اور مفلس درویشوں سے جزیہ نہ لیا جائے گا۔ اس کے عوض میں مسلمان ان کے دشمنوں سے ان کی حفاظت کریں گے اگر وہ ایسا نہ کرسکیں تو جزیہ وصول کرنے کے حق دار نہ ہوں گے۔ لیکن اگر یہ لوگ جزیہ ادا نہیں کریں گے تو مسلمانوں پر ان کی حفاظت کا ذمہ نہیں ہوگا۔[1]

ذمیوں کے حقوق سے متعلق حضرت خالد بن ولید نے حیرہ کی فتح میں جو معاہدہ لکھا اس میں یہ الفاظ تھے:

اور میں نے ان کو یہ حق دیا ہے کہ اگر کوئی بوڑھا شخص کام کرنے سے معذور ہو جائے یا اس پر کوئی آفت آئے یا پہلے دولت مند تھا پھر غریب ہو گیا اور اس وجہ سے اس کے ہم مذہب اس کو خیرات دینے لگیں تو اس کا جزیہ موقوف کر دیا جائے گا اور اس کو اور اس کی اولاد کو مسلمانوں کے بیت المال سے نفقہ دیا جائے گا جب تک وہ مسلمانوں کے ملک میں رہے لیکن اگر وہ غیر ملک میں چلا جائے تو مسلمانوں پر اس کا نفقہ واجب نہ ہوگا۔[2]

حضرت ابوبکر صدیق کے تمام معاہدات ملکی قانون کا حصہ بن گئے۔ آپ کا عرصہ حکمرانی جو تقریباً سوا دو سال پر پھیلا ہوا ہے اس میں بہت کم ایسے واقعات ملتے ہیں جن کا تعلق اقلیتی افراد سے ہو اس کی وجہ یہ ہے کہ جو معاہدات ہوئے ان پر مکمل عمل درآمد کیا گیا اور کبھی بھی اقلیتی افراد کو محرومی حقوق کا احساس تک نہ ہوا۔

غیر مسلموں سے رواداری اور عدم تعرض کی بہترین مثال حضرت ابوبکر صدیق کے اس بیان سے ظاہر ہوتی ہے:

ایک دفعہ سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں ایک عورت نے جس کا تعلق اقلیتی گروہ سے تھا اسلام اور مسلمانوں کی ہجو کہی اس جرم پر مقامی حاکم نے اسے سزا دی جب اس کا علم حضرت ابوبکرؓ کو ہوا تو آپ نے مقامی حاکم کو ایک خط لکھا جس میں اسے تنبیہ فرماتے ہوئے تحریر کیا: "جب ہم نے اس کے کفر و شرک کو برداشت کر لیا ہے تو ہجو تو بہرحال اس سے کم تر درجہ کا جرم ہے۔" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خلیفہ اول کو اقلیتوں کا کس قدر خیال رہتا تھا اور ان کے اندر اپنی غیر مسلم رعایا کے لیے کس قدر فراخ دلی موجود تھی۔

---

[1] البلاذری، امام ابوالحسن، فتوح البلدان، قاہرہ، مطبعہ المصریہ، ۱۹۳۲ء، ص ۲۵۲، ۲۵۳

[2] کتاب الخراج، ص ۸۵

دوسرے خلیفہ راشد حضرت عمر بن خطاب

حضرت ابوبکر صدیق نے اپنی عمر کے آخری ایام میں حضرت عمر بن خطاب کو اپنا خلیفہ نامزد کر دیا تھا۔[1] اس طرح حضرت ابوبکرؓ کی وفات کے بعد جمادی الثانی ۱۳ھ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان کے جانشین ہوئے۔

آپ کا نام عمر اور فاروق لقب ہے۔ آپ قریش کی شاخ بنی عدی سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ کا خاندان زمانہ جاہلیت میں بھی امتیازی حیثیت رکھتا تھا۔ قریش کے نظام سفارت اور جھگڑے نپٹانے کا عہدہ آپ ہی کے خاندان میں تھا۔[2]
حضرت عمر رضی اللہ عنہ بہت اچھے خطیب تھے۔ ذریعہ معاش تجارت تھا تجارت کے لیے دور دراز کے سفروں نے انہیں بہت تجربہ کار اور معاملہ فہم بنا دیا تھا۔

قبائل میں جب کوئی پیچیدہ مسئلہ درپیش ہوتا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہی سفیر بن کر جاتے تھے اور اپنی فہم و فراست سے اس کا حل کرتے تھے۔[3]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی صداقت و حق پرستی، اہلیت اور تدبر صحابہ کرام میں مسلم تھی۔ البتہ کچھ لوگوں نے ان کی مزاج کی سختی کا اظہار کیا تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ان کے حق پرستی کے جذبے کی قدر کرتے ہوئے یوں فرمایا:

انی ولیت علیکم خیر کم فی نفسی ۔[4]

''میں نے اپنی دانست میں تم میں بہتر آدمی کو تمہارا حاکم بنایا ہے۔''

اس پر تمام صحابہ نے اس انتخاب کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا۔

دور فاروقی میں غیر مسلموں سے تعلقات و معاہدات:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دس سالہ دور حکومت میں ایران و روم کی عظیم الشان سلطنتیں زیر نگیں آئیں اور اسلامی پرچم برصغیر کی سرحد سے لے کر شمالی افریقہ تک لہرانے لگا۔ یہ تمام فتوحات اس احتیاط کے ساتھ ہوئیں کہ ظلم و جبر کا ایک واقعہ بھی پیش نہیں آیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا دور حکومت فتوحات کے ساتھ ساتھ اشاعت اسلام کے لحاظ سے بہت اہم ہے ان کے دور حکومت میں اسلام بہت سرعت کے ساتھ پھیلتا رہا۔ اشاعت اسلام کے لیے جبر اور طاقت کا طریقہ استعمال نہیں کیا گیا۔ حضرت عمرؓ نے بھی اپنے سپہ سالاروں کو اس کا حکم نہیں دیا۔

---

[1] تاریخ طبری، ۵۱/۳
[2] ابن عبد ربہ، احمد بن محمد، العقد الفرید، القاہرہ، مطبعہ التالیف والنشر والترجمہ، ۱۹۴۰ء، باب فضائل عرب، ۳۱۴/۳
[3] ابن عبد البر، الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب، حیدرآباد، مطبع دائرۃ المعارف، ۱۳۳۶ھ، ۳۶۵/۲
[4] تاریخ طبری، ۵۱/۲

جبر و اکراہ کی ممانعت:

حضرت عمرؓ اس بات کے سخت خلاف تھے کہ کسی شخص پر اسلام لانے کے لیے جبر کیا جائے۔ ان کا ایک غیر مسلم غلام تھا جسے وہ ہمیشہ اسلام کی تبلیغ کرتے اور مسلمان ہو جانے کی ترغیب دیتے مگر وہ ہمیشہ انکار کرتا۔ جس پر حضرت عمرؓ یہ کہہ کر خاموش ہو جاتے کہ لا اکراہ فی الدین [۱]

ذمیوں کے جان و مال کا تحفظ:

دور فاروقی میں ذمیوں کے جان و مال کو مسلمانوں کے جان و مال کے برابر قرار دیا جاتا تھا۔ اگر کوئی مسلمان کسی ذمی کو قتل کر ڈالتا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ فوراً اس کے بدلے مسلمان کو قتل کرا دیتے تھے۔ امام شافعیؒ نے روایت کی ہے کہ قبیلہ بکر بن وائل کے ایک شخص نے حیرہ کے ایک عیسائی کو مار ڈالا تو حضرت عمر نے لکھ بھیجا کہ قاتل مقتول کے وارثوں کو دے دیا جائے۔ چنانچہ وہ شخص مقتول کے وارث کو جس کا نام حنین تھا حوالہ کیا گیا اور اس نے اس کو قتل کر ڈالا [۲]

مالگزاری کے بندوبست میں ذمیوں کا خیال:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس بات کا بہت خیال رہتا تھا کہ غیر مسلموں پر بے جا بوجھ نہ ڈالا جائے جب عراق کا خراج آتا تو دس شخص کوفہ اور دس شخص بصرہ سے طلب کیے جاتے تھے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان سے چار دفعہ تاکید قسم لیتے تھے کہ مالگواری کے وصول کرنے میں کچھ سختی تو نہیں کی گئی ہے۔ وفات سے دو تین دن پہلے کا واقعہ ہے کہ افسران بندوبست کو بلایا اور تشخیص جمع کے متعلق ان سے گفتگو کی اور بار بار پوچھتے رہے کہ جمع سخت تو مقرر نہیں کی گئی [۳]

ذمیوں سے ملکی انتظام و معاملات میں مشورہ:

حضرت عمرؓ ہمیشہ ان انتظامات میں جن کا تعلق ذمیوں سے ہوتا تھا، انہیں مشورے اور استصواب کے لیے بلاتے تھے۔ عراق کا بندوبست جب پیش آیا تو عجمی رئیسوں کو مدینہ میں بلا کر مالگواری کے حالات دریافت فرمائے۔ مصر میں جو انتظام کیا اس میں مقوقس سے اکثر رائے لی [۴]

فصلوں کی پامالی پر معاوضہ:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں ذمیوں کی جان و مال کے حقوق کی پاسداری پر سختی سے عمل کیا جاتا تھا۔

---

۱ ابو عبید، القاسم بن سلام، کتاب الاموال، ص ۸۷

۲ الدرایہ فی تخریج احادیث الھدایہ مطبوعہ دہلی، س ن، ص ۳۶۰

۳ کتاب الخراج، ص ۳۱

۴ مقریزی، تقی الدین احمد بن علی، الخطط المقریزیہ، القاہرہ، مطبع النیلی، ۱۳۲۴ھ، ۱/۲۷

شام کے ایک کاشتکار نے شکایت کی کہ اہل فوج نے اس کی زراعت کو پامال کر دیا ہے۔ حضرت عمرؓ نے بیت المال سے دس ہزار درہم اس کو معاوضہ کے طور پر دلوائے۔[1]

ملکی حقوق میں مسلمانوں اور ذمیوں کی برابری:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ملکی حقوق کے لحاظ سے ذمیوں اور مسلمانوں میں کوئی تمیز روا نہ رکھی تھی کوئی مسلمان اگر ذمی کو قتل کرتا تو بے دریغ اس کے قصاص میں قتل کر دیا جاتا۔ مسلمان اگر ذمی سے سخت کلامی کرتے تھے تو پاداش کے مستحق ٹھہرائے جاتے تھے۔ ذمیوں سے جزیہ اور عشور کے سوا کسی قسم کا محصول نہیں لیا جاتا تھا۔ اس کے مقابلے میں مسلمانوں سے زکوٰۃ وصول کی جاتی تھی جس کی مقدار دونوں سے زیادہ تھی اس کے سوا عشور مسلمانوں سے بھی وصول کیا جاتا تھا البتہ اس کی شرح کچھ کم تھی۔

بیت المال سے اپاہج اور ضعیف مسلمانوں کی طرح غیر مسلم بھی وظیفہ پاتے تھے۔ یہ قاعدہ حضرت ابوبکر صدیق کے دور میں معاہدہ حیرہ میں طے پایا تھا۔ اس کا ذکر گزر چکا ہے۔ عہد فاروقی میں اس اصول کو قرآن کی آیت سے مستند کر کے نافذ العمل کیا گیا یعنی بیت المال کے داروغہ کو یہ لکھ بھیجا کہ قرآن مجید کی آیت انما الصدقات للفقراء والمساکین میں فقراء کے لفظ سے مسلمان اور مسکین کے لفظ سے اہل کتاب یہودی اور عیسائی مراد ہیں۔ اور اس کی عملی مثال حضرت عمرؓ نے ایک نہایت بوڑھے شخص کا جزیہ معاف اور وظیفہ جاری کر کے دی۔

بوڑھے ذمی کا جزیہ معاف اور وظیفہ جاری:

ایک دفعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک پیر کہن سال کو بھیک مانگتے دیکھا تو پوچھا کہ بھیک کیوں مانگتا ہے؟ اس نے کہا مجھ پر جزیہ لگایا گیا ہے اور میں ادائیگی کی طاقت نہیں رکھتا۔ حضرت عمرؓ اس کو ساتھ لے گئے اور کچھ نقد دے کر بیت المال کے داروغہ کو کہلا بھیجا کہ اس قسم کے معذوروں کے لیے بیت المال سے وظیفہ مقرر کر دیا جائے اور فرمایا:

"واللہ یہ انصاف کی بات نہیں کہ ہم ان لوگوں کی جوانی سے متمتع ہوں اور بڑھاپے میں ان کو نکال دیں۔"[2]

مذہب کے حوالے سے مکمل آزادی:

عہد فاروقی میں ذمیوں کو مکمل آزادی حاصل تھی وہ ہر قسم کی مذہبی رسوم ادا کرتے تھے۔ علانیہ ناقوس بجاتے تھے صلیب نکالتے تھے ہر قسم کے میلے ٹھیلے کرتے تھے ان کے پیشوایان مذہبی کو جو مذہبی اختیارات حاصل تھے بالکل برقرار رکھے گئے تھے۔

مصر میں اسکندریہ کا پیٹریارک بنیامین تیرہ برس تک رومیوں کے ڈر سے ادھر ادھر مارا مارا پھرا۔ عمرو بن العاص نے جب مصر فتح کیا تو ۲۰ھ میں ان کو تحریری امان لکھ کر بھیجی وہ نہایت ممنون ہو کر آیا اور پیٹریارک کی کرسی دوبارہ اسے نصیب ہوئی۔[3]

---

[1] کتاب الخراج، ص ۶۸

[2] ایضاً، ص ۷۲

[3] مقریزی، ۱/ ۴۹۲

غیر مسلموں سے ہونے والے تمام معاہدات میں مذہبی آزادی کی باقاعدہ شق رکھی جاتی رہی ہے۔

ذمیوں کی عزت نفس کا خیال:

دور فاروقی میں ذمیوں کی عزت نفس کا خیال رکھا جاتا تھا اور ان کی نسبت کسی قسم کی تحقیر کو نہایت ناپسندیدہ خیال کیا جاتا تھا۔ عمیر بن سعد جو حمص کے حاکم تھے اور زہد و تقدس میں تمام عہدیداران میں نمایاں مقام رکھتے تھے ان سے ایک مرتبہ ایک ذمی کے لیے یہ الفاظ نکل گئے: اخزاک اللہ یعنی اللہ تجھے رسوا کرے۔ اس پر انہیں اس قدر ندامت اور افسوس ہوا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنے عہدے سے استعفیٰ دے دیا اور کہا اس نوکری کی بدولت مجھ سے یہ حرکت ہوئی [۱]

ذمیوں کا مسلمانوں کی حمایت کرنا:

عہد فاروقی میں ذمیوں کے ساتھ جو حسن سلوک کیا گیا اور انہیں لطف و مراعات سے نوازا گیا اسی کا یہ نتیجہ تھا کہ ذمیوں نے بسا اوقات اپنی ہم مذہب سلطنتوں کے مقابلے میں مسلمانوں کا ساتھ دیا اس کو رسد فراہم کی اور ان کے لیے خبر رسانی تک کا کام سر انجام دیا۔ ذمیوں میں مسلمانوں کے حسن سلوک کی وجہ سے ان سے اس قدر انس اور اخلاص و مروت کا جذبہ پیدا ہو گیا تھا کہ جنگ یرموک کے پیش آنے کے وقت جب مسلمان شہر حمص سے نکلے تو یہودیوں نے تورات ہاتھ میں لے کر کہا:

''جب تک ہم زندہ ہیں کبھی رومی یہاں نہ آ پائیں گے۔''

''عیسائیوں نے نہایت حسرت سے کہا خدا کی قسم تم رومیوں کی بہ نسبت کہیں بڑھ کر ہمیں محبوب ہو۔'' [۲]

ذمیوں سے متعلق حضرت عمرؓ پر اعتراضات کا جائزہ:

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ پر غیر مسلموں سے متعلق چند اعتراضات بھی ہیں جن کی حقیقت کا یہاں جائزہ لیا جاتا ہے۔ اعتراضات یہ تھے کہ حضرت عمرؓ نے ذمیوں کو حکم دیا کہ وضع اور لباس وغیرہ میں کسی طرح مسلمانوں کا تشبہ نہ کرنے پائیں کمر میں زنار باندھیں۔ شراب اور سور نہ بیچیں، ناقوس نہ بجائیں، صلیب نہ نکالیں۔ بنو تغلب کو یہ بھی حکم تھا کہ اپنی اولاد کو اصطباغ نہ دینے پائیں۔ مزید براں یہ کہ حضرت عمر نے عرب کی وسیع آبادی میں ایک یہودی یا عیسائی کو نہ رہنے دیا۔

لباس سے متعلق اعتراض کا جواب:

یہ بات درست ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ مسلمانوں کو غیر قوموں کی مشابہت سے روکتے تھے۔ اس کا سبب رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان بھی ہو سکتا ہے کہ من تشبہ بقوم فھو منھم۔ اس کے علاوہ اس پابندی سے مقصود قومی خصوصیتوں کو قائم رکھنا مقصود تھا۔

---

۱ ازالۃ الخفاء، ص ۲۰۳

۲ شبلی نعمانی، الفاروق، مکتبہ رحمانیہ لاہور، س ن، ص ۳۹۸

حضرت عمرؓ نے ذمیوں کو کسی خاص قسم کے لباس پہننے کا پابند نہ بنایا تھا بلکہ ان کے لیے وہی لباس تجویز کیا تھا جو ان کا اپنا قدیم لباس تھا یہ بطور تحقیر کے نہ تھا۔ ذمیوں کے لباس کے حوالے سے کہ یہ ان کا اپنا قدیم لباس ہی تھا۔

ایک قطعی دلیل اس بات کی کہ یہ لباس ذمیوں کا قدیم لباس تھا یہ ہے کہ خلیفہ منصور نے اپنے دربار کے لیے جو لباس قرار دیا تھا وہ قریب یہی لباس تھا لمبی ٹوپیاں جو زسل کی ہوتی تھیں وہی عجم کی ٹوپیاں تھیں جن کا نمونہ پارسیوں کے سروں پر آج بھی موجود ہے۔ اس درباری لباس میں پیٹی بھی داخل تھی اور یہ وہی زنار یا منطقہ یا کستیج ہے جو عجم کی قدیم وضع تھی۔ اگر یہ لباس کوئی جدید لباس ہوتا یا بطور تحقیر کے ایجاد کیا گیا ہوتا تو خلیفہ منصور اس کو اپنا اور اپنے درباریوں کا لباس کیوں کر قرار دے سکتا تھا[1]

صلیب اور ناقوس سے متعلق اعتراض کی حقیقت:

دورِ فاروقی میں مذہبی آزادی کے حوالے سے لکھا جا چکا ہے کہ ذمیوں کو ہر قسم کے تہوار منانے کی اجازت تھی ناقوس کی بھی انہیں اجازت تھی۔ صرف ان کو نماز کے اوقات میں پابند کیا گیا تھا کہ ناقوس نہ بجائیں اور مسلمانوں کی مجلس میں صلیب نہ نکالیں۔ معاہدے میں یہ الفاظ موجود تھے:

ولا یرفعوا فی نادی اھل الاسلام[2]

''وہ مسلمانوں کی مجلس میں صلیب نہ نکالیں۔''

یضربوا نوالیسھم ایۃ ساعتہ شاؤا من اللیل او النھار الا فی اوقات الصلوۃ[3]

''ذمی رات دن میں جس وقت چاہیں ناقوس بجائیں بجز نماز کے اوقات کے۔''

سور کی نسبت یہ الفاظ تھے:

ولا یخرجوا خنزیرًا من منازلھم الی افنیۃ المسلمین

''یعنی ذمی سور کو مسلمانوں کے احاطہ میں نہ لے جائیں۔''

مذکورہ تصریحات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مذکورہ پابندی عمومانہ تھی بلکہ صرف اوقات نماز یا مخصوص شرائط کے ساتھ تھی۔ لہٰذا اس کو عام قرار دینا ناانصافی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر تہمت کے مترادف ہے۔

---

[1] شبلی نعمانی، الفاروق، مکتبہ رحمانیہ لاہور، س ن، ص ٢٨٨

[2] کتاب الخراج، ص ٨٠

[3] ایضاً، ص ٨٦

اصطباغ پر پابندی کی حقیقت:

عیسائیوں پر یہ پابندی لگانے کا حضرت عمر کو قطعاً کوئی حق نہ تھا۔ بشرطیکہ یہ پابندی عیسائیوں ہی کے لیے ہوتی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ پابندی ان نومسلم افراد کی نابالغ اولاد سے متعلق لگائی تھی۔ یعنی اگر کوئی عیسائی اپنی آزاد مرضی سے مسلمان ہوا اور پھر نابالغ اولاد چھوڑ کر فوت ہو گیا تو اس کی اولاد کے بارے میں عیسائیوں کو یہ حق نہ ہوگا کہ اس کو اصطباغ دے کر عیسائی بنالیں یہ کوئی عام حکم نہ تھا۔

یہ صرف عیسائی نومسلموں کی اولاد سے متعلق حکم تھا۔ اس کو عمومی رنگ دینا عدل کے خلاف ہوگا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا عدل تو ضرب المثل کا درجہ اختیار کیے ہوئے تھا۔

مذکورہ حقائق سے واضح ہوتا ہے کہ امن عام میں خلل نہ واقع ہونے کے لیے اگر عیسائیوں کو یہ حکم دیا گیا کہ وہ مسلمانوں کی مجلسوں میں صلیب اور سور نہ لائیں خاص نماز کے اوقات میں ناقوس نہ بجائیں نومسلم عیسائیوں کی اولاد کو اصطباغ نہ دیں تو کیا یہ مذہبی تعصب اور ذمیوں سے ناروا سلوک کے زمرے میں آسکتا ہے؟ یہ اصل حقائق کو چھپانے اور عدم واقفیت ہی کی بنا پر ہوسکتا ہے یا پھر اسلام کو بدنام کرنے کے لیے۔

عہد فاروقی کے اہم معاہدات:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ عدل و انصاف کے پیکر تھے۔ ان کا عدل تو ضرب المثل بن چکا ہے۔ آپ نے اپنے عہد حکومت میں غیر مسلموں سے رواداری، ہمدردی اور فراخ دلی کا مظاہرہ کرنے کے ساتھ ساتھ انہیں مکمل مذہبی آزادی دی تھی اور جان و مال کا تحفظ فراہم کیا تھا۔ جس کی بہترین مثال آپ کے دور میں غیر مسلموں سے ہونے والے معاہدات ہیں۔ یہ معاہدات غیر مسلم اقوام سے ان کی اطاعت یا صلح کے وقت کیے گئے ہیں۔ ان میں غیر مسلموں کے مکمل حقوق کی پاسداری کے ساتھ ساتھ اس بات کا خاص خیال رکھا گیا ہے کہ کسی بھی شخص کو رعایا میں سے زبردستی مسلمان نہیں بنایا جائے گا۔ معاہدات حسب ذیل ہیں:

معاہدہ بیت المقدس:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے باشندگان ایلیا (بیت المقدس) کو مقام جابیہ میں امان دی۔ امان نامہ میں بیت المقدس کے علاوہ اس کی نواحی بستیوں کے لیے بھی ایک ہی تحریر امن نامہ پر اکتفا فرمایا:

بسم اللہ الرحمن الرحیم

یہ امان نامہ عبداللہ عمر امیر المومنین کی طرف سے باشندگان ایلیا کے لیے ہے۔ جس کی حسب ذیل شرائط ہیں:

۱۔ ان کے جان و مال، عبادت گاہیں، صلیب، تندرست و مریض سب کو امان دی جاتی ہے۔

۲۔ ان کے گرجوں کو نہ تو مسمار کیا جائے گا اور نہ ہی ان میں سکونت اختیار کی جائے گی اور نہ ہی ان کا درجہ و مرتبہ کم کیا جائے

گا۔ نہ ان کی متعلقہ اشیاء ان کے احاطوں اور ان کی وقف شدہ زمینوں کو کسی قسم کا نقصان پہنچائیں گے۔ جو مال و اسباب گرجاؤں میں ہوگا نہ اسے اپنے تصرف میں لائیں گے۔ نہ کسی شخص کو کوئی مال اس سے چھینا جائے گا۔ نہ کسی آدمی پر مذہب کے معاملے میں کسی قسم کا جبر کیا جائے گا۔ اور ایلیا میں ان کے پڑوس میں کسی یہودی کو بھی آباد نہ کیا جائے گا۔[1]

باشندگان ایلیا کے لیے شرائط:

۱۔ جو پابندی جزیہ کے بارے میں اہل مدائن پر ہے وہی ان پر بھی ہوگی۔

۲۔ وہ اپنے علاقہ سے رومی اور چوری پیشہ لوگوں کو نکال دیں۔

۳۔ اگر دونوں گروہ ہماری رعیت بن کر ایلیا میں رہنا چاہیں تو انہیں اجازت ہے۔ اور ان کے لیے بھی وہی مراعات اور شرائط ہوں گی جو ایلیا کے اصلی باشندوں کے لیے ہیں۔

۴۔ ایلیا میں اپنی اقامت گاہیں اگر چھوڑنا چاہیں تو ہم اپنی مفتوحہ مملکت میں ان کی جان و مال کی حفاظت کریں گے۔ اور ان کے ایلیا سے نکل جانے کی صورت میں ان کے متروک گرجے اور صلیب بحال رہیں گے۔

۵۔ ایلیا سے ملک بدر ہونے والوں کے سوا ملک میں مقیم باشندوں سے فصل کی کٹائی کے موقع پر جزیہ وصول کیا جائے گا۔

۶۔ اہل ایلیا میں سے جن لوگوں نے ہمارے خلاف جنگوں میں حصہ لیا تھا، اور ان کے کسی شخص کے ہاتھوں ہمارا فلاں سپاہی مارا گیا تو ان سے کوئی مواخذہ نہیں ہوگا۔ اور ان کے لیے جزیہ کے بارے میں وہی شرائط ہوں گی جو ایلیا کے عوام کے لیے ہیں۔

اس تحریر پر اللہ، اس کے رسول ﷺ، خلفاء اور مومنین سب کی ضمانت ہے۔ بشرطیکہ وہ طے شدہ جزیہ ادا کرنے میں کوتاہی نہ کریں۔ اس پر خالد بن ولیدؓ، عمرو بن العاص، عبدالرحمٰن بن عوف، معاویہ ابن ابی سفیان کے دستخط ہیں۔ کتابت معاویہ ابن ابی سفیان نے کی۔[2] تاریخ تحریر: ۱۵ھ

معاہدہ کی شرائط اور دفعات ملاحظہ کرنے سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ حضرت عمرؓ بزور مسلمان بنانے کے حق میں نہیں تھے۔ البتہ ان کا سلوک اور رویہ ایسا ہوتا تھا کہ لوگ خود بخود اسلام کی طرف کھنچے چلے آتے تھے۔

آپ نے جو معاہدے عراق، ایران، شام اور مصر کے باشندوں سے کیے اور جن کی تفصیل آئندہ صفحات میں آئے گی، ان میں بھی اسی اصول کو مدنظر رکھا ہے۔

حضرت عمرؓ کے عامل، گورنر اور فوجی کمانڈر خود بھی مجسمہ اخلاق کا نمونہ ہوتے تھے۔ اگر ان میں ذرا بھی کمزوری کا اظہار ہوتا تو فوراً انہیں معزول کر دیا جاتا تھا۔ آپ نے زیادہ زور اخلاق اور کردار کو سنوارنے پر دیا تھا۔

---

[1] تاریخ طبری، ۱۵۹/۴ (۲۲۰۵)

[2] محولہ بالا

۲۔ معاہدہ ایران:

ایران چونکہ ایک بہت بڑا ملک ہے اور یہ تقریباً حضرت عمرؓ کے زمانہ خلافت میں مسلمانوں کے زیرنگیں آ گیا تھا۔ اس لیے مختلف علاقوں میں مختلف معاہدے عمل میں لائے گئے۔ ان میں سے چند کے بارے میں شرائط کا ذکر کیا جاتا ہے۔ ان میں بھی یہی جذبہ کارفرما ہے کہ غیر مسلموں کو زیادہ سے زیادہ سہولتیں دی جائیں۔ ان کے ساتھ رواداری کا سلوک کیا جائے۔ اور انہیں ہر ممکن تحفظ دلایا جائے۔ نیز انہیں اسلام قبول کرنے کی ترغیب تو دلائی جائے لیکن اسلام قبول کرنے پر مجبور نہ کیا جائے۔ ان معاہدوں میں ایک معاہدہ نعمان بن مقرن کا اہل ماہ بہراذان کے ساتھ ہے جو وہاں کے ذمیوں کے لیے ہے۔

معاہدہ کی شرائط حسب ذیل ہیں:

۱۔ ان کے اموال، افراد اور اراضی پر ان کا قبضہ بدستور تسلیم کیا جاتا ہے۔

۲۔ انہیں نہ تو ان کے دین سے ہٹایا جائے گا اور نہ ہی ان کی شریعت سے کسی قسم کا تعرض کیا جائے گا۔

۳۔ انہیں ہر سال ایک مرتبہ جزیہ ادا کرنا ہوگا۔ جو ہمارے مقرر کردہ امیر کو پیش کرنا ہوگا۔ اس کے بدلے میں ان کی حمایت کی جائے گی۔

۴۔ جزیہ کی رقم صرف بالغ مردوں سے لی جائے گی۔

۵۔ جزیہ ہر شخص کی مالی حیثیت کے مطابق ہوگا۔

۶۔ نوواردو مسافروں کی راہبری کرنا ان پر لازم ہوگا۔

۷۔ گزرگاہوں کی درستی اور ان کی حفاظت بھی ان کے ذمہ ہوگی۔

۸۔ مسلمان فوجی دستوں کے ایک دن رات کے قیام وطعام کا انتظام بھی ان کے ذمہ ہوگا۔

۹۔ اگر انہوں نے کسی معاملے میں دھوکا دیا اور شرائط میں کمی کی تو ہماری طرف سے امان کی ذمہ داری ختم ہو جائے گی۔

گواہان: عبداللہ بن ذی السہمین، قعقاع بن عمرو، جریر بن عبداللہ تاریخ تحریر: محرم سنہ ۱۹ھ[1]

ایران کے باشندوں پر کوئی جبر نہیں کیا گیا تھا بلکہ انہیں پوری آزادی کے ساتھ اپنے مذہب پر کاربند رہتے ہوئے زندگی گزارنے کے مواقع دیے گئے۔ لیکن بعد میں ایک وقت ایسا آ گیا کہ تمام لوگ دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے۔

۳۔ معاہدہ آذربیجان:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

معاہدہ از عتبہ بن فرقد عامل امیر المومنین عمر بن الخطاب برائے اہل آذربیجان۔

اس خطہ کے لیے مندرجہ ذیل امور میں مکمل امن وامان اور آزادی کی ضمانت دی جاتی ہے۔ ہر قسم کی اراضی، پہاڑ اور ان

---

[1] تاریخ طبری، ۲/۲۳۵ (۲۶۳۳، ۲۶۳۲)

کے گردونواح کی وادیاں، چشمے، ہر چھوٹے بڑے کی آزادی، ان کے جان و مال کا تحفظ، مذہب اور شریعت میں دخل اندازی نہ کرنا۔ اور اپنی بساط کے مطابق جزیہ ادا کرنا۔ البتہ یہ لوگ جزیہ سے مستثنیٰ ہوں گے:

۱۔ کم سن بچوں سے جزیہ نہیں لیا جائے گا۔

۲۔ عورتوں سے جزیہ معاف ہوگا۔

۳۔ مفلس و نادار لوگ بھی جزیہ سے مستثنیٰ ہوں گے۔

۴۔ جو شخص ہمارے ساتھ جہاد میں شامل ہوگا اس سے اس سال کا جزیہ معاف ہوگا۔

۵۔ اگر کسی دوسرے خطے کا شخص یا قبیلہ ان کے ہاں آ کر آباد ہو جائے تو وہ بھی انہی شرائط کا پابند ہوگا۔ اور اس کو بھی وہی مراعات حاصل ہوں گی۔

۶۔ اور اگر ان میں سے کوئی شخص یا قبیلہ ترک وطن کر کے جانا چاہے تو اپنی سرحد تک ان کی حفاظت ہم پر ضروری ہوگی۔

تحریر کنندہ: جندب

گواہان: بکیر بن عبداللہ اللیثی، سماک بن خرشہ انصاری

تاریخ: سنہ ۱۸ھ[1]

۴۔ اہل رے کے ساتھ معاہدہ:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

از نعیم بن مقرن المزنی بن قولہ۔ برائے اہل رے اور ان کے حلیف۔

۱۔ تمہارے ہر بالغ مرد پر حسب استطاعت سالانہ جزیہ مقرر کیا جاتا ہے۔

۲۔ جزیہ کے علاوہ مسلمانوں کے ساتھ ہمدردی، ان کے نوواردوں کو راستوں سے آگاہ کرنا، دشمن سے ان کے متعلق مخبری نہ کرنا اور ان کے دشمنوں کے ساتھ ساز باز نہ کرنا اور ان کے حقوق کی نگہداشت کرنا بھی ان پر لازم ہوگا۔

۳۔ مسلمان نوواردوں کے ایک دن رات کے قیام و طعام کا بندوبست کرنا اور ان سے عزت و احترام سے پیش آنا بھی ان پر لازم ہے۔

۴۔ مسلمان کو سب وشتم کرنا اور ان کی توہین کرنا مستوجب سزا جرم ہوگا۔ کسی مسلمان کو زدوکوب کرنے کی سزا قتل ہوگی۔ اگر ایسے مجرم اور باغی حکومت کے حوالے نہ کیے گئے تو پوری بستی کو تاخت و تاراج کر دیا جائے گا۔[2]

اس معاہدے میں بھی صاف اور واضح شرائط ہیں جو ایک صاف دل اور سچے مسلمان کی خلوص نیتی کی آئینہ دار ہیں۔

---

[1] تاریخ طبری، ۲/ ۲۵۵

[2] ایضاً، ۲/ ۲۵۲ (۲۶۵۵)

۵۔ معاہدہ شام:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یہ تحریری معاہدہ خالد بن ولید کی طرف سے اہل دمشق کے لیے ہے:

۱۔ میں ان کی جان و مال اور عبادت گاہوں کی حفاظت کی ذمہ داری حسب ذیل طریق سے لیتا ہوں:

(الف) ان کے شہر کی فصیلیں گرائی نہیں جائیں گی۔

(ب) مسلمان ان کے رہائشی مکانوں میں قیام نہیں کریں گے۔

(ج) ان کے ساتھ ہر ممکن عمدہ سلوک کیا جائے گا۔

۲۔ مندرجہ بالا مراعات کے عوض میں ان پر جزیہ ادا کرنا لازم ہوگا۔

۳۔ ہماری طرف سے ان شرائط کی پابندی خدا، اس کے رسولؐ اور خلفاء و مومنین پر ہے۔[1]

گواہان: ابو عبیدہ بن جراح، شرجیل بن حسنہ، قضاعی بن عامر۔

تاریخ تحریر: سنہ ۱۳ھ

شامیوں کو پورا تحفظ دلایا گیا ہے اور انہیں اپنے مذہب پر رہنے کی آزادی دی گئی ہے۔

۶۔ معاہدہ مصر:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں عمرو بن العاص نے مصر کے مشہور تاریخی شہر عبد شمس پر دھاوا بول دیا۔ ادھر سے مقابلہ کے لیے مصر کے قبطی اور نوبہ کے بربری ڈٹ گئے۔ حضرت زبیر بن عوام فصیل پر سے اچانک شہر میں داخل ہو گئے۔ اہل شہر نے امان کی درخواست کی جو قبول کر لی گئی اور حسب ذیل شرائط طے ہوئیں:۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عمرو بن العاص نے حسب ذیل شرائط پر امان دی:

۱۔ ان کے جان و مال، گرجے، صلیب، ہموار اور نشیبی زمین اور پانی کے ذخائر وغیرہ سے کوئی تعرض نہیں کیا جائے گا۔ البتہ وہ مزید عبادت گاہیں تعمیر نہ کریں۔ اور نہ ہی ہم ان میں سے کوئی کم کریں گے۔

۲۔ اہل نوبہ کو اپنے ہاں آباد نہ کریں گے۔

۳۔ جزیہ کا تعین مصر کے جملہ باشندوں کی صوابدید پر ہے۔ جس سال دریائے نیل میں طغیانی آئے گی اور پانی کی کثرت ہوگی اس سال جزیہ پانچ لاکھ ہوگا۔ اور جس سال پانی کی کمی کے سبب فصلیں کم ہوں گی اس کے مطابق جزیے میں کمی کی جائے گی۔

---

[1] فتوح البلدان، ص ۱۲۱

۴۔ اگر کوئی شخص بلا کسی وجہ کے جزیہ میں کمی کرے تو اس کے مطابق ذمہ داری میں بھی فرق آ جائے گا۔
۵۔ جس نے جزیہ دینے سے مطلق انکار کیا تو اس کی امان بھی ختم ہو جائے گی۔
۶۔ واردات کرنے پر صرف اصل مجرم قصوروار ہوگا۔ اس کے علاوہ کسی سے باز پرس نہیں ہوگی۔

اگر اس علاقہ کے قدیم باشندے رومی اور اہل نوبہ معاہدہ میں شریک ہونا چاہیں تو ہمیں منظور ہے اور ان کے ساتھ معاہدہ کی بھی وہی شرائط ہوں گی جو اہل مصر کے ساتھ طے ہوئی ہیں۔ اور ان پر جرمانہ جزیہ وہاں کی پیداوار کا نواں حصہ ہوگا۔

۷۔ اگر رومی اور بربری باشندوں میں سے کوئی شخص ہماری اطاعت نہ کرنا چاہے تو اسے یہاں سے ترک سکونت پر سرحد تک پہنچانے کی ذمہ داری ہم پر عائد ہوگی۔
۸۔ اہل نوبہ کو سالانہ اتنے گھوڑے ہمارے حوالہ کرنا ہوں گے، اس کے بدلے میں ہم نہ تو اس پر حملہ کریں اور نہ انہیں داخلی اور خارجی تجارت سے روکا جائے گا۔[1]

اسلام کا اصل مقصد حکومت یا ریاست کا قیام نہیں ہے بلکہ تبلیغ واشاعت اسلام ہے۔ اس لیے خلفائے راشدینؓ نے اس مملکت کو خدا کی امانت سمجھا ہے اور اس کے اور اس کے رسولؐ کے فرامین کی روشنی میں حکومت کم اور تعمیر انسانیت اور اخلاق و کردار کی اصلاح پر زیادہ زور دیا ہے۔ غیر مسلم رعایا اگر مسلمانوں کے ساتھ رہ رہی ہے تو یقیناً اس پر اسلام کا اثر ہوگا۔ اس نظریے کے پیش نظر حضرت عمرؓ نے انہیں مکمل آزادی اور قانونی تحفظ دینے کے لیے ایسی شرائط وضع کیں کہ جو مستقبل میں اسلام قبول کرنے کا سبب بنیں اور یہی خدا اور رسول کا منشا ہے۔

خطوط:

معاہدات کے علاوہ حضرت عمرؓ نے اپنے کمانڈروں کو خطوط بھی لکھے جن میں انہوں نے ان کو تقویٰ اختیار کرنے اور جنگ سے پہلے دعوت دینے کی تلقین کی ہے اور ہر قسم کے ظلم و تعدی سے باز رہنے کا حکم دیا ہے۔

حضرت عمرؓ نے اپنے فوجی کمانڈروں، عاملوں اور گورنروں کو جو خطوط لکھے ان میں زیادہ زور ان کے اپنے کردار کی تعمیر پر دیا گیا ہے۔ ذیل میں چند خطوط پیش کیے جاتے ہیں:

خلیفۃ المسلمین عمرؓ کا خط سعد بن ابی وقاص فاتح ایران کے نام:

۱۔ مجھے القا ہوا ہے کہ تمہارے مقابلہ میں دشمن کو شکست ہوگی۔ اس لیے شک وشبہ کو دل سے نکال دو اور تقویٰ اور پرہیزگاری اختیار کرو۔
۲۔ اگر تمہارا کوئی شخص کسی عجمی کو اشارے کنایے یا اپنی زبان میں جس کو وہ عجمی سمجھتے تو نہیں لیکن ان کے ہاں وہ امان ہے، امان دے دے، تو تم اسے امان ہی قرار دو۔
۳۔ ہنسی مذاق سے پرہیز کرتے رہو۔

---

[1] المقریزی، ۳۲۲/۱۳

۴۔ دشمن سے کیے گئے وعدوں کو پورا کرو۔ وعدہ کی پابندی غدار کے ساتھ بھی باقی رہتی ہے اور عہد شکنی غلطی سے بھی کی جائے تو اس کا انجام ہلاکت اور تباہی ہوتا ہے۔ عہد شکنی سے تمہاری طاقت کم ہو جائے گی اور دشمن کی قوت میں اضافہ ہوگا اور تمہاری فتح شکست سے بدل جائے گی۔

۵۔ میں تمہیں اس بات سے ڈراتا ہوں کہ تمہارا رویہ اور سلوک ایسا نہ ہو جو مسلمانوں کی جنگ اور توہین کا باعث ہو۔[1]

فوجی کمانڈر سعد بن ابی وقاص کو دوسرا خط:

امیر المومنین حضرت عمرؓ نے اپنے فوجی کمانڈر حضرت سعد بن ابی وقاص کو ایک دوسرا خط بھی لکھا جس میں آپ نے علاوہ دیگر ضروری باتوں کے یہ بھی لکھا:

> ''خدا سے ڈرتے رہو۔ اسی سے مدد مانگو اور فتح کی امید رکھو ایسا نہ ہو کہ اپنی قوت اور طاقت پر فخر کرنے لگو۔ تاہم خدا نے تم سے فتح کا وعدہ کیا ہے اور وہ اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرتا۔ تم سے کوئی ایسا کام نہیں ہونا چاہیے جس سے موجودہ کامیابی اور فتح خطرے میں پڑ جائے اور تمہارے سوا کوئی دوسری قوم اللہ کی اس مہربانی کی مستحق قرار پائے۔''[2]

کس قدر بصیرت افروز اور ایمان کو مضبوط کر دینے والے خطوط ہیں۔ ایسے ہزاروں نہیں تو سینکڑوں خطوط ضرور لکھے ہوں گے جن کی روشنی میں تبلیغی وسفارتی مشنوں کی تکمیل ہوتی رہی۔

آپ نے نہ صرف کمانڈروں کی روانگی کے وقت انہیں تاکید کی بلکہ دوران جنگ بھی بار بار سرداران فوج کو تحریری ہدایتیں بھیجتے رہتے تھے کہ خبردار! بغیر اتمام حجت کے ان پر تلوار مت چلانا۔ اگر وہ سرکشی اور بغاوت پر اتر آئیں تو مجبوراً ان سے جنگ کرنا۔ ان کو اسلامی عقائد، ان کے اصول کھول کر بتانا اور ان کو توحید اور رسالت کی طرف بلانا۔ آپ کی ہدایات پر تمام کمانڈر پورے طور پر عمل کرتے تھے اور اسلام کی تبلیغ واشاعت میں پوری سرگرمی دکھاتے تھے۔

---

۱ تاریخ طبری، ۹۰/۲ (۲۲۳۱،۲۲۳۰)

۲ ایضاً ۹۰/۲ (۲۲۲۹)

تیسرے خلیفہ راشد حضرت عثمان غنیؓ

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت عثمانؓ خلیفہ مقرر ہوئے۔ ان کے نکاح میں نبی کریم ﷺ کی دو صاحبزادیاں تھیں اس لیے انہیں ذوالنورین کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔[1]

حضرت عثمان قریش کی مشہور شاخ بنوامیہ سے تعلق رکھتے تھے۔ بنی امیہ کا خاندان زمانہ جاہلیت سے نہایت معزز اور مقتدر چلا آتا تھا۔ قریش کے قومی نشان کی علم برداری اسی خاندان میں تھی۔[2] حضرت عثمانؓ نہایت دولت مند تھے۔ ان کی دولت سے اسلامی مشن اور مسلمانوں کو بڑا فائدہ پہنچا۔ مدینہ میں میٹھے پانی کا صرف ایک کنواں تھا جو ایک یہودی کی ملکیت تھا۔ حضرت عثمانؓ نے ۸ ہزار درہم میں خرید کر مسلمانوں پر وقف کر دیا۔[3] ہجرت حبشہ میں آپ اہلیہ سمیت شامل تھے۔[4] غزوہ ذات الرقاع میں مدینہ پر آنحضرت ﷺ کی نیابت کا شرف حاصل کیا۔[5]

بیعت رضوان کے وقت حضرت عثمان بحیثیت سفیر مکہ گئے ہوئے تھے۔ چنانچہ (آپ کی شہادت کی خبر پر) صحابہ نے رسول اللہ ﷺ سے بیعت رضوان کی اور رسول اللہ نے فرمایا چونکہ اللہ اور اس کے رسول کے کام کے لیے عثمان گئے ہوئے ہیں اس لیے میں خود ان کی طرف سے بیعت کرتا ہوں یہ فرما کر آپ نے اپنا ایک ہاتھ دوسرے ہاتھ پر رکھا۔[6]

عہد عثمانی میں غیر مسلموں سے تعلقات و معاہدات:

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور کا آغاز ہی غیر مسلموں سے تعلقات کے حوالے سے ایک بہت بڑی آزمائش سے ہوا۔ جس کی تفصیل یہ ہے کہ آپ سے پہلے خلیفہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر ایک غیر مسلم نے قاتلانہ حملہ کیا جس سے خلیفہ سابق جانبر نہ ہو سکے۔ ان کے صاحبزادے حضرت عبداللہ نے غصہ میں آ کر قتل کی سازش میں ملوث تین آدمیوں کو قتل کر دیا جن میں سے ایک مسلمان اور دو غیر مسلم تھے۔ حضرت عبداللہ کو گرفتار کر لیا گیا۔

خلیفہ ثالث حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مسند خلافت پر بیٹھتے ہی سب سے پہلے اس معاملے کے بارے میں صحابہ کرام سے رائے لی تمام صحابہ کی رائے یہ تھی کہ عبیداللہ کو قتل کر دیا جائے۔ لیکن بعد میں خون بہا پر مصلحت ہوگئی اور خون بہا (دیت) کی رقم تینوں مقتولین کے لیے برابر برابر مقرر کر دی گئی۔[7]

---

[1] تاریخ الخلفاء، ص ۱۰۵

[2] ندوی، معین الدین احمد، تاریخ اسلام، مکتبہ رحمانیہ، لاہور، ص ۲۲۸

[3] الاستیعاب، ۲/ ۲۲۸

[4] تاریخ الکامل، ۲/ ۳۰

[5] ایضاً، ص ۴۷

[6] السیوطی، تاریخ الخلفاء، ص ۱۰۷

[7] طبقات ابن سعد، ۵/ ۱۷

آپ کا یہ اقدام اس بات کی دلیل ہے کہ غیر مسلموں کے ساتھ انصاف کا معاملہ کیا گیا۔ ان کی رضامندی پر ہی دیت مقرر ہوئی ورنہ حضرت عبید اللہ کو بدلے میں قتل کر دیا جاتا۔ آپ کے دور میں مسلمانوں اور غیر مسلم اقلیتوں کے خون کی حرمت برابر تھی۔

آپ کے دور کا ایک دوسرا اہم واقعہ بھی غیر مسلموں کے حقوق اور خون کی حرمت کی شاندار مثال کا حامل ہے۔

آپ کے زمانہ خلافت میں کوفہ کے گورنر ولید بن عقبہ کے دربار میں ایک یہودی شعبدہ بازی کے کرتب دکھا رہا تھا۔ حضرت جندب بن کعب ازدی بھی تماشائیوں میں تھے۔ آپ کا شمار کبار تابعین میں ہوتا تھا۔ انہوں نے ان شعبدوں کو شیطانی اثر سمجھا اور یہودی کو قتل کر دیا۔ ولید نے اسی وقت ان (جندب بن کعب) کو گرفتار کر کے قصاص میں قتل کرنے کے لیے جیل بھیج دیا۔ جہاں داروغہ جیل ابوسنان نے ان کو جیل سے بھاگنے میں مدد دیتے ہوئے کہا:

یہاں سے بھاگ جا اللہ تعالیٰ تیرے بارے مجھ سے کچھ نہ پوچھے گا۔

جب ولید نے انہیں قتل کرنے کے لیے طلب کیا تو معلوم ہوا کہ وہ تو بھاگ گئے ہیں۔ ولید نے دروغہ کو نگرانی میں کوتاہی کے جرم میں قتل کر دیا۔[1]

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے قبل دور فاروقی میں اسلامی حکومت کے تمام شعبے بڑے اعلیٰ طریقے سے عمل پیرا تھے۔ حضرت عثمانؓ نے عہد فاروقی کے تمام معاہدات کو برقرار رکھا۔ اگر غیر مسلموں کی طرف سے کوئی شکایت یا عذر موصول ہوا تو حالات کے مطابق اس میں بہتر ترمیم کر دی۔ آپ کی ایک ایسی ہی تحریر درج ذیل ہے:

''عراق میں نجران کے جو باشندے ہیں ان کے اسقف عاقب اور سردار لوگوں نے میرے پاس آ کر مجھ سے شکایت کی ہے اور مجھے وہ شرط دکھائی ہے جو حضرت عمرؓ نے ان کے ساتھ طے کی تھی۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ مسلمانوں سے ان لوگوں کو کیا کیا نقصانات پہنچے ہیں۔ میں نے ان کے جزیہ میں سے تیس جوڑوں کی تخفیف کر دی ہے۔ انہیں میں نے اللہ کی راہ میں بخش دیا ہے اور میں نے ہر وہ زمین ان کو دے دی ہے جو عمرؓ نے ان کی یمنی زمین کے عوض صدقہ کی تھی اب تم ان کے ساتھ بھلائی کرنے کی ہدایت حاصل کرو کیونکہ یہ ایسے لوگ ہیں جنہیں ذمہ حاصل ہے۔''[2]

عہد عثمانی میں ہونے والا معاہدہ غیر مسلموں سے حسن سلوک کا بہترین ثبوت ہے۔ یہ معاہدہ سعد بن ابی سرح اور اہل نوبہ کے رئیس اور وہاں کے تمام باشندوں کے ساتھ قرار پایا۔ اس کی اہم شقیں درج ذیل ہیں:

''عبداللہ سعد بن ابی سرح نے اہل نوبہ سے ایک لڑائی کے بعد انہیں امان دے دی ہے اس معاہدہ میں ہماری طرف سے 'صعید مصر' کے مسلمان، وہاں کے ذمی اور مصر کے دوسرے خطوں کے مقیم مسلمان یا نو مسلم اور ذمی بھی شامل ہوں گے۔

---

[1] بیہقی، ابوبکر احمد بن حسین، السنن الکبریٰ، مکتبہ دار اصادر، مکہ مکرمہ، سعودی عرب ۱۴۱۲ھ، ۱۳۶/۸
[2] صدیقی، نجات اللہ، اسلام کا نظام محاصل، مکتبہ چراغ راہ، کراچی، ۱۹۶۶ء، ص ۲۷۶

اے اہل نوبہ!

اب سے تم اللہ اور اس کے رسول محمد ﷺ کی پناہ میں ہو بایں معنی کہ:

(الف) نہ ہم تمہارے ساتھ لڑائی کریں گے

(ب) اور نہ تمہیں مرعوب کرنے کے لیے لشکر لائیں گے۔

معاہدہ کا اختتام ان الفاظ پر ہوتا ہے:

ہم پابند ہیں خدا کے حکم اور اس کے میثاق اور اس کی پناہ کے اور پابند ہیں ہم اس کے رسول محمد ﷺ کی پناہ کے۔ اسی طرح تم پابند ہو اپنے دین کے مطابق حضرت مسیح، ان کے حواریوں اور اپنے اکابر اہل دین اور ملت کے احکام کے **اللّٰہ الشاھد بیننا و بینکم علی ذلک**۔ اس معاہدہ پر فریقین کے درمیان خدا شاہد ہے۔[1]

یہ معاہدہ عہد عثمانی میں غیر مسلموں کی مذہبی آزادی کی ایک اعلیٰ مثال ہے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے دور حکومت میں گورنروں، سرحدی کمانڈروں اور خراج افسروں کے نام جو خطوط لکھے ہیں ان میں بھی غیر مسلموں سے حسن سلوک کے احکامات جاری کیے گئے ہیں۔

<u>**گورنروں کے نام احکامات:**</u>

واضح ہو کہ خدا نے حکام اعلیٰ کو اس بات کی تاکید کی ہے کہ رعایا کی دیکھ بھال کریں اور اس بات کی تاکید نہیں کی کہ رعایا سے ٹیکس وصول کریں۔ مسلمانوں کے اولین حاکم قوم کے خادم تھے ٹیکس وصول کرنے والے نہیں تھے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے حکام اعلیٰ خدمت رعایا کے صحیح منصب سے ہٹ کر ٹیکس وخراج وصول کرنے کی تگ ودو میں لگ جائیں گے۔ اگر ایسا ہوا تو حیا ایمانداری اور ایفائے عہد سب رخصت ہو جائیں گے۔ یاد رکھیے سب سے زیادہ صحیح طرز عمل یہ ہے کہ آپ مسلمانوں کے مفاد اور معاملات سے دلچسپی لیں۔ اسلام کے دیے ہوئے حقوق سے ان کو بہرہ ور کریں اور اسلام کے جو حقوق ان پر ہیں وہ ان سے وصول کریں۔

مسلمانوں کے بعد ذمیوں کے جو حقوق ہیں وہ ان کو دیجیے اور ان کے ذمے آپ کے جو حقوق ہیں وہ ان سے لیجیے۔ ذمیوں کے بعد دشمن سے آپ کا طرز عمل درست ہونا چاہیے۔ ایمانداری اور وفائے عہد کے ذریعہ ان پر فتح حاصل کیجیے۔[2]

<u>**سرحدی کمانڈروں کے نام احکامات:**</u>

واضح ہو کہ آپ مسلمانوں کے نگہبان اور محافظ ہیں۔ عمرؓ نے آپ کے لیے جو ضابطہ سیرت مقرر کیا تھا اس سے ہم واقف ہیں بلکہ ہمارے مشورے سے اس کو مقرر کیا گیا تھا۔ خیال رکھیے کہ آپ کی کسی بدعنوانی کی شکایت میرے سامنے نہ آئے اگر ایسا ہوا تو

---

[1] سیاسی وثیقہ جات، ص ۳۲۱، ۳۲۲

[2] تاریخ طبری، ۴۴/۵

آپ کا منصب چھن جائے گا اور آپ سے بہتر لوگوں کو آپ کی جگہ مقرر کیا جائے گا۔ اپنی سیرت پر نظر احتساب رکھیے، مجھ پر جو بحیثیت خلیفہ ذمہ داریاں ہیں میں ان کو ضرور انجام دوں گا۔[1]

اس خط کی ہدایات مسلموں اور غیر مسلموں دونوں کے حوالے سے عام ہیں۔

خراج افسروں کے نام احکامات:

واضح ہو کہ خدا نے مخلوق کو حق اور انصاف کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ اس لیے وہ بس حق و انصاف ہی قبول کر سکتا ہے۔ لہٰذا جب آپ خراج وصول کریں تو حق و انصاف سے کام لیں اور جب دوسروں کے حقوق ادا کریں تو حق اور انصاف سے ادا کریں۔ میری طرف سے دیانتداری کی سخت تاکید ہے اس پر ثابت قدمی سے قائم رہیے۔ ایسا نہ ہو کہ دیانت کا دامن سب سے پہلے آپ ہی کے ہاتھ سے چھوٹے اور اگلی نسلوں کی بددیانتیوں میں آپ کو بھی شریک کیا جائے۔ امانت و دیانت کے ساتھ ضروری ہے کہ آپ اپنے عہد و پیماں پر بھی قائم رہیں۔ کسی یتیم کا حق نہ ماریے اور نہ کسی معاہد کے ساتھ زیادتی کیجیے کیونکہ ان کے ساتھ زیادتی کرنے والے سے خدا مواخذہ کرے گا۔[2]

مذکورہ تینوں خطوط میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے غیر مسلموں کے تمام حقوق کی ادائیگی اور ہر قسم کی زیادتی سے باز رہنے کی تلقین کی ہے اور آخرت سے ڈراتے ہوئے ان سے حسن سلوک اور تمام معاہدوں کی پابندی کرانے کی تاکید فرمائی ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ عہد عثمانی میں حکومتی سطح پر غیر مسلموں کے حقوق کا مکمل تحفظ کیا گیا تھا۔

---

۱ تاریخ طبری، ۴۴/۵

۲ ایضاً

چوتھے خلیفہ راشد حضرت علی رضی اللہ عنہ

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ چوتھے خلیفہ مقرر ہوئے۔ آپ رسول کریم ﷺ کے چچازاد بھائی تھے۔ آپ کے خاندان بنی ہاشم کو کعبہ کی تولیت کی وجہ سے سارے عرب میں مذہبی سیادت حاصل تھی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے آغوش نبوت میں پرورش پائی۔ آپ حضور ﷺ کے منظور نظر رہے۔

رسول اللہ ﷺ نے اپنی بیٹی فاطمہؓ کا نکاح حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کردیا تھا۔[1] آپ اکثر وحی الٰہی کی کتابت کیا کرتے تھے اور جب حضور ﷺ معاہدہ کرتے تو وہ عہد نامے بھی حضرت علیؓ ہی لکھتے تھے اور ایسے ہی صلح ناموں کی کتابت بھی آپ کرتے تھے۔[2]

آپ فاتح خیبر ہیں۔ غزوہ خیبر میں آپ ﷺ نے پہلے ابوبکر صدیق اور پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو جھنڈا دے کر بھیجا مگر فتح نہ ہوسکی۔ اس کے بعد نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''کل میں ایسے شخص کو جھنڈا عطا کروں گا جس کے ہاتھ پر فتح ہوگی، جو اللہ اور اس کے رسول سے محبت رکھتا ہے۔'' اللہ تعالیٰ نے حضرت علیؓ کو فتح نصیب کی۔[3]

سنہ ۹ھ میں نبی کریم ﷺ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو امیر الحج بنا کر بھیجا تو ان کے ساتھ سورہ التوبہ کی چالیس آیات جن میں مشرکین سے براءت کا اظہار کیا گیا ہے۔ ان آیات کے اعلان کرنے کے لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھیجا۔ اس موقعہ پر حضرت ابوبکرؓ کے عرض کرنے پر حضور ﷺ نے فرمایا کہ ''یا تو میں یہ اعلان کرتا یا میرے اہل بیت میں سے کوئی شخص کرتا اس لیے میں علی کو بھیج رہا ہوں۔''[4]

نبی کریم ﷺ کے اس بیان سے حضرت علیؓ کی انتہائی قربت اور مقام کا اندازہ ہوتا ہے۔ پہلے تینوں خلفائے راشدین کے دور میں حضرت علیؓ بطور مشیر شامل رہے۔ تینوں خلفاء ہر وقت حضرت علیؓ کی اشد ضرورت محسوس کرتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تو صاف طور پر فرمایا تھا:

لولا علی لهلک عمر

''اگر علی نہ ہوتے تو عمر ہلاک ہوجاتا۔''[5]

۱۔ تاریخ الخلفاء، ص ۱۱۹

۲۔ البیہقی، ۹۴/۲۰

۳۔ سیرت ابن ہشام، ۳۳۱/۲

۴۔ ابن قیم، زاد المعاد، القاہرہ، مطبع السنۃ المحمدیہ ۱۳۷۴ھ، ۹۴/۱، ۹۵

۵۔ الیعقوبی، احمد بن ابی یعقوب، تاریخ الیعقوبی، بیروت، مطبع دار البیروت ۱۹۶۰ء، ۱۵۴/۲

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا دور حکومت اندرونی خلفشار کا شکار رہا۔ آپ نے انتہائی کوشش کی کہ کس طرح جھگڑے ختم ہو جائیں اور قضیے مٹ جائیں تاکہ اس کے بعد وہ اندرونی اصلاح اور بیرونی استحکام کی طرف پوری توجہ مبذول کر سکیں اور اس کے نتیجے میں ایک مثالی حکومت دنیا کے سامنے پیش کر سکیں مگر ایسا نہ ہوسکا۔

عہد علوی میں غیر مسلموں سے تعلقات و معاہدات:

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں غیر مسلموں سے کوئی نیا معاہدہ نہیں ہوا۔ البتہ پہلی حکومتوں کے معاہدات کی پابندی کرنے کے ساتھ غیر مسلم رعایا کے ساتھ مکمل عدل وانصاف اور حسن سلوک کی اعلیٰ روایت کو جاری رکھا گیا۔

ذمیوں سے حسن سلوک

حضرت علی رضی اللہ عنہ ذمیوں کے حقوق کا خاص لحاظ رکھتے تھے۔ عمال کو ان کے ساتھ نرمی اور حسن سلوک کی ہدایت فرماتے تھے۔ آپ کے دور میں ذمیوں کو ایک عامل عمرو بن مسلم کی درشت مزاجی کی شکایت تھی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس کو لکھا:

> ''مجھے معلوم ہوا ہے کہ تمہارے علاقہ کے ذمی دہقانوں کو تمہاری درشت مزاجی کی شکایت ہے۔ اس میں کوئی بھلائی نہیں ہے تم کو سختی اور نرمی دونوں سے کام لینا چاہیے۔ لیکن سختی ظلم کی حد تک نہ پہنچ جائے اور نرمی نقصان کی حد تک، ان پر جو مطالبہ ہوا سے وصول کیا کرو، لیکن ان کے خون سے اپنا دامن محفوظ رکھو۔''[1]
>
> ذمیوں کے معاشی حقوق کا اس قدر پاس کرتے تھے کہ ایک عامل قرظہ بن کعب انصاری کو لکھا:
>
> ''تمہارے علاقے کے ذمیوں نے درخواست دی ہے کہ ان کی ایک نہر پٹ کر مٹ گئی ہے۔ جس کا بنانا مسلمانوں کا فرض ہے تم اسے دیکھ کر درست کرا کے آباد کر دو۔ میری عمر کی قسم مجھے اس کا آباد رہنا زیادہ پسند ہے بہ نسبت اس کے کہ وہ ملک سے نکل جائیں یا عاجز ودرماندہ ہو جائیں یا ملک کی بھلائی میں حصہ لینے کے قابل نہ رہیں۔''[2]

اہل عجم سے حضرت علیؓ کی محبت اور لطف وکرم کا برتاؤ اس قدر اعلیٰ تھا کہ وہ کہتے تھے کہ اس عربی نے نوشیرواں کی یاد تازہ کر دی ہے۔

عدل ومساوات:

آپ کے دور میں ایوان عدل میں امیر وغریب بلا امتیاز مذہب سب برابر تھے۔ اگر آپ خود کسی مقدمہ میں فریق ہوتے تو آپ کو بھی عدالت میں حاضر ہونا پڑتا تھا اور عدالت اس قدر آزاد تھی کہ عدالتی تقاضوں کی عدم فراہمی پر خلیفہ تک کے خلاف بے باک فیصلہ دے دیتی تھی۔ ایک مرتبہ حضرت علیؓ کی زرہ گر پڑی اور ایک نصرانی کے ہاتھ لگی۔ حضرت علیؓ نے اسے دیکھ کر پہچانا اور قاضی

---

[1] تاریخ یعقوبی، ۲۳۹/۲

[2] ایضاً ص ۲۳

شریح کی عدالت میں دعویٰ کیا۔ نصرانی کا دعویٰ تھا کہ وہ زرہ اس کی ہے۔ قاضی نے حضرت علیؓ سے پوچھا آپ کے پاس کوئی ثبوت ہے۔ آپ نے فرمایا نہیں، قاضی شریح نے نصرانی کے حق میں فیصلہ دیا۔ وہ غیر مسلم اس انصاف پر بول اٹھا کہ یہ تو انبیاء جیسا انصاف ہے۔[1]

آپ کے پاس ایک مقدمہ آیا جس میں قاتل مسلمان تھا اور مقتول غیر مسلم تھا۔ آپ نے قاتل کو مقتول کے وارثوں کے سپرد کر دینے کا حکم دیا۔ مقتول کے وارثوں نے دیت لے کر چھوڑ دینا چاہا تو دیت دلا دی جو مسلمان کی دیت کے برابر تھی۔ اور فرمایا من کان له ذمتنا فدمه کدمنا و دیته کدیتنا[2] یعنی جو غیر مسلم ہماری ذمہ داری میں ہے۔ اس کا خون ہمارے خون جیسا ہے اور اس کی دیت بھی ہماری یعنی مسلمانوں کی دیت کے برابر ہے۔

حضرت علیؓ کے دور کے مذکورہ اقدام غیر مسلموں سے حسن سلوک کی اعلیٰ مثال ہیں۔

خلافت راشدہ میں معاہدات کی پابندی، امن پسندی رواداری اور غیر مسلموں کا طرز عمل:

مذکورہ بحث سے ثابت ہوتا ہے کہ خلافت راشدہ کے دور میں مسلمانوں نے عہد نبوی میں غیر مسلموں سے کیے گئے معاہدات اور حسن سلوک کی روایت کو برقرار رکھنے کے ساتھ ساتھ اپنے دور حکومت میں کیے گئے تمام معاہدوں کو نبھایا اور حسن سلوک اور رواداری کی اعلیٰ مثالیں قائم کی ہیں۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے دور میں ذمیوں کے حقوق کو نہ صرف قائم رکھا گیا بلکہ ان کی حفاظت کا بھی انتظام کیا گیا۔ ان کی ذمی رعایا کو وہی حقوق حاصل تھے جو مسلمانوں کو حاصل تھے۔ ان کی حفاظت کے لیے ان سے حاصل شدہ جزیہ کی رقم کا بے جا استعمال نہیں کیا جاتا تھا جزیہ کے علاوہ کسی قسم کے سیاسی عدایا یا تحائف تک لینے سے احتراز کیا گیا۔

حضرت خالد بن ولید نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کو جب فتح حیرہ کی خبر بھیجی تو ساتھ کچھ تحائف اور عدایا بھی بھیجے۔ لیکن حضرت ابوبکر صدیقؓ نے ان تحائف کو اہل حیرہ کے جزیہ میں شمار کر کے اتنی رقم وضع کر دی اور حضرت خالد کو لکھا کہ جزیہ کی باقی رقم کی وصولیاں بھی کریں اور اس کو بھی اہل حیرہ کی طرف سے عدایا ہی سمجھ لیں۔

عام طور پر مفتوحہ علاقوں کا مال و اسباب ’مال مفت دل بے رحم‘ کے زمرے میں لایا جاتا ہے۔ لیکن حضرت ابوبکر صدیقؓ کا تقویٰ ایمانداری اور رواداری دیکھیے کہ غیر مسلموں پر کسی بھی قسم کا بوجھ معاہدات کی خلاف ورزی سمجھتے ہوئے عدایا کی رقم بھی جزیہ کی رقم میں شامل سمجھنے کی ہدایت کی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں غیر مسلموں سے کیے تمام معاہدات آپ سے پہلے ابوبکرؓ اور رسول کریم ﷺ کے دور میں کیے گئے تمام معاہدات اور صلح کی تمام شرائط پر بخوبی عمل کرنے کے ساتھ ساتھ غیر مسلموں سے رواداری کی غیر معمولی مثالیں پیش کی گئیں۔

---

[1] تاریخ الکامل، ۲/ ۱۶۳

[2] بیہقی، السنن الکبریٰ، ۸/ ۳۴

دور فاروقی میں اسلام کثرت سے پھیلا اور اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی تربیت اور ارشاد سے تمام مسلمانوں کو اسلام کا اصلی اور حقیقی نمونہ بنا دیا تھا۔ اسلامی فوجیں جس ملک میں بھی جاتی تھیں وہاں کے لوگوں کو خواہ مخواہ ان کے دیکھنے اور ان سے ملنے کا شوق پیدا ہوتا تھا۔ کیونکہ چند بادیہ نشینوں کا دنیا کی تسخیر کے لیے اٹھنا (اور پھر تسخیر کر بھی لینا) حیرت واستعجاب سے خالی نہ تھا۔ اس طرح جب لوگوں کو ان سے ملنے جلنے اور ان کو دیکھنے کا اتفاق ہوتا تھا تو ایک ایک مسلمان سچائی، سادگی، پاکیزگی، ہمدردی اور احترام انسانیت کا پیکر نظر آتا تھا اور ان کے یہ خصائل لوگوں کی روحوں اور دلوں کو اپنی طرف کھینچتے تھے جس سے ان کے اندر اسلام نہایت سرعت سے پھیلتا جاتا تھا۔

رومیوں کا ایک سفیر جس کا نام جارج تھا حضرت ابوعبیدہ کے لشکر میں گیا اور وہاں اس نے لوگوں کو نماز پڑھتے دیکھا تو وہ اس نظارہ سے اس قدر متاثر ہوا کہ اپنی قوم اور خاندان سے الگ ہو کر مسلمان ہو گیا۔ اسی طرح شطا کے متعلق جو مصر کا ایک بڑا رئیس تھا مقریزی نے لکھا ہے:

فخرج شطا فی الفین من اصحابه و لحق بالمسلمین ......[1]

''شطا اپنے دو ہزار ساتھیوں کے ساتھ آ کر مسلمان ہو گیا۔ اس سے قبل وہ اہل اسلام کی پاکیزہ سیرت کے واقعات لوگوں سے سن کر گرویدہ ہو چکا تھا۔''

عہد عثمانی میں غیر مسلموں سے حسن سلوک اور رواداری کے ساتھ ساتھ سابقہ معاہدات اور ان کے ابتدائی دور میں ہونے والے معاہدہ اور شرائط صلح پر کما حقہ عمل کیا گیا۔ غیر مسلموں سے حسن سلوک کے لیے ان کے کمانڈروں اور خراج وصول کرنے والوں کے ہدایات جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے غیر مسلم اقوام سے حسن سلوک کی عمدہ مثالیں ہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور میں اندرونی جھگڑوں کی بنا پر فتوحات تو نہ ہو سکیں البتہ ان کے دور میں بھی غیر مسلموں سے کیے گئے سابقہ معاہدات اور شرائط صلح پر سختی سے عمل درآمد کیا گیا۔ ذمیوں کے معاشی حقوق کے تحفظ کے لیے نہر کی صفائی اور عدل و انصاف میں ان کو مسلمانوں کے برابر سمجھنا اور ان پر کوئی بھی دباؤ نہ ڈالنا ان کے دور کی نمایاں خوبیاں ہیں۔

غیر مسلموں کا طرز عمل:

عہد خلافت راشدہ میں ماتحت غیر مسلموں کا رویہ مجموعی طور پر مسلمانوں کے لیے اچھا ہی رہا۔ مسلمانوں کے باہمی خلفشار اور لڑائیوں میں اور دور صدیقی کے مختلف فتنوں میں ان لوگوں نے غیر جانبداری کا ثبوت دیا لیکن مسلمانوں کے کمال درجہ فراخی، مروت اور ہمدردی کے جذبات کو بعض اوقات ٹھیس بھی پہنچائی گئی لیکن مسلمانوں نے ان کے خلاف جو مجبوراً اقدامات کیے وہ بھی انسانی ہمدردی اور عمدہ اخلاق کی بہترین مثالیں ہیں۔

شام کی آخری سرحد پر ایک شہر تھا جس کا نام عربسوس تھا اور جس کی دوسری سرحد ایشیائے کوچک سے ملی ہوئی تھی۔ شام جب فتح ہوا تو یہ شہر بھی فتح ہوا اور صلح کا معاہدہ ہو گیا۔ لیکن یہاں کے لوگ درپردہ رومیوں سے سازش رکھتے تھے اور ادھر کی خبریں ان

---

[1] الخطط المقریزیہ، ۱/۲۲۶

کو پہنچاتے رہتے تھے۔ عمیر بن سعدؓ وہاں کے حاکم نے حضرت عمرؓ کو اس چیز کی اطلاع دی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کی اس کمینہ خصلت کا جو انتقام لیا تھا وہ یہ تھا کہ عمیر بن سعد کو لکھ بھیجا کہ جس قدر ان کی جائداد زمین مویشی اور اسباب ہے سب شمار کر کے ایک ایک چیز کی دو چند قیمت دے دو اور ان سے کہو کہ وہ اور کہیں چلے جائیں۔ اگر اس پر بھی راضی نہ ہوں تو ان کو ایک برس کی مہلت دو اور اس کے بعد جلاوطن کر دو۔ چنانچہ جب وہ اپنی شرارت سے باز نہ آئے تو اس حکم کی تعمیل کی گئی۔[1]

اپنے ماتحت لوگوں کو اس قدر گھناؤنے جرم کی ایسی انوکھی سزا شاید ہی کوئی قوم روا رکھتی ہو۔ یہودی قوم کبھی بھی مسلمانوں کی طرف سے صاف نہیں ہوئی۔ فتح خیبر پر ان لوگوں کو ان کی درخواست پر مقررہ شرائط کے تحت نبی کریمؐ نے خیبر میں رہنے کی اجازت دی تھی مگر یہ لوگ اس ہمدردی اور فراخ دلی کے باوجود جو تاریخ میں کبھی کسی فاتح نے دشمنوں سے نہیں دکھائی، ہمیشہ شرارتیں کرتے رہے۔ حضرت عمرؓ کے دور میں اس کی شرارتیں اس قدر بڑھ گئیں کہ انہوں نے عبداللہ بن عمر کو ایک دفعہ بالاخانہ سے دھکیل دیا جس سے ان کے ہاتھ میں زخم آیا۔ مجبوراً حضرت عمرؓ نے عام مجمع میں کھڑے ہو کر ان کی شرارتیں بیان کیں اور پھر نبی کریم ﷺ کی اس حدیث پر عمل کرتے ہوئے ان کو عرب سے نکال دیا۔

لاخرجن الیهود و النصاری من جزیرة العرب۔[2]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ایک مرتبہ مغیرہ بن شعبہ کے پارسی غلام ابولولو نے شکایت کی کہ اس کے آقا اس سے بھاری ٹیکس وصول کرتے ہیں اور اسے کم کرانے کی درخواست کی۔ آپ نے اس سے پوچھا کتنا محصول لیتے ہیں۔ ابولولو نے کہا دو درہم روزانہ۔ پوچھا تم کام کیا کرتے ہو۔ اس نے کہا آہن گری، نجاری اور نقاشی۔ آپ نے فرمایا ان پیشوں کے مقابلہ میں یہ رقم زیادہ نہیں ہے اس فیصلہ پر وہ ناراض ہو کر چلا گیا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کا موڈ ٹھیک کرنے کے لیے فرمایا کہ مجھے بھی ایک چکی بنا دیں۔ تو اس نے جواب دیا کہ ''آپ کے لیے ایسی چکی بناؤں گا کہ اس کی آواز اہل مشرق و مغرب سنیں گے۔ یعنی دنیا دیکھے گی۔ یہ ایک کھلی دھمکی تھی۔ خلیفہ وقت اگر چاہتے تو اسے گرفتار کرا سکتے تھے اور اگر کوئی دنیادار بادشاہ ہوتا تو ایسے غلام کی جان لے لیتا۔ مگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کے خلاف فراخ دلی اور انتہائی انصاف پسندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کوئی ایکشن نہ لیا۔ اس مروت اور نیکی کی سزا ابولولو نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر قاتلانہ حملہ کر کے دی، جس کے نتیجہ میں خلیفہ دوم حضرت عمر رضی اللہ عنہ شہید ہو گئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک غیر مسلم کے ہاتھوں زخم کھانے کے باوجود اپنی زندگی کے آخری لمحات میں بھی ان کے حقوق کی نگہداشت کے لیے وصیت فرمائی۔

اوصی الخلیفة من بعدی بذمة اللہ و ذمة رسولہ ﷺ ان یوفی لھم بعھدھم و ان یقاتل من ورائھم و ان لا یکلفوا فوق طاقتھم۔[3]

---

[1] فتوح البلدان، ص ۱۵۷

[2] سنن ابی داؤد کتاب الخراج، باب فی اخراج الیھود من جزیرة العرب (۳۰۳۰) الکتب الستة، ص ۱۴۵۱

[3] طبقات ابن سعد، ۳/۳۳۹

"میں اپنے بعد والے خلیفہ کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے ذمہ میں آنے والوں (اقلیتوں) کے بارے میں یہ وصیت کرتا ہوں کہ وہ ان سے کیے ہوئے وعدے پورے کرے اور ان کی حفاظت کے لیے لڑے اور ان کو ان کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہ دے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی یہ وصیت ان کی عدل پسندی اور اعلیٰ ظرفی کی اعلیٰ مثال ہے۔

فصل دوم

قرن اول کے اموی حکمران اور غیر مسلموں سے تعلقات و معاہدات

عہد نبوی اور خلفاء راشدین تو اس حیثیت سے مثالی دور تھا کہ اس دور میں معاہدات کی مکمل پاسداری کی جاتی تھی اور غیر مسلموں سے تعلقات میں مکمل اسلامی رواداری اور عدل وانصاف کی راہ کو اپنایا گیا۔ اس کے بعد جب اسلامی حکومت نے ملوکیت کی راہ اختیار کر لی تو اس وقت بھی بڑی حد تک فوجی اور بین الاقوامی معاملات میں معاہدات کی پابندی اور غیر مسلموں سے اچھے تعلقات کی روایت برقرار رکھی گئی۔ البتہ سنہ ۶۴ ہجری تا ۷۳ ہجری جب عالم اسلام میں بیک وقت عبداللہ بن زبیر اور مروان بن حکم اور مروان کے انتقال کے بعد عبدالملک بن مروان کی حکومت تھی تو کچھ مہم جو اشخاص نے عربی عجمی کشمکش کو ہوا دے کر اپنے سیاسی مقاصد حاصل کرنے کی کوشش کی اور اس طرح ان حضرات سے چند ایسے نامناسب افعال بھی سرزد ہوئے جو اسلامی تعلیمات کے خلاف ہیں۔ البتہ اس دوران بھی اہل حق علماء اور فقہاء نے انہیں ان غیر اسلامی رویوں سے باز رکھنے کی بھرپور کوشش کی جو اس بات کا ثبوت ہے کہ مذکورہ رویہ ان لوگوں کا اپنا رویہ تھا مذہب اور اخلاق سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا۔ البتہ عمر بن عبدالعزیز کے دور کو مکمل اسلامی اور خلفائے راشدین کے دور کی مکمل تصویر کہا جا سکتا ہے۔

ذیل میں قرون اول میں شامل حکمرانوں کا مختصر تعارف اور ان کے دور میں غیر مسلموں سے تعلقات و معاہدات کا ایک تحقیقی مطالعہ پیش کیا جاتا ہے۔

معاویہ بن ابی سفیان (۴۱ھ تا ۶۴ھ)

پہلے اموی حکمران معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما ہیں۔ ان کا نسب پانچویں پشت میں عبد مناف پر رسول اللہ ﷺ سے مل جاتا ہے۔ ظہور اسلام کے زمانہ میں امیر معاویہؓ کے والد ابوسفیان سپہ سالاری کے عہدہ پر تھے۔ فتح مکہ کے موقعہ پر اپنے والد کے ساتھ مسلمان ہونے کی سعادت سے ہم کنار ہوئے۔ امیر معاویہ کو کتابت وحی کی خدمت کا شرف حاصل ہے۔ امیر معاویہ کے کارناموں کے حوالے سے بلاذری لکھتے ہیں ان کے کارناموں کا آغاز عہد صدیقی سے ہوتا ہے شام کی فوج کشی میں ان کا پورا گھرانہ شریک تھا۔ ان کے بھائی یزید بن ابی سفیان فوج کے ایک حصے کے افسر تھے، ان کے ساتھ امیر معاویہ کو بھی کارنامے دکھانے کا موقع ملا اور بعض موقع پر انہوں نے فوج کی قیادت کے فرائض بھی انجام دیے[1]

حیرا، عرقہ اور بیروت وغیرہ شام کے ساحلی علاقوں کی مہم میں یزید کی ماتحتی میں مقدمۃ الجیش کی کمان معاویہ کے ہاتھوں میں تھی۔ عرقہ تمام تر انہی کی کوششوں سے فتح ہوا۔[2]

ساحلی علاقوں کے بہت سے قلعے فتح کرنے کا سہرا بھی امیر معاویہ ہی کے سر ہے۔

طبری لکھتے ہیں:

ساحلی علاقہ کے بہت سے قلعے فتح کیے قیساریہ کا معرکہ جس میں اسی ہزار رومی مارے گئے تھے انہی نے سر کیا تھا۔[3]

اسلامی حکومت کے سرحدی علاقوں کو رومیوں کے حملوں سے محفوظ بنانا امیر معاویہ کا ایک بڑا کارنامہ ہے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے امیر معاویہ کو اپنے دور حکومت میں پورے شام کا والی بنا دیا تھا اس دور میں ان کے کارناموں سے متعلق بلاذری لکھتے ہیں کہ اپنے دور امارت میں امیر معاویہؓ نے شام کے تمام سرحدی علاقوں کو فتح کر کے ان کو رومیوں کے حملہ سے محفوظ کر دیا۔ طرابلس الشام انہی کے دور میں فتح ہوا۔ عموریہ پر فوج کشی ہوئی ملطیہ پر قبضہ ہوا۔ حضرت عثمانؓ کی اجازت سے بحری بیڑا قائم کر کے جزیرہ قبرص فتح کیا یہ بیڑا اس دور کے عظیم الشان بیڑوں میں تھا، پہلے رومیوں کے بحری حملوں کا مسلمانوں کے پاس کوئی جواب نہ تھا اس بیڑے سے مسلمانوں کی بحری طاقت بھی مضبوط ہو گئی۔[4]

عہد امیر معاویہ اور غیر مسلموں سے تعلقات و معاہدات:

امیر معاویہ نے اپنے دور حکومت میں ذمیوں کے حقوق کی حفاظت اور ان سے کیے گئے معاہدات کی پاسداری کا بڑا لحاظ رکھا اور ان سے روابط میں رواداری کا اعلیٰ مظاہرہ کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں یوحنا کے گرجے کے پاس مسجد تعمیر ہوئی

---

[1] فتوح البلدان، ص ۱۲۳

[2] محولہ بالا

[3] تاریخ طبری، ص ۲۳۹۷

[4] فتوح البلدان، ص ۱۶۰

تھی امیر معاویہ نے گرجے کو بھی اس میں شامل کر لینا چاہا، لیکن عیسائی اس پر راضی نہ ہوئے اس لیے یہ خیال ترک کر دیا۔[۱]

حضرت امیر معاویہ کا عیسائیوں کی اجازت کے بغیر اپنے مذکورہ ارادہ سے باز رہنا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ غیر مسلموں سے کیے گئے معاہدات کی پاسداری کرتے تھے اور کوئی بھی ترمیم ان کی دلی اجازت کے بغیر روا نہ رکھتے تھے۔ ان کے دور حکومت میں عقبہ بن نافع فہری نے جو مصر کے گورنر تھے اپنی ضرورت کے لیے ایک پرتی زمین امیر معاویہ کی اجازت سے منتخب کی ان کے ذکر کرتے کہا کوئی عمدہ قطعہ پسند کیجیے تو عقبہ نے کہا ایسا نہیں ہو سکتا ذمیوں سے جو معاہدہ ہو چکا ہے اس کی ایک شرط یہ بھی ہے کہ ان کی زمین ان کے قبضہ سے نہ نکالی جائے گی۔[۲]

ذمہ دار عہدوں پر غیر مسلموں کا تقرر:

امیر معاویہ نے اپنے دور حکومت میں غیر مسلموں کے حقوق کی مکمل پاسداری کرنے کے ساتھ ساتھ ان سے اعلیٰ درجہ کی رواداری دکھاتے ہوئے ان کو کار حکومت کے اہم عہدوں پر بھی فائز کیا۔ یعقوبی کے مطابق:

فوج میں تو غیر مسلم حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ ہی سے بھرتی کر لیے جاتے تھے لیکن اس زمانہ میں انہوں نے اعتماد پیدا نہ کیا، اس لیے ذمہ داری کے عہدوں پر ان کا تقرر نہ ہوتا تھا، امیر معاویہ نے اپنے زمانہ میں متعدد غیر مسلموں کو ذمہ دار عہدوں پر مامور کیا، چنانچہ ابن آثال نصرانی کو حمص کا کلکٹر مقرر کیا۔[۳]

طبری کے مطابق:

(امیر معاویہ نے) سرجون بن منصور رومی کو کاتب (پرائیویٹ سیکرٹری) بنایا۔[۴]

امیر معاویہؓ صحابی رسول کا یہ اقدام غیر مسلموں سے رواداری اور ان کی صلاحیتوں سے کام لینے کے حوالے سے ایک عمدہ مثال ہے جسے جب کوئی فتنہ کا اندیشہ نہ ہو اپنا کر مسلمانوں اور غیر مسلموں میں اچھے تعلقات قائم رکھنے کے لیے اپنایا جا سکتا ہے۔

مذہبی آزادی:

امیر معاویہ کے دور حکومت میں غیر مسلموں کو مکمل آزادی حاصل تھی۔ قسطنطنیہ کی مہم میں جب حضرت ابوایوب انصاری مرض الموت میں مبتلا ہو گئے تو یزید بن معاویہ نے ان سے پوچھا اگر کوئی وصیت ہو تو فرمایئے پوری کی جائے گی۔ انہوں نے فرمایا جہاں تک ہو سکے دشمن کی سرزمین میں لے جا کر مجھے دفن کرنا۔ چنانچہ ان کے انتقال کے بعد ان کی نعش قسطنطنیہ کی فصیل کے نیچے لے جا کر دفن کر دی گئی۔[۵]

۱۔ بلاذری، ص ۳۳۱

۲۔ الخطط المقریزیہ ۲۰۸/۱

۳۔ تاریخ یعقوبی، ۲۶۵/۲

۴۔ تاریخ طبری، ۲۸۲/۲

۵۔ تاریخ ابن اثیر، ۱۸۲/۳

مسلمان چونکہ اپنے تمام علاقوں میں غیر مسلموں کو مذہبی آزادی دیے ہوئے تھے اس لیے دفن کے بعد بڑے پر اعتماد لہجے میں رومیوں سے ہم کلام ہوئے: ''اگر تم نے لاش کی کوئی بے حرمتی کی تو پھر اسلامی سلطنت کے حدود میں کبھی ناقوس نہ بج سکے گا۔''[1]

اس کا مطلب یہ ہے کہ رومی اسلامی سلطنت کے حدود میں مکمل آزادی رکھتے تھے۔ اسی لیے انہوں نے اپنی یہ آزادی برقرار رکھنے کے لیے حضرت ابوایوب انصاری کی قبر کو کوئی نقصان نہ پہنچایا۔

---

[1] الاستیعاب ۱۳۸/۲

یزید اول بن معاویہ (۶۰ھ تا ۶۴ھ)

امیر معاویہ کے بعد ان کا لڑکا یزید اول تخت نشین ہوا۔ یزید کی پیدائش امیر معاویہ کے دور امارت میں ہوئی تھی۔ اس کی زندگی شہزادوں اور امیر زادوں کی سی تھی یہ سیر و شکار کا بڑا دلدادہ تھا۔ امیر معاویہ اس کی بیعت اپنی زندگی میں لے چکے تھے۔ البتہ حضرت امام حسین، عبداللہ بن زبیر، عبداللہ بن عمر اور عبدالرحمٰن بن ابی بکر وغیرہ نے یزید کی ولی عہدی تسلیم نہیں کی تھی۔ اس لیے تخت نشینی کے بعد یزید کے سامنے سب سے پہلے ان بزرگوں کی بیعت کا سوال پیدا ہوا۔ عبدالرحمٰن بن ابی بکر اور عبداللہ بن عمرؓ سے تو کوئی خاص خطرہ نہ تھا البتہ امام حسین اور عبداللہ بن زبیر کی جانب سے دعویٰ خلافت کا یقین تھا۔ ایسی صورت میں حجاز اور عراق میں یزید کے خلاف انقلاب برپا ہونا یقینی تھا۔ یزید نے ان دونوں بزرگوں سے بیعت لینے کے لیے مدینہ کے حاکم ولید بن عتبہ کو تاکیدی حکم بھیجا۔

ولید بن عتبہ نے دونوں بزرگوں کو بلا بھیجا اور یزید کی بیعت کے لیے کہا۔ دونوں بزرگ ولید بن عتبہ سے مہلت لینے میں کامیاب رہے اور مکہ تشریف لے گئے جہاں ابن زبیر نے حرم میں پناہ لے لی اور حضرت امام حسین پہلے شعب ابی طالب میں قیام پذیر ہوئے اور پھر کوفہ والوں کی پرزور دعوت پر کوفہ کے لیے روانہ ہوئے اور کربلا کے مقام پر یزیدی فوج کے ہاتھوں شہادت سے ہمکنار ہوئے۔

واقعہ کربلا کے بعد حجاز میں شدید احتجاج ہوا۔ اہل حجاز نے شروع ہی میں یزید کی خلافت خوش دلی کے ساتھ قبول نہیں کی تھی۔ بعض بزرگوں نے بیعت بھی نہ کی تھی۔ حضرت امام حسین کی شہادت کے واقعے کا ان پر اور زیادہ برا اثر پڑا۔ حضرت عبداللہ بن زبیر نے جو عرصہ سے مکہ میں موقعہ کے منتظر تھے اس واقعہ کو لے کر اہل مکہ کو یزید کی مخالفت پر آمادہ کر دیا[1]

یزید کو ابتدا سے ہی ابن زبیر سے خطرہ تھا اس لیے امام حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد اس نے چند آدمیوں کو ابن زبیر سے بیعت لینے اور انکار کرنے کی صورت میں گرفتار کرنے کے لیے بھیجا۔ انہوں نے مکہ جا کر ابن زبیر کو یزید کا پیغام سنایا انہوں نے جواب دیا کہ میں اس کی کوئی بات نہ مانوں گا[2] اس طرح حجاز میں یزید کے خلاف انقلاب برپا ہو گیا۔

یزید نے نعمان بن بشیر کو اہل مدینہ اور ابن زبیر کو سمجھانے کے لیے بھیجا تھا مگر یہ سفارت ناکام لوٹ گئی۔ نعمان بن بشیر کی واپسی کے بعد حجاز میں انقلاب برپا ہو گیا۔ ابن عباس اور حضرت علی کے صاحبزادے محمد بن حنیفہ کے علاوہ کل اہل حجاز نے ابن زبیر کے ہاتھوں پر بیعت کر لی اور تمام اموی عمال کو مدینہ سے نکال دیا۔[3] اہل مدینہ نے بھی یزید کی بیعت فسخ کرنے کے بعد عبداللہ بن حنظلہ انصاری کو اپنا امیر بنا لیا اور مدینہ میں جو بنی امیہ مقیم تھے ان کو گھیر لیا۔ ان لوگوں نے مدد کے لیے شام آدمی بھیجے ان سے یزید کو حالات معلوم ہوئے۔[4]

---

[1] الدینوری، احمد بن داؤد، اخبار الطوال، لیڈن ای جے بریل، ۱۹۱۲ء، ص ۲۷۳

[2] تاریخ ابن اثیر، ۳/۳۰

[3] اخبار الطوال، ص ۲۷۳

[4] ابن اثیر، ۳/۳۳

مذکورہ انقلاب کی خبر سن کر یزید نے مسلم بن عقبہ مری کو دس ہزار فوج کے ساتھ حجاز روانہ کیا جس کے نتیجہ میں تاریخ اسلام کا المناک حادثہ یعنی مدینہ کو تاراج کرنے اور مکہ پر سنگباری کرنے کا واقعہ پیش آیا۔ مکہ مکرمہ کے محاصرہ کے دوران ہی یزید کا انتقال ہوگیا اور ابن زبیر کی پوزیشن مستحکم ہوگئی۔ خاندان بنوامیہ میں اس وقت کوئی عالی دماغ اور حوصلہ مند آدمی موجود نہ تھا جو ان حالات میں حکومت سنبھال سکتا۔ یزید کے سپہ سالار حصین بن نمیر نے عبداللہ بن زبیر سے صلح کرلی اور اسے شام جا کر بیعت لینے کا مشورہ دیا جسے قبول نہ کرکے ابن زبیر نے بہت بڑی سیاسی غلطی کی۔

یزید کا دور حکومت اور غیر مسلموں سے تعلقات:

یزید کے عہد حکومت میں حضرت امام حسین کے خون بے گناہی اور مدینۃ الرسول کی پامالی اور حرم محترم کی بے حرمتی کے سیاہ اعمال کے ساتھ ساتھ کچھ فتوحات بھی ہوئیں، جن میں غیر مسلموں سے صلح و جنگ کے واقعات بھی پیش آئے۔ آخر میں تو مسلم لیڈر کسیلہ کے ساتھ عقبہ کا توہین آمیز سلوک افریقہ میں انقلاب اور بغاوت کا سبب بنا۔ فتوحات اور پھر افریقہ میں انقلاب کا مختصر ذکر درج ذیل ہے:

ترکستان کی فتوحات:

خوارزم کے قریب ترکستان کے تمام فرمانرواؤں نے ایک مرکز بنالیا تھا جہاں وہ صلاح و مشورہ کے لیے جمع ہوا کرتے تھے۔ ان کا اجتماع مسلمانوں کے خلاف تھا، ترکستان کے فرمانروا چونکہ محارب غیر معاہد کا درجہ رکھتے تھے اس لیے خراسان کی فوج نے کئی مرتبہ اس پر حملہ کی اجازت چاہی مگر خراسان کے والی اجازت نہ دیتے تھے۔ ۶۱ھ میں یزید نے مسلم بن زیاد کو خراسان کا والی بنایا اس نے مہلب بن ابی صفرہ سے اجازت حاصل کرکے اس شہر کا محاصرہ کرلیا یہاں کے امراء نے صلح کرلی۔ اس مصالحت میں پانچ کروڑ نقد مسلمانوں کو ملا اور ترکستان کے فرماں رواؤں کے اجتماع کے خطرات کا انسداد ہوگیا۔

شمالی افریقہ میں بہت سی نئی فتوحات ہوئیں۔ افریقہ کے بربر بڑے سرکش اور جنگ جو تھے۔ بار بار مسلمانوں کے لیے اٹھتے تھے۔ ۶۲ھ میں بھی انہوں نے اجتماع کیا چونکہ اس سے پہلے بھی وہ کئی مرتبہ بغاوت کر چکے تھے اس لیے عقبہ بن نافع والی افریقہ نے قسم کھالی کہ ساری عمران سے لڑتے رہیں گے۔ عقبہ نے یہ قسم خوب نبھائی اور تمام خشکی کے علاقے فتح کرتے کرتے بحر محیط کے ساحل تک جا پہنچا اور سمندر نظر آنے پر اپنے تاریخی جملے ادا کیے۔

ابن اثیر کے مطابق:

سمندر نظر آتے ہی (عقبہ نے) خدا کے حضور عرض کیا "خدایا اگر یہ سمندر درمیان میں حائل نہ ہو جاتا تو جہاں تک تیری زمین ملتی میں تیری راہ میں جہاد کرتا چلا جاتا۔"[۱]

---

[۱] ابن اثیر، ج ۴، ص ۴۲

عقبہ بن نافع کی جرأت، بہادری اور جذبہ جہاد اور حکومت الٰہیہ قائم کرنے کا بے مثال جذبہ دھرے کا دھرا رہ گیا بلکہ بیکار ہو گیا جب اس نے اسلام کے ایک مسلمہ اصول احترام انسانیت اور ذات نسل اور برادری کی بنا پر فوقیت نہ ہونے سے انحراف کرتے ہوئے کسیلہ بن کرم جو عقبہ کے پیشرو والی ابوالمہاجر کے زمانہ میں مسلمان ہو گیا تھا، اس کے ساتھ توہین آمیز سلوک کا برتاؤ کیا۔ عقبہ کا یہی رویہ افریقہ میں ایک بڑی بغاوت کا سبب بنا۔

غیر اسلامی رویہ پر کسیلہ کی بغاوت:

کسیلہ طنجہ کا فرمانروا افریقہ کا نہایت ممتاز آدمی تھا۔ عقبہ کے پیشرو والی ابوالمہاجر کے زمانے میں مسلمان ہو گیا تھا۔ ابوالمہاجر کے بعد جب عقبہ افریقہ کے والی مقرر ہوئے تو ابوالمہاجر نے عقبہ کو کسیلہ کے ساتھ اس کے سابقہ مرتبہ کے مطابق رویہ اختیار کرنے کی ہدایت کی تھی مگر عقبہ نے اس کی پرواہ نہ کرتے ہوئے ایک موقع پر کسیلہ سے توہین آمیز سلوک کیا۔ کسیلہ نے بھی یہ دشمنی دل میں رکھی اور بدلہ لینے کا منتظر رہا۔[1]

عقبہ نے افریقہ کی فتوحات کی مہم سے واپسی کے وقت اس اطمینان سے کہ اب کوئی مخالف و مزاحم باقی نہیں رہا، فوجوں کو منتشر کر دیا اور صرف چند لوگوں کو ساتھ رکھا۔ جب یہ لوگ راستے میں کسیلہ کے دارالحکومت طبنہ کے قریب مقام میودہ میں رومیوں کو اسلام کی دعوت دینے لگے تو رومیوں نے ان کی تعداد کم دیکھ کر مقابلے کا ارادہ کر لیا اور انہیں عقبہ کے ساتھ کسیلہ کی عداوت کا بھی علم تھا اس لیے انہوں نے کسیلہ کو بھی خبر کر دی۔ کسیلہ ایک جم غفیر لے کر پہنچ گیا اور اس مڈبھیڑ میں عقبہ اور ابوالمہاجر دونوں شہید ہو گئے اور پورے افریقہ میں بغاوت پھیل گئی۔

ابن اثیر لکھتے ہیں:

عقبہ اور ابوالمہاجر کے بعد بربریوں اور رومیوں کا مقابلہ کرنے والا کوئی باقی نہ تھا۔ اس لیے سارے افریقہ میں بغاوت پھیل گئی اور ہر جگہ کے رومی اور بربری اٹھ کھڑے ہوئے کسیلہ انہیں لے کر قیروان پہنچا، عقبہ کے نائب زہیر بن قیس بلوی نے لوگوں کو مقابلے کے لیے ابھارا لیکن کوئی آمادہ نہ ہوا اور سب شہر چھوڑ کر نکل گئے جو لوگ باقی رہ گئے وہ کسیلہ کی امان میں آ گئے اور قیروان پر اس کا قبضہ ہو گیا اور زہیر بن قیس برقہ چلے گئے۔[2]

مذکورہ بغاوت جو ایک نومسلم کے ساتھ غیر اسلامی رویہ رکھنے پر کامیاب ہوئی تھی اس کا کوئی تدارک نہ ہو سکا تھا یہاں تک کہ ربیع الاول ۶۴ھ میں حوران میں یزید کا انتقال ہو گیا۔

---

[1] ندوی، معین الدین۔ تاریخ اسلام، ج ۲، ص ۳۹۹

[2] ابن اثیر، ج ۳، ص ۴۳

معاویہ ثانی بن یزید ۶۴ھ

یزید کی موت کے بعد ربیع الاول ۶۴ھ میں اس کا نوجوان بیٹا معاویہ ثانی تخت نشین ہوا جو اس وقت صرف اکیس برس کا تھا۔ معاویہ ثانی بہت دیندار اور صالح تھا۔ دور یزیدی میں جو حوادث اور واقعات پیش آئے انہیں دیکھ کر معاویہ کا دل حکومت و سلطنت سے بھر گیا تھا۔[1]

صرف تین ماہ کی مدت تک خلیفہ رہنے میں اس کا دل خلافت سے بھر گیا اور اس نے خلافت سے دست بردار ہوتے ہوئے مسلمانوں کے سامنے یوں تقریر کی:

''مجھ میں حکومت کا بار اٹھانے کی طاقت نہیں ہے۔ میں نے چاہا تھا کہ ابو بکرؓ کی طرح کسی کو اپنا جانشین بنا دوں یا عمرؓ کی طرح چھ آدمیوں کو نامزد کر کے ان میں سے کسی ایک کا انتخاب شوریٰ پر چھوڑ دوں، لیکن نہ عمرؓ جیسا کوئی نظر آیا اور نہ ویسے چھ آدمی ملے۔ اس لیے میں اس منصب سے دست بردار ہوتا ہوں، تم لوگ جسے چاہو اپنا خلیفہ بنا لو۔''[2]

حکومت سے دستبرداری سے چند مہینوں بعد معاویہ ثانی انتقال کر گیا۔ معاویہ ثانی کے تین ماہ کے دور حکومت میں غیر مسلموں سے تعلقات و معاہدات کے حوالے سے کوئی اہم چیز ریکارڈ میں نہیں پائی جاتی۔

---

[1] تاریخ یعقوبی، ۳۰۲/۲
[2] تاریخ طبری، ۳۶۸/۷

عبداللہ بن زبیر اور مروان بن الحکم

(۶۴ھ تا ۷۳ھ)　　(۶۴ھ تا ۶۵ھ)

یزید کی وفات کے بعد معاویہ ثانی نے صرف تین ماہ تک خلیفہ رہنے کے بعد حکومت سے دستبرداری کا اعلان کر دیا تو بنوامیہ کچھ عرصہ انتہائی بے بسی اور انتشار کا شکار رہنے کے بعد آخر کار شام میں مروان بن حکم کی سربراہی میں اپنی حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ باقی سب علاقوں پر عبداللہ بن زبیر کی حکومت قائم ہو گئی۔ تقریباً دس سال تک عالم اسلام ابن زبیر اور بنوامیہ کے حکمران مروان بن حکم اور اس کی وفات کے بعد ولید بن عبدالملک کی سربراہی میں باہم جنگ و جدل کا شکار رہا اور اس دوران کچھ مہم جو لوگوں نے شہادت امام حسین کو بنیاد بنا کر عربی اور عجمی نسلی تعصب کو ہوا دے کر اپنے مفادات حاصل کرنے کی کوشش کی اور بعد میں نومسلم عجمیوں کے ساتھ بنوامیہ کے نامزد گورنروں نے ناروا رویہ اختیار کیا لیکن یہ رویہ اس دور کے اموی حکمرانوں کا ذاتی فعل تھا جس کی اسلام کسی حال میں اجازت نہیں دیتا۔

ذیل میں عبداللہ بن زبیر اور اس کے دور میں متوازی حکومت کے علمبردار اموی حکمرانوں اور کچھ مہم جو لوگوں کا مختصر تعارف اور ان کے دور میں ہونے والے نومسلموں سے غیر اسلامی رویے کا جائزہ پیش کیا جا رہا ہے۔

عبداللہ بن زبیر:

حضرت عبداللہ بن زبیر مشہور صحابی اور آنحضرت ﷺ کے پھوپھیرے بھائی حواری رسول حضرت زبیر بن عوام کے صاحبزادے تھے۔ ان کی ماں حضرت اسماء رضی اللہ عنہا حضرت ابوبکر صدیقؓ کی بڑی صاحبزادی اور حضرت عائشہؓ کی حقیقی بہن تھی۔ ان رشتوں سے ابن زبیر کی ذات میں بہت سی خصوصیات جمع ہو گئی تھیں۔ ابن زبیر کے حوالے سے ابن اثیر لکھتے ہیں:

ابن زبیر ۲ھ میں مدینہ میں پیدا ہوئے۔ ہجرت کے بعد بہت دنوں تک مہاجرین کے اولاد نہیں ہوئی تھی۔ یہودیوں نے مشہور کر دیا تھا کہ یہ ان کے سحر کا نتیجہ ہے کہ عین اسی زمانہ میں عبداللہ پیدا ہوئے، اس لیے مسلمانوں کو ان کی ولادت کی بڑی خوشی ہوئی۔ سات آٹھ سال کی عمر میں انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کی، بچپن سے وہ بڑے بہادر، شجاع اور حوصلہ مند تھے اور اسی زمانہ میں ان میں بڑائی کے آثار نمایاں تھے، سن شعور کے بعد وہ اکثر مہمات میں شریک رہے۔ طرابلس انہی کی کوششوں سے فتح ہوا تھا۔[1]

ابن زبیر جنگ جمل میں اپنی خالہ کی حمایت میں پیش پیش تھے۔ ان کی حفاظت میں اس بہادری اور شجاعت کے ساتھ لڑے کہ سارا بدن زخموں سے چور ہو گیا تھا۔ پورے جسم میں چالیس سے زیادہ زخم آئے تھے۔

---

[1] تاریخ ابن اثیر، ۳/۸۰،۷۹

ابن زبیر کی خلافت:

یزید کی زندگی ہی میں اہل حجاز نے ابن زبیر کے ہاتھوں پر بیعت کر لی تھی۔ واقعہ حرہ کے بعد مسلم بن عقبہ نے بزور شمشیر دوبارہ اہل مدینہ سے یزید کی بیعت لے لی تھی۔ یزید کی موت کے بعد پھر وہ ابن زبیر کے ساتھ ہو گئے۔ ابن زبیر کی شخصیت ہر لحاظ سے محترم تھی اور معاویہ بن یزید کے بعد بنی امیہ میں کوئی حوصلہ مند کھڑا ابھی نہیں ہوا۔ اس لیے حجاز و عراق اور مصر و شام بڑے بڑے ملک ابن زبیر کے ساتھ ہو گئے اور یہاں ان کے حکام اور دعاۃ پہنچ گئے۔ خود بنو امیہ کے پایہ تخت شام میں اردن کے والی حسان بن بحدل کے علاوہ باقی تمام صوبوں کے حکام اور عمائد ابن زبیر کے حامی و مددگار بن گئے تھے اور یہاں کے باشندوں نے ان کی خلافت تسلیم کر لی تھی۔[1]

یزید کی وفات کے بعد ایک دفعہ تو ابن زبیر تمام عالم اسلام کے خلیفہ بنتے دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن جلد ہی مروان بن الحکم نے شام اور مصر میں مکمل کنٹرول حاصل کر کے دوسرے علاقوں میں بھی اموی اقتدار لانے کے لیے جوڑ توڑ شروع کر دیا۔

مروان بن حکم:

مروان بنی امیہ کی دوسری شاخ بنی العاص سے تھا۔ مروان کا باپ حکم بن العاص حضرت عثمانؓ کا حقیقی چچا تھا۔ فتح مکہ کے دن مسلمان ہوا لیکن اس کے دل میں اسلام راسخ نہ ہوا تھا۔ اندرونی طور پر مسلمانوں کا دشمن رہا اور ان کے اسرار فاش کیا کرتا تھا۔ اس لیے رسول اللہ ﷺ نے اس کو طائف جلاوطن کر دیا تھا۔ مروان اس زمانہ میں صغیر السن تھا اس لیے وہ بھی باپ کے ساتھ طائف میں رہا۔ آخر زمانہ میں رسول اللہ ﷺ سے حضرت عثمانؓ نے اس کی واپسی کی اجازت لے لی تھی۔

جنگ جمل اور صفین کے معرکوں میں یہ حضرت عائشہؓ اور امیر معاویہ کے ساتھ تھا۔ امیر معاویہ نے اسے مدینہ کا والی بنا دیا تھا۔

ابن زبیر نے اسے مدینہ سے نکال دیا تھا۔ مروان نے مدینہ سے نکل کر شام جا کر بھی ابن زبیر کی بیعت کرنا چاہی لیکن پھر ابن زیاد نے جو بصرہ میں حکومت قائم نہ رکھ سکنے کے بعد شام پہنچ گیا تھا اس کی کوششوں سے یہ شام کا حکمران بنو امیہ کی طرف سے مقرر ہوا۔

مروان نے شام میں حکومت حاصل کرنے کے بعد مصر پر لشکر کشی کی اور اس پر بھی قبضہ جمانے میں کامیاب ہو گیا۔ طبری کے مطابق:

شام پر قابض ہونے کے بعد مروان نے مصر پر فوج کشی کی۔ ایک طرف سے خود بڑھا اور دوسری طرف سے عمر بن سعید کو روانہ کیا۔ مصر کے حدود میں داخل ہونے کے بعد ابن زبیر کا مصری داعی عبدالرحمٰن بن جحدم مقابلہ کے لیے نکلا پشت سے عمر بن سعید پہنچ چکے تھے۔ اس لیے ابن جحدم کے نکلتے ہی وہ مصر میں داخل ہو گئے۔ ابن جحدم کو اس کی خبر ہوئی تو لڑنا بیکار سمجھ کر مروان سے بیعت کر

---

[1] یعقوبی، ۲/۲۴۳،۲۴

لی، اس طرح بغیر کشت وخون کے مصر پر بھی مروان کا قبضہ ہو گیا۔ مصر پر قابض ہونے کے بعد اس نے عبید اللہ بن زیاد کو عراق روانہ کیا۔

مروان بن حکم رمضان ۶۵ھ میں بغیر کسی علالت کے فوت ہو گیا۔ کہا جاتا ہے کہ اسے اس کی بیوی نے گلا گھونٹ کر یا زہر دے کر مارا تھا[1]

عبدالملک بن مروان اور عبداللہ بن زبیر

مروان کی وفات کے بعد رمضان ۶۵ھ میں عبدالملک تخت نشین ہوا۔ یہ اپنے دور کے اکابر علماء میں سے تھا۔

بنوامیہ کی تاریخ میں اس کا دور پرآشوب تھا جس وقت اس نے تخت حکومت پر قدم رکھا ملک کے تمام اہم حصوں میں انقلاب بپا تھا ایک وقت مختلف طاقتیں، عبداللہ بن زبیر، شیعان علی، خوارج اور مختار ثقفی بنی امیہ کے خلاف اور ان سے برسر پیکار تھیں۔

عبدالملک کے پاس صرف مصر و شام تھے باقی دنیائے اسلام کے کل حصے یا ابن زبیر کے ساتھ تھے یا ان میں بھی طائف الملو کی تھی۔ عراق میں عبید اللہ ابن زیاد بنوامیہ کے لیے مہمات میں مصروف تھے جبکہ ابن زبیر خارجیوں سے نبرد آزما تھے۔ اسی دوران مختار بن ابی عبید ثقفی نے خروج کیا اور عراق پر قابض ہو گیا۔

مختار نے عرب وعجم کے حوالے سے پائے جانے والے نسلی تعصب کو ہوا دے کر اپنا مقصد پورا کرنے کی کوشش کی اس طرح عجمی نومسلموں کو بنوامیہ کے ہاتھوں سے ذلت خفت اور قتل وغارت گری کا سامنا کرنا پڑا۔

عربی عجمی تعصب اور غیر مسلموں کا کردار:

۶۶ھ میں ایک شخص مختار بن ابی عبید ثقفی خون حسین کے انتقام کی دعوت لے کر اٹھا اور عراق پر قابض ہو گیا۔ یہ ایک معمولی اور بے دین لیکن عالی دماغ اور حوصلہ مند شخص تھا۔ اس دور کی بدنظمی اور طائف الملو کی دیکھ کر اسے بھی قسمت آزمائی کا حوصلہ ہوا۔[2] ان دنوں چونکہ ابن زبیر کا زور تھا اس لیے وہ حصول مقصد کے لیے ان کے ساتھ ہو گیا۔[3] عبداللہ بن زبیر کے ہاں اسے خاص پذیرائی نہ ملی تو اس نے توابین کی تحریک جو قاتلین حسین سے انتقام لینے کے لیے اٹھی تھی اس میں شمولیت اختیار کر لی۔

اس تحریک کو موثر بنانے کے لیے مختار نے پہلے حضرت زین العابدین کو اس کی سرپرستی قبول کرنے کی درخواست کی ان کے انکار پر محمد بن حنفیہ سے درخواست کی جو انہوں نے حالات کے تقاضے کی بناء پر قبول کر لی۔

محمد بن حنفیہ نے سرپرستی قبول کرنے سے پہلے حضرت عبداللہ بن عباس سے رائے لی تھی۔ اس زمانے میں چونکہ عبداللہ بن زبیر ان دونوں بزرگوں کو اپنی بیعت کے لیے مجبور کر رہے تھے اور ان کو ان کی جانب سے بڑا خطرہ تھا اس لیے مختار کی حمایت حاصل

۱۔ تاریخ طبری

۲۔ اخبار الطوال، ص ۳۱۴

۳۔ تاریخ ابن سعد، ۵/۷۱

کرنے کے لیے ابن عباس نے محمد بن حنفیہ کو سرپرستی قبول کر لینے کا مشورہ دیا۔[1]

محمد بن حنفیہ کو سرپرست بنانے کے بعد ان سے عراق میں کام کرنے کی اجازت چاہی تو انہوں نے اجازت تو دے دی لیکن اس کی نگرانی کے لیے اپنے ایک آدمی عبداللہ بن کامل ہمدانی کو بھی ساتھ کر دیا اور اسے مختار سے ہوشیار رہنے کی ہدایت کر دی۔[2]

مختار بڑا عاقبت اندیش اور چالاک آدمی تھا اس لیے اس نے اب بھی ابن زبیر سے تعلق منقطع نہیں کیا کہ اگر اس کی تحریک میں کامیابی نہ ہو تو ابن زبیر کا دروازہ اس کے لیے کھلا رہے، انہیں اس نے یہ دھوکا دیا کہ عراق میں اس کا قیام ان کے لیے زیادہ مفید ہوگا اور وہ وہاں جا کر شیعان بنی ہاشم کو بنی امیہ کے مقابلہ میں ان کی مدد پر آمادہ کرے گا۔ ابن زبیر نے بھی اسے اجازت دے دی۔[3]

اس طرح مختار ثقفی نے ابن زبیر اور محمد بن حنفیہ دونوں سے حمایت حاصل کر کے کوفہ کو اپنی تحریک کا مرکز بنا لیا۔ ہزاروں لوگ اس کے ساتھ ہو گئے اور اس کا گھر شیعان علی کا مرکز بن گیا۔ مختار ثقفی نے کوفہ کے ایک مقتدر آدمی رئیس ابراہیم بن اشتر کو بھی اپنی تحریک میں محمد بن حنفیہ کا ایک فرضی خط دے کر اسے اپنا مددگار بنا لیا۔

مختار کا کوفہ پر قبضہ:

ابن زبیر کی طرف سے کوفہ کے والی عبداللہ بن مطیع نے مختار اور ابراہیم کی باہمی دوستی اور غیر معمولی اثر و رسوخ کو دیکھ کر ابراہیم کو مختار سے ملنے سے روکا تو ابراہیم بن اشتر نے عبداللہ بن مطیع کے افسر پولیس ایاس کو قتل کر دیا اس پر عبداللہ بن مطیع نے ابراہیم کی گرفتاری کے لیے آدمی بھیجے۔ مختار اور ابراہیم کی طاقت اس قدر بڑھ چکی تھی کہ انہوں نے عبداللہ بن مطیع کے لوگوں کو شکست دے کر ابن مطیع کا محاصرہ کر لیا اور ابن مطیع کو جان بخشی کرا کر جان بچانی پڑی، ابن مطیع کی شکست کے بعد کوفہ اور سارے عراق پر مختار کا قبضہ ہو گیا صرف بصرہ ابن زبیر کے پاس رہ گیا۔[4]

مختار ثقفی نے محمد بن حنفیہ کو ابن زبیر کی قید سے رہائی دلائی اور قاتلین حسین کو چن چن کر قتل کیا۔

محمد بن حنفیہ کی رہائی:

حجاز میں محمد بن حنفیہ اور ابن عباس نے ابن زبیر کی بیعت نہ کی تھی۔ مختار کے عراق پر قبضہ کرنے کے بعد جب ابن زبیر کو معلوم ہوا کہ مختار کا ان سے تعلق ہے تو اس نے محمد بن حنفیہ اور ابن عباس کو زمزم کی چار دیواری میں قید کر کے دھمکی دی کہ اگر بیعت نہ

---

[1] مروج الذہب مسعودی، ج ۲، ص ۸۰

[2] تاریخ ابن سعد، ۵/۷۱

[3] المسعودی، حسین بن علی، مروج الذہب، مصر مطبعۃ السعادۃ، ۱۹۴۸، ص ۴۷۵

[4] اخبار الطوال، ص ۳۰

کی تو انہیں جلا دیا جائے گا۔محمد بن حنفیہ نے مختار کو اس کو اطلاع دی اس نے فوراً ان کو چھڑانے کے لیے تھوڑی سی فوج اور چار لاکھ نذر بھیجی۔اس فوج نے مکہ پہنچ کر محمد بن حنفیہ کو قید سے نکالا۔[1]

قاتلین حسین سے انتقام:

اس کے بعد کوفہ کے جن لوگوں نے امام حسین کی شہادت میں حصہ لیا تھا ان کا پتہ لگا کر مختار نے ان کو قتل اور ان کا مال و متاع ضبط کر لیا۔[2]

عرب و عجم کشمکش اور مختار ثقفی:

مختار کی قوت بازو زیادہ تر عجمی تھے انہی کے بل بوتے پر اس کی تحریک چل رہی تھی۔عرب اس میں بہت کم شریک تھے۔مختار نے حصول اقتدار کے بعد عجمی نومسلموں کے مراتب بڑھائے،انہیں انعام و اکرام سے خوب نوازا جبکہ ان کے مقابلے میں عربوں کے ساتھ اس کا سلوک نہایت حقارت آمیز تھا۔اس لیے اشراف عرب جن میں خلافت راشدہ کے بعد نسلی فخر اور برتری کا تصور پھر لوٹ آیا تھا،سب مختار کے خلاف ہو گئے۔مختار نے عجمی نومسلموں کو یہ بتلا کر کہ اشراف عرب تمہاری وجہ سے مجھ سے نالاں ہیں، عربوں کے خلاف جنگ میں انہیں خوب استعمال کیا اور عربوں کی بڑی تعداد ایسی جنگوں میں قتل اور گرفتار ہوئی۔مختار نے ایسے قیدیوں تک کے سر قلم کروائے۔

طبری کے مطابق:

مختار کوفہ پر قبضہ کرنے کے بعد عرینہ کے آزاد کردہ غلام کیسان ابو عمرہ کو اپنی فوج خاصہ کا سردار مقرر کیا تھا۔ایک دن ابو عمرہ مختار کے سرہانے کھڑا تھا اور مختار اشراف کوفہ سے بہت ہی توجہ سے باتیں کر رہا تھا۔موالیوں میں سے کسی شخص نے اس سے کہا دیکھو ابو اسحاق (مختار) ہمیشہ عربوں ہی سے ہمکلام رہتا ہے اور ہماری طرف دیکھتا ہی نہیں۔مختار نے ابو عمرہ کو بلا کر پوچھا کہ یہ شخص جسے میں نے تم سے باتیں کرتے دیکھا ہے تم سے کیا کہہ رہا تھا۔اس نے کہا اللہ آپ کو نیک ہدایت دے آپ کا ان کی طرف سے منہ پھیر کر عربوں سے متوجہ ہونا انہیں ناگوار اور شاق گزرا۔مختار نے کہا ان سے کہہ دو کہ اس بات سے تم رنجیدہ نہ ہو۔ہم تم ایک ہی ہیں اس کے بعد دیر تک خاموش رہنے کے بعد مختار نے کہا "ہم مجرموں سے بدلہ لینے والے ہیں" اس بات کو موالیوں نے بھی اس کی زبانی سن لیا تو انہوں نے آپس میں کہا کہ بشارت ہو اب تم ان سب کو قتل کر دو گے۔"[3]

اشراف کوفہ بھی عجمی نومسلموں کے بارے میں متکبرانہ رویہ رکھتے تھے اور اس کا اظہار بھی کرتے رہتے تھے۔

---

[1] تاریخ ابن اثیر، ۲۰۶/۳، ۲۰۷

[2] محولہ بالا

[3] تاریخ طبری، ۵۰۳/۱

...... جب مختار نے ابراہیم بن الاشتر کو عبیداللہ بن زیاد کے خلاف جنگ کے لیے بھیجا تو اشراف کوفہ جمع ہوئے اور مختار کے خلاف نکتہ چینی کرتے ہوئے انہوں نے کہنا شروع کر دیا: خدا کی قسم یہ شخص ہم پر زبردستی امیر بن بیٹھا ہے اس نے ہمارے آزاد کردہ غلاموں (یعنی نومسلم موالیوں کو) تقرب دیا ہے انہیں سواریاں دی ہیں، مال غنیمت انہیں کھلا دیتا ہے۔ یہ رنگ دیکھ کر ہمارے غلام ہوتے جا رہے ہیں......

ان لوگوں نے شیث بن ربعی کو اپنا نمائندہ بنا کر مختار کے پاس بھیجا جس نے اس سے جا کر کہا تو نے ہمارے آزاد کردہ غلاموں کو جو ہمارا مال غنیمت تھے بالکل ہی بگاڑ دیا ہے وہ اور ان کے یہ سارے شہر ہمارا مال غنیمت تھے ہم نے انہیں آزاد کر دیا جس کے بدلے میں ہمیں یقین ہے کہ ہمیں اس کا ثواب ملے گا اور ہمارا یہ عمل خدا کی بارگاہ میں مشکور ہوگا (اگر چہ یہ لوگ نومسلموں سے اسلامی اخوت ومساوات کا سلوک نہیں کرتے تھے) مگر معلوم ہوتا ہے کہ تم اتنے پر بھی راضی نہیں ہو کہ اب تم نے انہیں مال غنیمت میں بھی شریک و سہیم بنا دیا ہے۔[1]

اشراف کوفہ کا غیر عرب نومسلموں کے بارے میں یہ حقارت آمیز رویہ عربوں کی عمومی طرز نگاہ کی صحیح تصویر تھا۔ اگر چہ رسول اللہ ﷺ نے یہ درس دیا تھا کہ سب مومن بھائی بھائی ہیں اور اسلام عربوں اور عجمیوں میں کوئی امتیاز نہیں کرتا۔ لیکن عربوں کے فاتح قبائل اس اسلامی تعلیم پر عمل نہیں کرتے تھے۔ اس لیے غیر عرب نومسلموں میں عربوں کے خلاف نفرت وعداوت کا پیدا ہونا لازمی و لابدی تھا اور اس کے ذمہ دار کوفہ کے وہ متکبر عرب تھے نہ کہ اسلام کی تعلیمات۔

مختار ثقفی کی ہزیمت اور عجمیوں کا قتل عام:

اشراف کوفہ نے مختار ثقفی کے خلاف ابن زبیر کے بھائی مصعب بن زبیر جو بصرہ کے گورنر تھے مدد طلب کی اور نسلی تعصب کو بنیاد بناتے ہوئے کہا کہ ہمارے ہی غلام موالی ہم پر چڑھ آئے ہیں۔ چنانچہ اشراف کوفہ کے لشکر اور مصعب بن زبیر کے لشکروں نے مختار ثقفی کو پسپا ہونے پر مجبور کر دیا اور وہ اپنے قصر امارات میں جا چھپا اور مصعب بن زبیرؓ نے قصر امارات کا محاصرہ کر لیا۔

ایک روایت کے مطابق جب مصعب نے کوفہ میں قصر امارات کا محاصرہ کیا تھا اس وقت مختار کے پاس آٹھ ہزار فوج تھی۔ چار مہینے تک روزانہ لڑائی ہوتی رہی۔ بہت سے آدمی مارے گئے۔ آخر کار مختار کے قتل ہونے کے بعد اہل قصر امارات امان کے خواستگار ہوئے اور مصعب کے حکم کے مطابق دروازہ کھول کر نکل آئے۔ اس نے سب کے قتل کا حکم دے دیا۔ ان مقتولین کی تعداد چھ ہزار تھی جن میں سے صرف سات سو عرب تھے باقی عجمی اس کے بعد کوفہ پر مصعب کا قبضہ مکمل ہو گیا۔[2]

طبری لکھتا ہے:

اس واقعہ کے بعد مصعب کی جب عبداللہ بن عمرؓ سے ملاقات ہوئی تو عبداللہ بن عمر نے کہا تم نے سات ہزار مسلمانوں کو قتل کیا ہے جب تک جیتے ہو جیو مصعب نے کہا وہ سب کے سب کافر اور جادوگر تھے۔ عبداللہ بن عمر نے کہا اگر اپنے باپ کی میراث میں

---

1. تاریخ طبری ۴/۲، ۵۱۳،۵
2. تاریخ ابن خلدون، ۲/۸۷۔۱۷۵

سے بھی تم نے اس قدر بھیڑ بکریاں ذبح کی ہوتیں تو یہ بھی اسراف میں داخل ہوتا۔[1]

مختار کے قتل اور اس کی فوج کی پسپائی اور قتل عام کے بعد مصعب بن زبیر کا مکمل عراق پر قبضہ ہو گیا۔ لیکن عرب و عجم تعصب اور دشمنی کا بیج اور پختہ ہو گیا۔ اس کے بعد مصعب بن زبیر خوارج سے برسرپیکار ہو گیا۔

خارجی فرقہ اور نسلی تعصب:

خارجی فرقہ کے لوگ اگرچہ خلافت کے حوالے سے خلیفہ کا عربی یا قریشی ہونا ضروری قرار نہ دیتے تھے مگر اپنی جنس کے لیے عملاً تعصب ان کے اندر بھی موجود تھا۔ ابن ابی الحدید نے لکھا ہے کہ موالیوں میں سے ایک آدمی نے کسی خارجی عورت کو شادی کا پیغام دے دیا تو خارجیوں نے اس عورت سے کہا کہ تو نے تو ہمیں کہیں کا بھی نہیں رکھا ساری قوم میں ذلیل و رسوا کر دیا۔ اگر ان لوگوں میں عربوں کی یہ خشک عصبیت نہ ہوتی تو موالی میں سے بہت سے لوگ ان کے پیچھے ہو لیتے۔[2]

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ عربوں کے سارے فرقے غیر عرب مسلمانوں سے نفرت اور تعصب رکھتے تھے۔ مصعب بن زبیر کی ساری طاقت خارجیوں کے خلاف خرچ ہو گئی تو ۷۰ ہجری میں عبدالملک نے شرفاء عراق کے کچھ خطوط کی بنا پر عراق پر حملہ کا پروگرام بنایا۔ سرداران عراق نے مصعب کا ساتھ نہ دیا اور سن ۷۱ ہجری میں مصعب عبدالملک کی فوج کے ہاتھوں قتل ہوا اور پورے عراق پر عبدالملک کا تسلط ہو گیا۔

حجاج بن یوسف کا عجمیوں اور نو مسلموں سے رویہ:

عبدالملک نے ۷۲ ہجری میں حجاج بن یوسف کو عبداللہ بن زبیر سے لڑنے مکہ روانہ کیا۔ حجاج نے ہر قسم کے اوچھے ہتھکنڈے اور حرم کی حرمت کو پامال کر کے ابن زبیر کا خاتمہ کر دیا تو عبدالملک پوری مملکت اسلامیہ کا مختار مطلق بن گیا۔ عبدالملک نے ۷۵ ہجری میں حجاج کو عراق کا وائسرائے مقرر کیا تو وہ بارہ سو سواروں کے ساتھ کوفہ پہنچا۔

حجاج نے خوارج کے خلاف جنگ کے لیے مسلمانوں کو جبراً گھروں سے نکالا اور حکم نہ ماننے والوں کی گردنیں اڑا دی جاتی تھیں۔ اس کے دور میں ذمیوں سے ناروا سلوک کی بدترین مثالیں قائم ہوئی ہیں۔

عراق میں حجاج کے ظالمانہ طرز حکومت کا اندازہ اس روایت سے لگایا جا سکتا ہے کہ حجاج کے ان عاملوں نے جو صوبہ جات پر متعین تھے حجاج کو لکھا کہ مال گزاری بہت کم ہو گئی ہے اور ذمی مسلمان ہو کر شہروں میں جا بستے ہیں۔ اس پر حجاج نے بصرہ اور دوسرے مقامات میں حکم دے دیا کہ جس شخص کا اصل وطن دیہات میں ہے وہ دیہات میں چلا جائے۔ حکم حاکم مرگ مفاجات چاروناچار یہ لوگ ایک جماعت کی شکل میں آہ و بکا کرتے ہوئے نکلے اور شہر کے باہر پڑاؤ ڈال کر ٹھہر گئے۔ یا محمداہ یا محمداہ پکارتے جاتے تھے اور کسی کی کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کہاں جائیں۔ بصرہ کے قاری اور نیک لوگوں کا یہ قاعدہ تھا کہ چہروں پر نقاب ڈال کر ان

---

[1] تاریخ طبری، ۵/۷۰

[2] احمد امین، فجر الاسلام (مترجم عمر احمد عثمانی)، ادارہ طلوع اسلام لاہور، ۱۹۶۷ء

کے پاس جاتے اوران کی آہ وبقا سن کراور حالت زار دیکھ کر خود بھی رونے لگتے تھے۔اس واقعے کے بعد ہی ابن الاشعث نے عراق پر چڑھائی کی اوراس وجہ سے بصرے کے قاری ابن الاشعث کی حمایت میں حجاج کے خلاف جنگ کرنے پر آمادہ ہوئے۔[1]

ابن اثیر کا بیان ہے کہ حجاج بن یوسف کے عاملوں نے لکھا کہ خراج کا نظام درہم برہم ہو رہا ہے۔ذمی لوگ دھڑا دھڑ مسلمان ہوتے جا رہے ہیں۔اس پر حجاج نے ایسے لوگوں سے مسلمان ہو جانے کے باوجود جزیہ وصول کیا۔چنانچہ بصرہ کے قراء اس زیادتی پر آٹھ آٹھ آنسو روتے تھے۔[2]

مذکورہ واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ حجاج نے اموی حکومت کو مضبوط کرنے کے لیے بے جا قتل عام کے ساتھ ساتھ مال جمع کرنے کے لیے غیر مسلموں نومسلموں اور ذمیوں سے غیر اسلامی رویہ رکھا۔جس کا وہ خود ذمہ دار ہے جب کہ اسلام ایسے رویے کی اجازت ہرگز ہرگز نہیں دیتا ہے۔

---

[1] تاریخ طبری، ۳۷۸/۵

[2] فجر الاسلام، ۲۹۷/۱

ولید بن عبدالملک (۸۶ھ تا ۹۶ھ)

عبدالملک نے اپنی زندگی میں ہی اپنے ولی عہد کی بیعت لے لی تھی چنانچہ اس کی وفات کے بعد شوال ۸۶ھ میں ولید تخت نشین ہوا۔

عبدالملک اپنے دور حکومت میں تمام مخالف طاقتوں اور اندرونی شورشوں کو ختم کر کے ولید کے لیے میدان بالکل صاف کر گیا تھا اس لیے ولید کو پورے سکون اور اطمینان کے ساتھ بیرونی فتوحات اور تعمیری کاموں کا موقع ملا۔ ولید کا دور بنو امیہ کا دور زریں شمار کیا جاتا ہے۔

ولید کی خوش قسمتی تھی کہ اسے قتیبہ بن مسلم، موسیٰ بن نصیر، محمد بن قاسم اور مسلمہ بن عبدالملک جیسے نامور سپہ سالار اور فاتح مل گئے تھے جنہوں نے اسلامی حکومت کے ڈانڈے چین سے یورپ تک ملا دیے تھے۔

مذکورہ چاروں سپہ سالاروں کی فتوحات کے دوران غیر مسلموں سے تعلقات و معاہدات کا ذکر ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

قتیبہ بن مسلم:

۸۶ھ میں حجاج نے قتیبہ بن مسلم کو خراسان کا والی مقرر کیا، ترکستان کے ایک حصہ پر اگرچہ مسلمانوں کا تسلط قائم ہو چکا تھا اور یہاں کے متعدد چھوٹے حکمران باجگوار بن چکے تھے لیکن وقتاً فوقتاً وہ باغی ہو جاتے تھے۔ چنانچہ اس زمانہ میں بھی سمرقند و بخارا کے نواح کے حکمرانوں کا رویہ باغیانہ تھا[1]۔

قتیبہ نے ترکستان پر فوج کشی کی اور ان کے باغیانہ رویے پر قابو پا کر انہیں اپنے بھائی صالح کی نگرانی میں چھوڑا اور خود مرو کا رخ کیا۔

باذغیس کے حکمران تیزک کے یہاں عرصہ سے کچھ مسلمان قید تھے۔ مرو واپس آنے کے بعد قتیبہ نے ان کی رہائی کے لیے لکھا تو تیزک نے انہیں چھوڑ دیا اور اس شرط پر صلح کر لی کہ ان کے شہر کو محفوظ رکھا جائے گا۔ قتیبہ نے اس شرط کو نبھایا۔ تیزک ترکستان کے معرکوں میں قتیبہ کا معاون و مددگار بن گیا۔

اہل بیکند کی عہد شکنی اور سزا:

۸۷ھ میں قتیبہ نے بخارا کے شہر بیکند پر فوج کشی کی۔ بخاریوں نے سغد کی مدد سے مقابلہ کیا اور پھر شکست کھا کر قلعہ بند ہو گئے۔ قتیبہ نے شہر پناہ تڑوانا شروع کی تو انہوں نے صلح کی پیش کش کر دی تو قتیبہ نے صلح مان کر ان پر ایک مسلمان حاکم مقرر کر دیا اور خود لوٹ گئے۔ ابھی تھوڑے دور ہی گئے تھے کہ اہل شہر نے مسلمان حاکم اور اس کے عملہ کو قتل کر دیا۔ قتیبہ راستے سے واپس لوٹ آئے۔ اہل شہر پھر محصور ہو گئے۔ قتیبہ نے شہر پناہ مسمار کرا دی بیکند والوں نے دوبارہ صلح کرنی چاہی لیکن وہ ایک مرتبہ نقض

---

[1] تاریخ الخلفاء، ص ۲۱۸

عہد کر کے اعتبار کھو چکے تھے اس لیے اس مرتبہ قتیبہ نے صلح منظور نہ کی اور بزور شمشیر فتح کر کے ان کے جنگجو قتل کر دیے اور اس فتح میں بے شمار اسلحہ اور سونے چاندی کے ظروف مسلمانوں کے ہاتھ آئے۔[1]

غیر مسلم تیزک کا قتیبہ کی حمایت میں لڑنا:

۸۸ھ میں تومشکت کو فتح کرتے ہوئے اشنہ پہنچے یہاں کے باشندوں نے صلح کر لی اور قتیبہ لوٹ آئے۔

راستہ میں خاقان چین کا بھتیجا دولاکھ ترک، سغد اور فرغانیوں کے لشکر جرار کے ساتھ ملا۔ قتیبہ نے مسلمانوں کی قلت تعداد کے باوجود شجاعت کے ساتھ مقابلہ کیا اور اس ٹڈی دل کو فاش شکست دی اس جنگ میں بادغیس کا فرمانروا تیزک مسلمانوں کی حمایت میں بڑی جاں بازی سے لڑا۔[2]

تیزک کا علم بغاوت بلند کرنا:

قتیبہ نے زبردست معرکے کے بعد جب بخارہ بھی فتح کر لیا تو بادغیس کے فرمانروا تیزک نے جب دیکھا کہ قتیبہ نے بخارا بھی فتح کر لیا ہے تو وہ مسلمانوں کی ترکستان میں بڑھتی ہوئی قوت نہ دیکھ سکا اور اجازت لے کر چلا گیا۔ اور پھر اس نے بلخ، مروالروذ، طالقان، فاریاب اور جوز جان وغیرہ آس پاس کے تمام حکمرانوں کو ساتھ ملا کر علم بغاوت بلند کیا اور طخارستان سے مسلمان حاکم کو نکال دیا۔

قتیبہ کو ان حالات کی خبر ہوئی تو اس نے اپنے بھائی عبدالرحمٰن کو طخارستان روانہ کیا اور خود دوسرے باغی فرماں رواؤں کی طرف بڑھا اور طالقان اور فاریاب کو دوبارہ فتح کرتا ہوا بلخ پہنچ گیا اور پھر تیزک کو قابو کر کے جرم بغاوت اور دوسروں کو بغاوت پر آمادہ کرنے کے جرم میں قتل کر دیا۔

فرمانروائے شوماں کو وارننگ:

تیزک کے بعد قتیبہ دوسرے باغی فرمانرواؤں کی طرف متوجہ ہوا اور فوجی پیش قدمی سے پہلے انہیں سمجھانے کی کوشش کی اور فرمانروائے شوماں کے پاس جس نے اپنے یہاں سے مسلمان حاکم کو نکال دیا تھا کہلا بھیجا کہ اگر اب بھی بغاوت سے باز آ جائے تو اس کی خطا معاف کر دی جائے گی لیکن اسے اپنی قوت پر اتنا غرور تھا کہ ایک قاصد کو قتل کر دیا اور دوسرا جان بچا کر بھاگ گیا۔ اس لیے قتیبہ کو اس پر فوج کشی کرنی پڑی۔ قریب پہنچ کر قتیبہ کے بھائی صالح نے دوبارہ سمجھانے کی کوشش کی مگر اب بھی وہ باز نہ آیا اور مخالفانہ قلعہ بند ہو گیا۔ قتیبہ نے سنگ باری کر کے قلعے کی دیواریں توڑ دیں جب اس نے جنگ یا اطاعت کے سوا کوئی چارہ نہ دیکھا تو قلعہ سے نکل کر مقابلہ کیا اور مارا گیا۔ شومان کے بعد قتیبہ نے کش اور نسف فتح کیے اور بھائی صالح کو بھیج کر سغد کے فرماں رواطرخوں سے خراج وصول کیا۔[3]

---

[1] تاریخ ابن اثیر، ۲۰۳/۴

[2] ایضاً، ۲۰۴/۴

[3] ایضاً ۲۰۸/۴ تا ۲۱۰

خوارزم کے ظالم حکمران سے رعایا کو نجات دلانا:

۹۳ھ میں خوارزم شاہ نے خود سے قتیبہ کی اطاعت قبول کی۔ اس کی تفصیل کچھ یوں ہے کہ اس زمانہ میں شاہ خوازم بہت کمزور تھا۔ اس کے بھائی خرزاد نے اسے معطل کر کے سلطنت پر قبضہ جمالیا یہ رعایا پر بڑے مظالم کرتا تھا۔ کسی کی عزت وآبرو اور مال ودولت اس کے ہاتھوں محفوظ نہ تھی ساری رعایا اس کے مظالم سے نالاں تھی۔ خوازم شاہ اس کے مقابلے میں بالکل مجبور و بے بس تھا۔ اس لیے وہ موقعہ کا منتظر تھا۔ ترکستان میں جب قتیبہ کی قوت وفتوحات کا شہرہ ہوا تو خوارزم شاہ نے اس کے پاس خفیہ کہلا بھیجا کہ اگر وہ اس کے بھائی کے ہاتھوں سے نجات دلا دے تو وہ اس کی اطاعت قبول کر لے گا۔ قتیبہ نے اس کی درخواست قبول کر لی اور خوارزم پر فوج کشی کر کے خرزاد کو قتل کر کے سلطنت خوازم شاہ کے حوالہ کر دی۔ اس نے حسب وعدہ اطاعت قبول کر لی اور بہت سا نقد وجنس قتیبہ کی خدمت میں پیش کیا۔[1]

سمرقند کی فتح اور معاہدہ:

سغد یعنی اہل سمرقند اور مسلمانوں میں بہت قدیم سے عہد وپیان اور مصالحانہ تعلقات تھے لیکن ترکستان کی لڑائیوں میں انہوں نے عہد شکنی کر کے مسلمانوں کے خلاف ترکستان کے فرمانرواؤں کی امداد کی تھی اس لیے خوارزم کی مہم سے فراغت کے بعد قتیبہ نے سمرقند پر چڑھائی کا ارادہ کیا اور مسلمانوں سے کہا کہ سغد نے جس طرح معاہدہ توڑا ہے وہ تم کو بھی معلوم ہے اور مجھے بھی۔ مجھ کو امید ہے کہ خوارزم اور سغد کا حشر بنی قریظہ اور بنی نضیر کی طرح ہوگا اور اپنے بھائی صالح کو ایک فوج کے ساتھ سمرقند روانہ کر دیا اور خود ان کے عقب سے روانہ ہوا۔ سغد شہر میں قلعہ بند ہو گئے اور انہوں نے شاش اور فرغانہ وغیرہ کے فرمانرواؤں کو لکھ بھیجا کہ اگر آج عرب ہمارے مقابلے میں کامیاب ہو گئے تو کل تمہاری باری ہوگی۔ اس طرح تمام سرحدی حکمران ان کی مدد کے لیے نکل آئے۔ قتیبہ نے اپنے بھائی صالح کو چند سو منتخب بہادروں کے ساتھ امدادی فوج کا راستہ روکنے کے لیے بھیج دیا جس نے امدادی فوج کو شکست دی۔ اس کی خبر سمرقند پہنچی تو سغد کی ہمت پست ہوگئی اور اہل سمرقند کے لیے سپر ڈالنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا اس لیے انہوں نے حسب ذیل شرائط پر صلح منظور کر لی۔

۱۔ اہل سمرقند ۱۲ لاکھ سالانہ خراج دیا کریں گے۔

۲۔ اس سال تیس ہزار سوار دیں گے۔

۳۔ مسلمان شہر میں فاتحانہ داخل ہوں گے، ان کے داخلہ کے وقت مسلح آبادی شہر خالی کر دے گی۔

۴۔ مسلمان یہاں مسجد بنا کر نماز پڑھیں گے اور خطبہ دیں گے۔

ان شرائط کے مطابق سغد نے شہر خالی کر دیا، مسلمانوں نے شہر میں مسجد تعمیر کر کے نماز پڑھی اور خطبہ دیا اور اعلان عام کر دیا کہ صلح کی رقم کے علاوہ ہم کسی چیز کو ہاتھ نہ لگائیں گے، جس جس کا مال ہو وہ آ کر اپنا لے لے۔[2]

---

[1] فتوح البلدان، ص ۴۲۷

[2] تاریخ ابن اثیر، ۴/ ۲۱۸،۲۱۷

چین پر فوج کشی اور خاقان کی اطاعت:

خاقان چین نے بھی اہل سمرقند کی مدد کی تھی بلکہ اس کا بیٹا امدادی فوجوں کا سپہ سالار تھا۔ مسلمانوں کو ان کے خطرات سے محفوظ کرنے کے لیے چین کی تسخیر ضروری تھی۔

۹۶ھ میں قتیبہ نے بڑے اہتمام کے ساتھ چین پر فوج کشی کی تیاریاں کیں۔ خاقان چین نے حالات معلوم کرنے کے لیے مسلمانوں کا وفد طلب کیا۔ قتیبہ نے ہبیرہ بن مشرح کو دس سنجیدہ مسلمانوں کے ساتھ چین بھیجا اور انہیں ہدایت کردی کہ وہ خاقان چین کو اس کا یقین دلا دیں کہ میں نے قسم کھائی ہے کہ جب تک تمہاری زمین کو اپنے پیروں سے پامال کر کے خراج وصول نہ کرلوں گا اس وقت تک واپس نہ جاؤں گا۔ اس وفد کی خاقان سے کئی ملاقاتیں ہوئیں آخری ملاقات میں خاقان نے ہبیرہ سے کہا کہ تم واپس جا کر اپنے سردار سے کہہ دو کہ وہ لوٹ جائے مجھ کو تم لوگوں کی تعداد کا علم ہے اگر تم اپنے ارادہ سے باز نہ آئے تو میں ایسی فوج تمہارے مقابلے میں بھیجوں گا جو تمہیں تباہ و برباد کردے گی۔ ہبیرہ نے اس کے جواب میں کہا تم اس قوم کو کم تعداد کس طرح کہہ سکتے ہو جس کا ایک سرا تمہارے ملک میں ہے اور دوسرا شام میں۔ ہم لوگ موت سے ڈرنے والے نہیں ہیں اور پھر اپنے لیڈر قتیبہ کی قسم کا ذکر کیا۔ خاقان نے ہبیرہ کا جواب سن کر اطاعت کا فیصلہ کرلیا اور جزیہ دے کر بہت سے قیمتی ہدایا و تحائف قتیبہ کے پاس بھیجے۔ مسلمانوں کا مقصد بھی چین کو فتح کرنا نہ تھا بلکہ خاقان چین کے خطرہ کا انسداد تھا اس لیے اس کے مصالحانہ رویہ پر انہوں نے جزیہ قبول کر کے فوج کشی کا ارادہ ترک کردیا۔[1]

محمد بن قاسم:

ولید بن عبدالملک کے دور کا ایک اہم کارنامہ فتح سندھ ہے جو محمد بن قاسم کے ہاتھوں مکمل ہوئی۔ سندھ پر فوج کشی کا سلسلہ تو عرصہ سے جاری تھا۔ ہر خلیفہ کے زمانے میں یہاں کچھ نہ کچھ فتوحات حاصل ہوئیں لیکن ولید سے پہلے اسے مستقل فتح کرنے کا خیال پیدا نہ ہوا تھا۔ ولید کے زمانے میں ایک ناگوار واقعے نے حجاج کو اسے مستقل فتح کرلینے پر آمادہ کردیا اس کی تفصیل بلاذری کے مطابق یہ ہے:

لنکا میں کچھ عرب تاجر آباد تھے۔ ان میں سے ایک تاجر کا انتقال ہوگیا۔ لنکا کا راجہ مسلمانوں سے دوستانہ تعلقات پیدا کرنے کا خواہش مند تھا، اس لیے متوفی تاجر کے اہل و عیال کو جن میں کئی عورتیں تھیں جہاز کے ذریعے بھجوادیا اور ولید کے لیے قیمتی ہدایا و تحائف بھیجے۔ اس جہاز میں کچھ حاجی تھے۔ دیبل کے قریب سندھی قزاقوں نے جہاز پر حملہ کر کے لوٹ لیا اور عربی عورتوں کو گرفتار کرلیا۔ ان میں سے ایک عورت نے غائبانہ حجاج سے فریاد کی کہ حجاج المدد! حجاج کو اس کی خبر ہوئی تو اس پر اس کا بڑا اثر ہوا۔ اس نے جواب دیا "میں آیا" اور اس وقت دیبل کے راجہ داہر کو لکھا کہ عرب عورتوں کو واپس کرادو، اس نے جواب دیا کہ یہ کام بحری قزاقوں کا ہے اس لیے میں مجبور ہوں۔[2]

---

[1] تاریخ ابن اثیر، ۲/۵، ۳
[2] فتوح البلدان، ص ۴۳۱

یہ جواب سن کر حجاج نے دو لوگوں کو یکے بعد دیگرے فوج دے کر دیبل بھیجا لیکن دونوں شکست کھا کر جنگ میں کام آئے۔
اس کے بعد حجاج نے اپنے نوجوان چچیرے بھائی محمد بن قاسم ثقفی کو جو فارس کا حاکم تھا چھ ہزار سپاہ کے ساتھ سندھ روانہ کیا۔ اس نے تمام بھاری سامان بحری راستہ سے روانہ کیا اور خود مکران ہوتا ہوا خشکی کے راستے سے سندھ آیا اور سب سے پہلے قنز پور (پنج گور) کی طرف بڑھا اور اسے فتح کر کے ارمابیل (ارمن بیلہ) کو تسخیر کیا۔[1]

ارمن بیلہ کے بعد محمد بن قاسم دیبل کی طرف بڑھا۔ اس کے پہنچنے کے ساتھ ہی وہ سامان بھی جسے بحری راستے سے بھیجا تھا پہنچ گیا۔ اس میں ایک قلعہ شکن منجنیق تھی جسے پانچ سو آدمی حرکت دیتے تھے اس کا نام عروس تھا۔ محمد بن قاسم کے پہنچنے کے بعد دیبل کے باشندے شہر میں قلعہ بند ہو گئے تھے۔ محمد بن قاسم نے شہر کا محاصرہ کر لیا اور چاروں طرف خندقیں کھدوا کر منجنیقیں نصب کرا دیں۔ اہل شہر کئی مہینوں تک بہادری سے مدافعت کرتے رہے لیکن کوئی فیصلہ نہ ہوا۔

حجاج کو اس مہم سے اتنا تعلق خاطر تھا کہ ہر تیسرے دن خبریں منگا کر حالات معلوم کر کے جنگ کے متعلق ہدایات بھیجتا تھا۔ جب محاصرہ زیادہ طول پکڑ گیا اور کوئی نتیجہ نہ نکلا تو حجاج نے لکھا کہ منجنیق کو ایک زاویہ کم کر کے مشرق کی جانب نصب کر کے دیول (بدھ کا صنم کدہ) پر سنگباری کی جائے۔

اس ہدایت کے مطابق محمد بن قاسم نے سنگ باری کا حکم دے دیا اس سے دیول کا گنبد ٹوٹ گیا اس کے ٹوٹتے ہی اہل شہر کی ہمت پست ہو گئی، دوسری طرف مسلمانوں نے پورا زور لگایا اور بڑھتے ہوئے فصیل کی دیوار تک پہنچ گئے۔ اہل شہر نے روکنے کی بہت کوشش کی مگر ناکام رہے۔ اور چند جانباز مسلمان کمند ڈال کر فصیل پر چڑھ گئے۔ اب اہل شہر کی ہمت بالکل چھوٹ گئی۔ راجہ داہر کے حاکم شہر چھوڑ کر بھاگ گئے اور مسلمانوں نے آسانی کے ساتھ قبضہ کر لیا۔ شہر میں داخل ہونے کے بعد محمد بن قاسم نے ایک مسجد تعمیر کرائی اور چار ہزار مسلمان آباد کیے۔[2]

نیرون کے راجہ کی صلح:

دیبل سے کچھ مسافت پر ایک مقام نیرون تھا یہاں کے راجہ بھدرکن نے اہل دیبل کا انجام دیکھ کر محمد بن قاسم سے صلح کر لی۔ جب محمد بن قاسم دیبل سے نیرون پہنچا تو حاکم نیرون نے بڑے تپاک سے ان کا استقبال کیا اور شہر لے جا کر مسلمانوں کی ضیافت کی۔ ان کے مویشیوں کے لیے چارہ فراہم کیا۔ بہت سے قیمتی ہدیے پیش کیے اور نامہ و پیام کے ذریعے جو صلح ہوئی تھی زبانی تکمیل ہو گئی۔[3]

سندھ کے اکثر راجاؤں نے محمد بن قاسم سے لڑنے کی بجائے صلح کو ترجیح دی۔ محمد بن قاسم مسلسل آگے بڑھ رہا تھا کہ اسے حجاج بن یوسف کا حکم پہنچا کہ نیرون واپس جا کر راجہ داہر کے پایہ تخت پر فوج کشی کرو۔ محمد بن قاسم کا مقصد خواہ مخواہ راجہ داہر سے

---

[1] فتوح البلدان، ص ۴۴۲
[2] بلاذری، ص ۴۴۲، ۴۴۳
[3] ایضاً

لڑنا نہیں بلکہ اسے مطیع بنانا تھا۔ اس لیے جارحانہ اقدام سے پہلے اس نے راجہ داہر کے پاس ایک وفد بھیجا لیکن وہ مصالحت کے لیے آمادہ نہ ہوا اور جواب دیا کہ "اس کا فیصلہ تلوار کرے گی"۔ اس طرح محمد بن قاسم اور راجہ داہر کی فوجوں میں زبردست رن پڑا۔ آخر کار راجہ داہر مارا گیا اور سندھیوں کو شکست فاش ہوئی۔ راجہ داہر کے بیٹے جے سنگھ نے شکست خوردہ فوج کو پہلے راور اور پھر برہمن آباد میں منظم کر کے مقابلے کی تیاریاں جاری رکھیں۔

راجہ داہر کے وزیر سی ساکر کی جان بخشی اور عہدہ وزارت:

راجہ داہر کے وزیر سی ساکر نے جے سنگھ کے انجام کا اندازہ کر کے محمد بن قاسم کے پاس جان بخشی اور اطاعت کی درخواست بھیجی۔ محمد بن قاسم قدر شناس تھے اس لیے انہوں نے وزیر مذکور کی درخواست قبول کر لی اور سی ساکر نے خود ان کے پاس آ کر اظہار اطاعت کیا اور وہ عرب عورتیں پیش کیں جنہیں سندھ کے بحری قزاقوں نے جہاز سے گرفتار کیا تھا اور جن کی وجہ سے سندھ پر حملہ ہوا تھا۔ سی ساکر کی اطاعت کیشی کے صلہ میں محمد بن قاسم نے اس کی بڑی عزت افزائی کی اور اسے وزیر بنا کر اس کا اعزاز برقرار رکھا۔[1]

راجہ داہر کے بیٹے جے سنگھ نے برہمن آباد کو اپنی تیاریوں کا مرکز بنا رکھا تھا۔ ۹۳ھ میں محمد بن قاسم برہمن آباد پہنچا۔ جے سنگھ مقابلہ کے تمام انتظامات مکمل کر چکا تھا وہ اپنے تمام نامور سرداروں کو ذمہ دار بنا کر کسی جنگی ضرورت سے برہمن آباد سے باہر چلا گیا تھا۔ محمد بن قاسم نے جنگ شروع کرنے سے پہلے اہل شہر کے پاس کہلا بھیجا کہ "یا اسلام قبول کر و یا خراج دے کر اطاعت قبول کر لو ورنہ جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ۔" جب اس کا کوئی جواب نہ ملا تو اس وقت محمد بن قاسم نے محاصرہ کر کے جنگ شروع کر دی۔ عرصہ تک جنگ جاری رہی۔ جے سنگھ کی فوج قلعہ بند ہو کر لڑتی رہی۔ اس دوران جے سنگھ واپس آ گیا مگر درمیان میں مسلمان حائل تھے اس لیے برہمن آباد نہ پہنچ سکا۔ اس نے مسلمانوں کی رسد بند کروا کر مسئلہ پیدا کیا۔ محمد بن قاسم نے جے سنگھ کے مقابلے کے لیے فوج بھیجی اس کے پاس کوئی بڑی قوت نہ تھی اس لیے وہ ہٹ گیا اور اپنے بھائی گوپی کو اپنا نائب مقرر کر کے کشمیر کی طرف نکل گیا۔ جے سنگھ کے فرار کے بعد کچھ عرصہ فوج اور برہمن آباد کی آبادی نے دفاع کیا لیکن جب محاصرہ زیادہ لمبا ہوا تو اہل شہر نے محمد بن قاسم سے سمجھوتا کرتے ہوئے دروازے کھلے رہنے دیے۔ مسلمان شہر میں داخل ہو گئے۔ قلعہ کی فوج کو اس کا علم نہ تھا وہ گھبرا گئی اور جدھر راستہ ملا فرار ہو گئی۔ محمد بن قاسم نے شہر میں داخل ہو کر امن عام کا اعلان کیا۔[2]

برہمن آباد کی فتح کے بعد راجہ داہر کا لڑکا گوپی ارور چلا گیا اور وہاں کے باشندوں کو یہ یقین دلا کر کہ راجہ داہر قتل نہیں ہوا بلکہ ہندوستان چلا گیا ہے اور وہاں کے راجاؤں کی مدد لے کر عنقریب پہنچنا چاہتا ہے، جنگی تیاریوں میں مصروف ہو گیا۔[3]

محمد بن قاسم ارور پہنچا اس دوران گوپی پوری تیاری کر چکا تھا۔ محمد بن قاسم نے رانی لاڈلی کے ذریعے کہلا بھیجا کہ راجہ قتل ہو چکا ہے تم لوگ اطاعت قبول کر لو۔ یعقوبی کا بیان ہے کہ رانی کے یقین دلانے پر اہل شہر نے اطاعت قبول کر لی اور شہر کے دروازے

---

[1] علی بن حامد بن ابی بکر، چچ نامہ (فتحنامہ سندھ) مجلس مخطوطات فارسیہ حیدرآباد دکن ۱۹۳۹ء، ص ۲۱۳

[2] ایضاً، ص ۲۰۸

[3] ایضاً، ص ۲۳۵

کھول دیے۔[1]

ارود کے باشندوں سے معاہدہ:

البتہ چچ نامہ میں ہے کہ انہوں نے رانی کے بیان پر اعتماد نہ کیا اور اس کی شان میں نازیبا باتیں کیں اس لیے محاصرہ قائم رہا۔ کچھ دنوں بعد اہل شہر کو راجہ کی موت کا یقین ہو گیا اور وہ اطاعت پر آمادہ ہوئے۔ یہ صورت حال دیکھ کر گوپی کیرج بھاگ گیا۔ گوپی کے فرار کے بعد ارود کے باشندے ان شرائط کے تحت شہر حوالہ کرنے کے لیے تیار ہو گئے:

۱۔ ہر شہری کو امان دی جائے کسی کو قتل نہ کیا جائے۔

۲۔ بدھ کے صنم کدہ کو کسی قسم کا نقصان نہ پہنچایا جائے۔

محمد بن قاسم نے دونوں شرطیں قبول کر لیں۔ اہل شہر نے کنجی حوالہ کر دی اور مسلمان ارود میں داخل ہو گئے۔ محمد بن قاسم نے قلعہ کی مسلح سپاہ کے علاوہ باقی شہر کی عام آبادی کو امان دے دی اور صنم کدہ کو کنیسہ اور آتش کدہ کے حکم میں قرار دے کر اس سے کوئی تعرض نہیں کیا اور اہل شہر پر معمولی خراج تشخیص کر دیا۔[2]

اس کے بعد محمد بن قاسم اسکندہ اور پھر دریائے چناب کو عبور کر کے ملتان کو بڑی ہمت اور جانفشانی کے ساتھ فتح کیا۔ ملتان بدھوں کا بہت بڑا تیرتھ گاہ تھا اور یہاں کے صنم کدہ میں بے اندازہ دولت تھی یہ سب مسلمانوں کے قبضہ میں آئی۔ بلاذری کے مطابق اٹھارہ گز لمبا اور دس گز چوڑا کمرہ سونے سے بھرا ہوا تھا۔[3]

محمد بن قاسم کا غیر مسلموں سے عمدہ سلوک:

محمد بن قاسم نے اپنے قیام سندھ کے دوران عدل و انصاف، رعایا پروری اور ہمدردی خلائق کے جو ریکارڈ قائم کیے تھے اس کا ثبوت یہ ہے کہ جب سلیمان بن عبدالملک نے ذاتی رنجش کی بنا پر اس کی جگہ یزید بن ابی کبشہ کو مقرر کیا اور محمد بن قاسم کو جیل میں ڈال کر اذیتیں دلا کر جان بحق کروایا تو اہل ہند نے اس کی گرفتاری اور موت کو ایک المیہ قرار دیتے ہوئے اسے بہت محسوس کیا اور بڑے آنسو بہائے۔

گجرات کے ایک شہر کھیڑا میں اس کا مجسمہ بنا کر وسط شہر میں نصب کیا گیا یہ اس کے بہت بڑا انسان اور عادل امیر ہونے کی دلیل تھی۔

بلاذری کے مطابق:

"فبکی اھل الھند و صوروہ بالکیراج"[4]

یعنی محمد بن قاسم کی موت پر ہندوستان کے لوگ روئے اور کیرج (کھیڑا) میں اس کی تصویری یادگار قائم کی گئی۔

---

[1] تاریخ یعقوبی، ۲/ ۳۲۶

[2] چچ نامہ، ص ۱۳۸۔ بلاذری، ص ۴۴۲

[3] فتوح البلدان، ص ۴۴۵

[4] فتوح البلدان، ص ۴۲۸

طارق بن زیاد (۹۲ھ-۹۳ھ)

ولید بن عبدالملک کے دور کا ایک عظیم سپہ سالار طارق بن زیاد ہے۔ اندلس کی فتح کا سہرا اس کے سر ہے۔
طارق نسلاً بربری افریقہ کا باشندہ اور موسیٰ بن نصیر کے آزاد کردہ غلاموں میں سے تھا۔

اندلس پر حملے کا پس منظر:

اندلس پر مسلمانوں کے حملے سے پہلے گاتھ خاندان کی حکومت تھی جس پر کلیسا کا جابرانہ تسلط قائم تھا حکمران پادریوں کے چشم و ابرو کے اشارہ کے پابند تھے رعایا حکومت کے جابرانہ قوانین اور امراء اور جاگیرداروں کے مظالم سے نالاں تھی، یہودیوں کے ساتھ جانوروں سے زیادہ وحشیانہ سلوک کیا جاتا تھا۔ بادشاہ اور امراء سے لے کر خانقاہ نشین راہب تک عیش پرستی میں غرق تھے۔

گاتھ خاندان کا آخری فرمانروا وتیزا (غیطشہ) بھی گو عیش پرست تھا لیکن اس نے اپنے دور میں کچھ اصلاح کی کلیسا کے اقتدار کو گھٹایا بہت سے جابرانہ قوانین منسوخ کیے۔ یہودیوں کو کچھ مراعات عطا کیں اس طرح اہل کلیسا اس کے خلاف ہو گئے۔

یہودیوں کے ساتھ مراعات عیسائی گناہ تصور کرتے تھے اس لیے پادریوں نے اس کو آڑ بنا کر رعایا اور امراء کو وتیزا کے خلاف کر دیا اور انہیں ملا کر وتیزا کو معزول کر کے ایک بوڑھے تجربہ کار فوجی افسر راڈرک کو جسے شاہی خاندان سے تعلق نہ تھا تخت نشین کیا یہ بڑا تجربہ کار اور عاقبت اندیش تھا اس نے کلیسا کی حمایت حاصل کرنے کے لیے پادریوں کے اختیارات کو بحال کر دیا۔

گاتھ فرمانرواؤں کا ظالمانہ دستور:

گاتھ فرمانرواؤں میں دستور تھا کہ ان کے امراء اور جاگیرداروں کے لڑکے دربار شاہی میں اور لڑکیاں ملکہ کی زیر نگرانی محل سرا میں پرورش پاتیں اور تعلیم و تربیت حاصل کرتی تھیں۔ اس سے اصل مقصد ان کی جان کے خوف سے ان کے والدین میں بغاوت اور سرکشی کا خیال نہ پیدا ہو سکے۔ اس دستور کے مطابق ایک یونانی سردار کاؤنٹ جولین (ایلیان) والی سبتہ کی لڑکی بھی راڈرک کے محل میں تھی یہ بڑی حسین و جمیل تھی راڈرک اس پر فریفتہ ہو گیا اور زبردستی اسے اپنے تصرف میں لے آیا۔ لڑکی نے باپ کو اطلاع دی، اس بے عزتی پر کاؤنٹ جولین راڈرک کا دشمن ہو گیا اور اس کی حکومت کا تختہ الٹنے کا تہیہ کر لیا۔

اس واقعہ کے بعد کاؤنٹ جولین نے مسلمانوں سے مدد مانگی اور اندلس پر حملہ کرنے کی دعوت دی۔ اندلس پر حملہ کی اجازت موسیٰ بن نصیر نے ولید بن ملک سے حاصل کر کے پہلے طریق بن مالک کو پانچ سو کی جماعت کے ساتھ حالات کا اندازہ لگانے کے لیے بھیجا۔[1]

اس مہم کی کامیابی کے بعد ۹۲ھ میں موسیٰ نے اپنے غلام طارق بن زیاد کو سات ہزار بربری فوج کے ساتھ کاؤنٹ جولین کی راہنمائی میں اندلس روانہ کیا۔ طارق بن زیاد نے راڈرک کو شکست فاش دی اور اندلس کے پایہ تخت اور بہت سے صوبوں پر بھی قبضہ کر لیا۔

---

[1] نفح الطیب، ۱/۱۰۶

تھیوڈو کے ساتھ طارق کا مصالحانہ معاہدہ:

اندلس کا دوسرا اہم صوبہ تدمیر (مرسیہ) تھا جو اپنے صوبہ دار تھیوڈومیر کی نسبت سے تدمیر کہلاتا تھا۔ تھیوڈومیر اندلس کے صوبہ داروں میں سب میں ممتاز، ناموراور بہادر تھا۔ اس کا مرکز حکومت اور یویلہ بڑا مستحکم اور سنگین شہر تھا۔ استجہ کے معرکہ کے بعد طارق نے ہر صوبہ میں الگ الگ فوجیں بھیجی تھیں۔ چنانچہ اسلامی فوج جب تدمیر پہنچی تو تھیوڈومیر نے بڑی شجاعت سے اس کا مقابلہ کیا لیکن مسلمانوں کی جانبازی کے مقابلہ میں اس کی شجاعت کام نہ آسکی اور اس نے نہایت فاش شکست کھائی۔ اس کی فوج کا بڑا حصہ برباد ہوگیا اور وہ بقیہ مختصر جماعت کو لے کر اریویلہ کے قلعہ میں چلا آیا اور مسلمانوں سے اپنی کمزوری چھپانے کے لیے عورتوں کو فوجی لباس پہنا کر اسلحہ سے آراستہ کر کے قلعہ کی فصیل پر کھڑا کر دیا، دور سے عورتوں اور مردوں میں کوئی امتیاز نہیں ہوسکتا تھا۔ اس لیے مسلمان دھوکہ میں آ کر صلح کے لیے تیار ہو گئے۔ تھیودمیر یہی چاہتا تھا، چنانچہ وہ خود قاصد کے لباس میں گفتگو کے لیے آیا اور صلح ہو جانے کے بعد اپنے کو ظاہر کیا اور صلح کے مطابق مسلمانوں کو شہر میں لے گیا یہاں ان کو عورتوں اور لڑکوں کے علاوہ کوئی مضافاتی آبادی نظر نہ آئی۔ اس وقت مسلمانوں کو صلح پر بڑی پشیمانی ہوئی لیکن اب صلح ہو چکی تھی اس لیے مجبور تھے [۱]

مذکورہ صلح میں اگرچہ تھیوڈومیر نے دھوکہ سے کام لیا تھا مگر پھر بھی مسلمانوں نے صلح کے معاہدہ کو بڑے احسن طریقہ سے نبھایا اور تھیوڈومیر کی کمزوری سے کوئی فائدہ اٹھانے کی کوشش نہ کی۔

موسیٰ بن نصیر:

طارق بن زیاد نے موسیٰ بن نصیر سے اندلس کی مکمل فتح یابی کے لیے امید مانگی تو پہلے اس نے پانچ ہزار فوج بھیجی اور بعد میں خود بھی اندلس پہنچ گیا۔ موسیٰ نے شروع میں طارق کے مفتوحہ علاقوں کو چھوڑ کر نئے میدانوں میں اپنی جنگی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا اور بعد میں شمالی اندلس میں دونوں نے مل کر کاروائیاں کیں۔

موسیٰ کے اندلس پہنچنے کے بعد سب سے اہم معرکہ جس میں دونوں فریقوں کا بہت نقصان ہوا ماردہ کا معرکہ ہے اس میں موسیٰ نے اہل ماردہ کو صلح کا پیغام دیا۔

اہل ماردہ سے صلح کا معاہدہ:

اس معرکہ میں مسلمانوں کو بڑا نقصان پہنچا تھا مگر ان کی ہمت پست نہ ہوئی۔ موسیٰ نے اہل ماردہ کو صلح کا پیغام دیا، وہ بھی مدافعت کرتے کرتے تھک چکے تھے۔ شوال ۹۴ھ میں موسیٰ مصالحانہ ماردہ میں داخل ہوگیا۔ اس مصالحت کی رو سے شہر کے باہر کے معرکہ میں جس قدر اہل ماردہ مارے گئے یا جو جلیقیہ بھاگ گئے تھے ان سب کا مال اور شہر کے کنیسوں کی کل دولت اور زیورات مسلمانوں کو ملے [۲]

---

[۱] نفح الطیب، ۱/۲۷۴

[۲] ایضاً، ۱/۱۲۶-۱۲۷

موسیٰ اور طارق کی مشترکہ مہمات اور صلح نامے:

موسیٰ نے ماردہ فتح کرنے کے بعد طلیطلہ کی طرف پیش قدمی کی۔ طلیطلہ پہنچ کر موسیٰ نے اندلس کے باقی حصوں پر فوج کشی کے انتظامات کیے اور طارق کو مقدمۃ الجیش کے طور پر شمالی اسپین کی سمت آگے روانہ کر دیا اور خود ان کے پیچھے پیچھے چلا۔ مقری کے مطابق:

اندلسیوں پر مسلمانوں کی اتنی ہیبت چھائی ہوئی تھی کہ ان کو کوئی روکنے والا نہ تھا۔ طارق جدھر رخ کرتا تھا فتح و کامرانی ہمرکاب چلتی تھی۔ اندلسی خود پیش قدمی کر کے مصالحت کرتے تھے وہ آگے آگے فتح کرتا جاتا تھا اور موسیٰ پیچھے پیچھے صلح ناموں اور معاہدوں کی تصدیق کرتا جاتا تھا[1]

موسیٰ ابھی شمالی اندلس میں ہی تھا کہ ولید کا حکم واپسی کے لیے پہنچ گیا۔ ۹۴ھ میں موسیٰ اپنے بیٹے عبدالعزیز کو اندلس میں اپنا نائب بنا کر شام چلا گیا۔

اندلس کے شاہی خاندان سے مسلمانوں کا حسن سلوک:

اندلس کی فتح کے بعد مسلمانوں نے خاندان شاہی کے ساتھ بڑا شریفانہ سلوک کیا۔ اندلس کے مختلف صوبوں میں آخری گاتھ فرمانروا وٹیزا کی جاگیریں تھیں جو اندلس کے انقلاب میں اس کے لڑکے المند، ارطباش اور رملہ کے ہاتھوں سے نکل گئی تھیں۔ انہوں نے طارق سے واگزاری کی درخواست کی اس نے موسیٰ سے سفارش کی، موسیٰ نے سفارشی خط دے کر انہیں ولید کے پاس شام بھیج دیا۔ ولید نے ان کی بڑی عزت و توقیر کی۔ انہیں آداب شاہی سے مستثنیٰ کر دیا اور جاگیروں کی واگزاری کا حکم لکھ کر اندلس واپس کر دیا۔ اور سب کی جاگیریں ان کو واپس مل گئیں اور انہوں نے اشبیلیہ، قرطبہ اور طلیطلہ میں جہاں یہ جاگیریں تھیں قیام کیا بعد کے خلفا بھی اس کا لحاظ کرتے تھے۔ ہشام کے زمانے میں المند کی موت کے بعد اس کے بھائی ارطباش نے اپنے نابالغ بھتیجوں کی جاگیر پر قبضہ کر لیا المند کی لڑکی سارہ دونوں بھائیوں کو لے کر شام گئی اور ہشام سے چچا کے ظلم کی فریاد کی، ہشام نے اسی وقت حنظلہ بن صفوان والی افریقہ کو حکم لکھ دیا کہ ان کے باپ کی جاگیر ارطباش کے قبضہ سے نکال کر بیٹوں میں ان کی میراث کے مطابق تقسیم کر دی جائے۔ ہشام سارہ کی شکل و صورت اور عقل و دانش سے بہت متاثر ہوا اور اس کی رضامندی سے اس کا عقد عیسیٰ بن مزاحم کے ساتھ کر دیا اس رشتہ سے اس خاندان کا تعلق عرب شرفاء سے قائم ہو گیا جس سے اسے بہت فائدہ پہنچا اور بعد کے تمام امراء و خلفاء اس کا لحاظ کرتے رہے۔ عبدالرحمن الداخل خاص طور سے سارہ کی بڑی عزت کرتا تھا اس کے لیے ہر وقت دربار میں آنے کی اجازت تھی[2]

ولید بن عبدالملک کے دور حکومت میں اندلس کی فتح مکمل ہوئی۔ مسلمانوں کے داخلے سے پہلے اور بعد کے حالات سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں نے مظلوم غیر مسلم طبقات کے ساتھ کس قدر اچھا سلوک کیا۔

---

[1] نفح الطیب، ۱/۱۲۸

[2] ایضاً، ۱/۱۶۴۔۱۶۵

مسلمانوں کے دور سے پہلے:

ایس پی سکاٹ کے مطابق ''اواخر صدی ہفتم اور اوائل صدی ہشتم کی تاریخ اسپین غیر معمولی طور پر ظلمات کے دھندلکے میں پھنسی ہوئی ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ اس میں سیاسی اور تمدنی مصائب ملک بھر پر بڑھے ہوئے تھے [۱] تمام دربار شاہی ایک ہی حمام میں تھے۔ عیش ونشاط اور شہوت رانی کا زور تھا۔[۲]

خود بطریق مداہنت عابدوں کا نمونہ بن گئے تھے اگر ان کی خانگی زندگی کو دیکھا جاتا تو کیا پادری اور کیا امراء عیوب اور گناہوں کا ڈھیر تھے۔[۳]

مزارعین کی حالت بالکل چوب مسجد کی تھی۔ وہ تمام عمر بلکہ اولاد در اولاد ایک ہی جاگیردار کے ہو رہتے تھے اور کہیں منتقل نہ ہو سکتے تھے۔ چھوٹے چھوٹے جرائم پر انہیں سخت سزائیں دی جاتی تھیں۔[۴]

غلاموں کا ایک جم غفیر تھا کہ باوجود اپنے آقاؤں کے چابکوں کے ابھی تک زمانہ آزادی کی روایت کو نہیں بھولے اور ایک ذرہ سی تحریک پر بلوہ کرنے پر تیار تھے اور اس دن کا بے صبری سے انتظار کر رہے تھے کہ جس دن ان کو آزادی کامل ہو جائے۔[۵]

یہودیوں کی حالت:

مزارعین اور غلاموں کے علاوہ ایک اور فرقہ تھا جس کی تعداد دونوں سے کم تھی۔ لیکن از روئے اصل ونسل واز روئے قانون وہ دوامی غلام تھے۔ اتنی بات ان میں زیادہ تھی کہ وہ دونوں سے زیادہ عقیل وفہیم اور ہوشیاری اور چالاکی میں بڑھے ہوئے تھے۔ یہ فرقہ یہودیوں کا تھا۔ سترھویں دینی کونسل کے ایک حکم ناحق کے موافق ان کی تمام جائیدادیں ضبط کر لی گئی تھیں اور ان کو بامشقت غلامی کی سزا دی گئی تھی۔

لیبان نے مسلمانوں کے داخلہ سے پہلے اسپین کی حالت کا یہ نقشہ کھینچا ہے۔ عربوں کی فوج کشی کے زمانہ میں گاتھ اور اطالیہ کی اقوام کا باہمی میل جول امراء ہی میں ہوتا تھا اور عامہ خلائق غلامی کی حالت میں تھی۔ اندلس میں مسلمانوں کے داخلے کے بعد حالات کا نقشہ ایس پی سکاٹ کے مطابق یہ ہے:

فاتحین (مسلمانوں) نے پرانے زمانے کے قوانین کا احترام قائم رکھا۔ صرف فرق اتنا ہوا کہ اس کے دستور العمل اپنے قوانین کے تابع کر دیے۔ مفتوحین پر وہی قانون قابل نفاذ تھا مگر اسی حد تک کہ شرع اسلام کے خلاف نہ پڑے۔ اپنے عدل وانصاف

---

[۱] اخبار الاندلس، ۲۰۳/۱

[۲] ایضاً، ۲۰۸/۱

[۳] ایضاً، ۱۹۸/۱

[۴] ایضاً، ۱۹۹/۱

[۵] ایضاً، ۲۱۲/۱

مساحت و مراسم خروانہ سے اس نئی سلطنت نے بہت ہی جلد دلوں میں گھر کر لیا۔ یہودی خوشحال ہو گئے عیسائی اپنے تعصبات مذہبی بھول گئے۔ غلاموں نے وہ کلمہ پڑھ لیا جس سے انکا داغ غلامی ہمیشہ کے لیے مٹ گیا اور وہ بادشاہوں کے مساوی ہو گئے۔[1]

ذمیوں کی حفاظت کا جو وعدہ کیا گیا تھا اس کا ایفاء کیا گیا۔ جائیداد اور مذہبی آزادی کا جو عہد کیا گیا تھا وہ بہر حال پورا کیا۔ عوام الناس تو اس سے بہت خوش تھے اگر ناراض تھے تو وہ مذہبی دیوانے جنہوں نے ایسے فیاض اور سخاوت شعار دشمنوں کو گالیاں دیں حالانکہ ان کی مراعات سے وہ فائدہ اٹھاتے تھے اور انہی کا نمک کھاتے تھے۔[2]

مختصر یہ کہ ولید کا دور بنو امیہ کا سنہری دور ہے جس میں اندرونی لڑائیاں ختم ہو چکی تھیں ملک میں خوشحالی تھی اور خوب فتوحات ہوئیں۔ مفتوحہ علاقوں میں بھی مخلوق خدا کو ظالم حکمرانوں سے نجات ملی اور شرف انسانیت کی پاسداری ہوئی اور علوم وفنون میں ترقی ہوئی۔ لیبان رقمطراز ہے:

فتوحات سے فارغ ہونے کے بعد ہی عربوں نے ترقی شروع کر دی۔ ایک صدی کے اندر اندر غیر مزروعہ زمینیں کاشت ہونے لگیں، اجاڑ بستیاں آباد ہو گئیں۔ بڑی بڑی عمارتیں بن گئیں اور دوسری اقوام سے تجارتی تعلقات قائم ہو گئے اس کے بعد ہی عربوں نے علوم وادب کی طرف توجہ کی اور یونانی اور لاطینی کتابوں کے ترجمے کرائے اور دارالعلوم قائم کیے جو مدت تک یورپ میں علم کی روشنی پھیلاتے رہے۔[3]

---

[1] اخبار الاندلس، ص ۲۸۵

[2] ایضاً، ص ۲۵۷

[3] ڈاکٹر گستاولی بان، تمدن عرب، علی بلگرامی (مترجم) مقبول اکیڈمی، لاہور، س ن، ص ۲۴۷

سلیمان بن عبدالملک (۹۶ھ تا ۹۹ھ)

سلیمان بن عبدالملک ولید کا حقیقی بھائی تھا۔ خود عبدالملک اسے ولید کے بعد ولی عہد بنا گیا تھا اس لیے اس کی وفات کے بعد جمادی الثانی ۹۶ھ میں تخت نشین ہوا۔ سلیمان فطرتاً صالح وسعید تھا اس کی تخت نشینی کے ساتھ ہی اموی حکومت کی سیاست بدل گئی۔ ابن اثیر لکھتے ہیں:

حضرت عمر بن عبدالعزیز اس کے مشیر تھے اس لیے عملی طور پر بھی اس کے محاسن کا ظہور ہوا۔ چنانچہ تخت نشینی کے ساتھ ہی ولید کے دور کے تمام قیدیوں کو جو ناحق قید کیے گئے تھے، رہا کر دیا اور جیل خانے بالکل خالی ہو گئے۔[1]

ولید کے دور میں ہی حجاج کا انتقال ہو چکا تھا البتہ اس کے ماتحت حکام موجود تھے۔ سلیمان نے ان کا مواخذہ اور حجاج کے دور کے مظالم کی تلافی کی بھی کوشش کی۔ یعقوبی کے مطابق:

حجاج کا انتقال ولید ہی کے دور میں ہو چکا تھا البتہ اس کے ماتحت حکام اور تحیہ باقی تھے چنانچہ جب اس نے حجاج کے زمانہ کے مظالم کی اصلاح وتلافی کی طرف توجہ کی تو اس کے ماتحت حکام کی دارو گیر شروع ہوئی۔[2]

سلیمان نے حجاج کی عجمیوں سے نفرت کی پالیسی کو بھی بدلا اور عجمی نومسلموں کو بھی اہمیت دی۔ سلیمان میں انتقام کا مادہ بھی بہت تھا اس نے حجاج اور اس کے ماتحت حکام جو ظالم اور مطلق العنان تھے ان میں سے جو موجود پائے ان کو اپنے انتقام کا نشانہ بنایا اور اس میں اتنی شدت برتی کہ اچھے اور برے عمال میں بھی امتیاز نہ کیا اور محمد بن قاسم اور موسیٰ بن نصیر بھی اس کے عتاب کا شکار ہوئے۔

عمر بن عبدالعزیز کو اپنا جانشین مقرر کرنا اس کا ایک بہت بڑا کارنامہ ہے۔

---

[1] تاریخ ابن اثیر، ۱۴/۵

[2] تاریخ یعقوبی، ۳۵۴/۲

حضرت عمر بن عبدالعزیز (۹۹ھ تا ۱۰۱ھ)

سلیمان کی وفات کے بعد صفر ۹۹ھ میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ تخت نشین ہوئے۔ آپ مشہور اموی فرمانروا مروان بن حکم کے پوتے تھے۔ باپ کا نام عبدالعزیز تھا۔ آپ کی ماں ام عاصم حضرت عمر کی پوتی تھیں۔ اس لیے آپ کی رگوں میں فاروقی خون بھی شامل تھا۔[۱]

حضرت عمر بن عبدالعزیز کا دور خلافت راشدہ کے دور کی صحیح عکاسی کرتا ہے۔ آپ نے اپنے پیشرو اموی حکمرانوں کی تمام غلط روایات ختم کر دیں اور ان کے دور میں پیدا شدہ عربی عجمی کشمکش کو ختم کر کے بالکل اسلامی عدل و انصاف پر مبنی رویے کو فروغ دیا اور غیر مسلموں کے حقوق کی پاسداری میں یہاں تک گئے کہ آپ کے انتقال پر مسلمانوں سے زیادہ غیر مسلموں نے آنسو بہائے۔

اکبر شاہ نجیب آبادی کے بقول:

راہبوں نے آپ کے مرنے کی خبر سن کر اپنے صومعوں اور عبادت خانوں میں سر پیٹ لیے اور کہا کہ آج دنیا سے عدل اٹھ گیا اور عدل کا قائم کرنے والا اور عدل کی حفاظت کرنے والا دنیا کو خالی کر گیا۔[۲]

عمر بن عبدالعزیز اور غیر مسلموں سے تعلقات و معاہدات:

آپ کو اپنی غیر مسلم رعایا کی فلاح و بہبود کا اس قدر خیال تھا کہ اکثر اپنے عمال کو ان کے حقوق کی پاسداری کے احکامات جاری کرتے رہتے تھے۔ اپنے ایک عامل عدی بن ارطاۃ کو لکھتے ہیں:

فانظر الی اهل الذمة فارفق بهم و اذا کبر رجل لیس له مال فانفق علیه فان کان حمیم فمر حمیمه ینفق علیه قاصه من جراحه ...... [۳]

''ذمیوں کا خیال رکھو ان کے ساتھ نرمی برتو جو بوڑھا اور نادار ہو جائے تو اس پر مال خرچ کرو۔ اگر اس کا کوئی عزیز (صاحب حیثیت) ہو تو اسے اس کی کفالت کا حکم دو (ورنہ بیت المال سے اس کی کفالت کرو) اس کے زخم کا قصاص لو جس طرح تمہارا کوئی غلام بوڑھا ہو جائے تو اسے یا تو آزاد کرتے ہو یا مرتے دم تک اس کی کفالت کرتے ہو۔''

آپ کے دور میں بیت المال کو عوام کی امانت سمجھا جاتا تھا اور اس سے مسلم اور غیر مسلم دونوں کو فائدہ پہنچایا جاتا تھا۔ آپ نے کوفہ کے گورنر زید بن عبدالرحمٰن کو یوں لکھا:

۱۔ ندوی، معین الدین۔ تاریخ اسلام، مکتبہ رحمانیہ لاہور، ۲/۵۱۳

۲۔ نجیب اکبر آبادی، تاریخ اسلام، اسلامی اکادمی لاہور، ۲/۲۳۴

۳۔ طبقات ابن سعد، ۵/۳۸۰

''تم نے لکھا ہے کہ لشکر کے وظائف ادا کرنے کے بعد بھی تمہارے پاس بہت سا مال جمع ہے ایسا کرو کہ جس شخص کے ذمہ قرض ہو بشرطیکہ وہ اس کی غلط کاری کا نتیجہ نہ ہو تو اس کا قرض ادا کردو۔ جو شخص (مہر کی ادائیگی پر) قادر نہیں اس کی شادی (بیت المال سے مہر ادا کر کے) کردو۔ ذمیوں کو مضبوط کردو وہ ہمیں ایک دو سال کے لیے ہی مطلوب نہیں (بلکہ ان کا ہمارا ہمیشہ کا ساتھ ہے)۔''[1]

آپ نے ایک مرتبہ ایک عیسائی بطریق کو ایک ہزار دینار عطا کیے۔ ابن ابی سبرہ سے مروی ہے کہ عمر بن عبدالعزیز نے ایک عیسائی بطریق کو ایک ہزار دینار دیے۔[2]

انه اعطى بطريقا الف دينارا استالفه على الاسلام[2]

آپ نے اپنے دور خلافت میں قیدیوں کی ضروریات کا خیال رکھا اور بلاتمیز مسلم و غیر مسلم سب کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید فرمائی۔ موسیٰ بن عبید سے مروی ہے کہ عمر بن عبدالعزیز نے حکام کو لکھا:

كتب عمر بن عبدالعزيز ان ينظر في امر السجون ويستوثق من اهل الدعارات وكتب لهم برزق الصيف والشتاء[3]

''عمر بن عبدالعزیز نے لکھا کہ قیدیوں کے بارے میں غور کیا جائے خطرناک لوگوں سے ضمانت لی جائے اور آپ نے قیدیوں کے لیے گرمی و سردی کی خوراک کے متعلق لکھا۔''

آپ نے اپنی رعایا میں سے اگر کوئی مسلم یا غیر مسلم کسی دشمن کے ہاتھ قید ہو جاتا تو اس کی رہائی کے لیے کوشش فرماتے تھے اور قومی خزانہ سے ان کا فدیہ ادا کرتے تھے۔ ربیعہ بن عطا نے بتلایا کہ:

كتب عمر بن عبدالعزيز معي و بعث بمال الى ساحل عدن ان افتدى الرجل المراة والعبد والذمي[4]

''عمر بن عبدالعزیز نے میرے ساتھ اپنا فرمان اور مال ساحل عدن کو بھیجا تاکہ میں (وہاں پر دشمن کے ہاتھوں قید) مرد و عورت اور غلام و ذمی کا فدیہ ادا کر کے انہیں آزاد کراؤں۔''

ذمیوں اور معاہدین کی دادرسی:

آپ کے دور حکومت میں ذمیوں اور تمام معاہدین کے جان و مال کو مکمل تحفظ حاصل تھا۔ اگر کسی سے ان کے حقوق کی حق تلفی یا کسی قسم کی زیادتی نوٹس میں آتی تو اسے ضرور سزا دی جاتی تھی۔

---

[1] عبداللہ بن عبدالحکم، سیرت عمر بن عبدالعزیز (مترجم یوسف لدھیانوی) کراچی: مکتبہ لدھیانوی، ۱۹۹۶ء، ص ۱۲۵

[2] طبقات ابن سعد، ۳۵۰/۵

[3] ایضاً، ۳۷۸/۵

[4] ایضاً، ۳۵۲/۵

ایک مرتبہ ربیعہ شعوذی نامی ایک اہل کار نے سرکاری کام کے لیے ایک نبطی کا گھوڑا بیگار میں پکڑا آپ کو معلوم ہوا تو آپ نے اس سے باز پرس کی اور سزا کے طور پر چالیس کوڑے اسے لگوائے۔ خود ربیعہ بتاتے ہیں کہ ان کی باز پرس پر میں نے بتایا کہ میں ایک نبطی کی بیگار کی سواری پر آیا ہوں۔

قلت علی السخرة دواب النبط، قال تسخرون فی سلطانی؟ قال: فامربی فضربت اربعین سوطاً[1]

''آپ نے فرمایا میرے دورِ حکومت میں بھی تو بیگار لیتا ہے۔ پھر مجھے چالیس کوڑے لگائے گئے۔''

آپ کو معاہدین کے حقوق کا اس قدر خیال تھا کہ لشکروں کو بھیجتے وقت یہ تاکید فرماتے تھے:

جن بستیوں سے ہماری صلح ہے ان سے اپنا پڑاؤ الگ رکھیں۔ ایسی بستیوں میں ان کے رفقاء میں سے کوئی داخل نہ ہو۔ البتہ جن لوگوں کے دین وامان پر وثوق ہو وہ ضروریات زندگی کی خرید کے لیے بازار بھیجے جائیں اور وہاں کسی ظلم کا ارتکاب نہ کریں کسی گناہ کا توشہ نہ باندھیں اور وہاں کے کسی شخص کو ایذا نہ پہنچائیں۔[2]

آپ نے اپنے عہد خلافت سے پہلے کی شکایات کا بھی ازالہ کیا اور جن لوگوں کے حقوق غصب کیے گئے تھے ان سب کا بلا امتیاز مسلم وغیر مسلم ازالہ کیا۔ ایک غیر مسلم شہری نے اموی شہزادے عباس بن ولید کے خلاف دعویٰ کیا کہ اس نے میری زمین غصب کر لی ہے۔ شہزادہ عباس خلیفہ کے پاس بیٹھا تھا خلیفہ نے اس سے جواب طلب کیا۔ عباس نے کہا امیر المومنین ولید نے مجھے اس کے متعلق فرمان لکھ دیا تھا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے فرمایا اللہ کا فرمان ولید کے فرمان سے زیادہ ماننے کے قابل ہے اور حکم دیا کہ زمین اسے واپس کر دی جائے۔[3]

ابوبکر بن محمد کہتے ہیں:

کتب الی عمر بن عبدالعزیز ان ستبری الدواوین، فانظر الی کل جور جاره من قبلی من حق مسلم او معاهد فرده الیه.[4]

''عمر بن عبدالعزیز نے مجھے لکھا کہ دفاتر کو حقوق کے بارے آزاد کرو مجھ سے پہلے کسی مسلم یا معاہد (غیر مسلم شہری) پر ظلم ہوا ہے دیکھو اور اسے اس کا حق لوٹا دو۔''

آپ مسلموں اور غیر مسلموں کی مراعات میں تفریق کو بھی روا نہ رکھتے تھے۔ آپ کے ایک عامل نے ذمیوں کے کھلیانوں کی حد بندی کی تو اس کو لکھا کہ ''ایسا نہ کرو یہ حجاج کا طریقہ ہے اور میں اس کو پسند نہیں کرتا۔''[5]

---

[1] طبقات ابن سعد، ۳۵۳/۵

[2] محولہ بالا، ص ۴۷

[3] میرٹھی، زین العابدین، تاریخ ملت، کراچی، دار الاشاعت ۲۰۰۲ء، ص ۴۱۰

[4] طبقات ابن سعد، ۳۴۴/۵

[5] ندوی، عبدالسلام۔ سیرت عمر بن عبدالعزیز، کراچی، دار الاشاعت، ص ۱۹۴

آپ کے ایک عامل کو لکڑی کی ضرورت پڑی جو کسی ذمی کے یہاں تھی۔ اس نے آپ سے مشورہ کیا۔ آپ نے لکھا کہ پوری قیمت سے لے لو۔[1]

آپ نے عرب کے موالی کی تفریق کو ختم کر کے وظیفہ، اعانت اور عطا میں سب کو برابر کر دیا تھا۔ آپ کے پاس ایک غیر مسلم شہری نے کسی مسلمان کے مقابلے میں حق شفعہ کا مقدمہ پیش کیا۔ آپ نے تحقیق کے بعد اسی کے حق میں فیصلہ دیا قیس بن خالد الحزاء بتاتے ہیں کہ:

انه قضى بلذمی بشفعته[2]

"آپ نے ذمی کے حق میں شفعہ کا فیصلہ فرمایا۔"

آپ کے دور خلافت میں حیرہ کے ایک مسلمان نے کسی ذمی کو قتل کر دیا جس سے آپ نے قصاص لیا۔ معمر بن عمرو بن میمون بن مہران بتاتے ہیں کہ:

شهدت كتاب عمر بن عبدالعزيز قدم الى امير الحيره او قال امير الجزيره فى رجل مسلم قتل رجلا من اهل الذمه ان ادفعه الى وليه فان شاء قتله و ان شاء عفا عنه قال. فدفعه اليه فضرب عنقه و انا انظر.[3]

"عمر بن عبدالعزیز نے حیرہ رجزیرہ کے امیر کو لکھا کہ ذمی کے مسلم قاتل کو مقتول کے ولی کے حوالے کرے تاکہ چاہے تو وہ اسے قتل کر دے یا چاہے تو معاف کر دے۔ امیر نے قاتل کو اس کے حوالے کیا اور اس نے اس کی میرے سامنے گردن ماردی۔"

غیر مسلموں کے مذہبی حقوق اور عمر بن عبدالعزیز:

آپ نے اپنے دور حکومت میں غیر مسلموں کو مکمل مذہبی آزادی دی اور ان کے عبادت خانوں کا تحفظ یقینی بنایا۔ آپ کے عہد میں غیر مسلموں کو اپنے عقیدے کے مطابق شراب نوشی، سور کا گوشت کھانے، اپنی محرمات سے ازدواجی تعلق قائم کرنے اور شرک وبت پرستی وغیرہ تک کی اجازت تھی۔

محرمات سے نکاح اور شراب وسور کے حوالے سے خلفاء راشدین کا موقف جاننے کے لیے آپ نے حسن بصری سے استفسار کیا۔ حضرت حسن بصری نے جو جواب دیا وہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ غیر مسلم اپنے مذہب کے معاملے میں خلفاء راشدین اور پھر حضرت عمر بن عبدالعزیز کے دور میں بالکل آزاد تھے۔

---

[1] ندوی، عبدالسلام۔ سیرت عمر بن عبدالعزیز، کراچی، دارالاشاعت، ص ۱۹۲

[2] طبقات ابن سعد، الطبقات الکبریٰ، ۳۷۵/۵

[3] الزیلعی، عبداللہ بن یوسف، نصب الرایہ، کتاب الجنایات، باب ما یوجب القصاص، پشاور، مکتبہ حقانیہ، ۹۰/۵

حضرت حسن بصری نے فرمایا:

انما بذلوا الجزیہ لیترکوا و ما یعتقدون و انما انت متبع و لیس لمبتدع[1]

''انہوں نے جزیہ دینا اس لیے قبول کیا ہے کہ انہیں ان کے عقیدے کے مطابق زندگی گزارنے دی جائے آپ کا کام اتباع کرنا ہے نہ کہ کوئی نیا طریقہ ایجاد کرنا ہے۔''

امام ابو یوسف نے حضرت حسن بصری کا یہ جواب یوں نقل کیا ہے:

فاخبره ان رسول الله ﷺ قد قبل من مجوس اهل البحرین الجزیة و اقرهم علی مجوسیتهم و اقرهم عامل رسول الله ﷺ العلا بن حضرمی ثم اقرهم ابوبکر ثم اقرهم عمر بعد ابوبکر و اقرهم عثمان بعد عمر[2]

''رسول اللہ ﷺ نے بحرین کے مجوس سے جزیہ قبول فرمایا اور انہیں مجوسیت پر برقرار رکھا (جس میں محرمات کے ساتھ نکاح بھی شامل تھا) اور آپ کے عامل حضرت علا بن حضرمی نے بھی انہیں اسی پر قائم رکھا۔ پھر ابوبکر صدیق نے انہیں اسی پر قائم رہنے دیا پھر حضرت عمر نے انہیں اسی پر برقرار رکھا اس کے بعد حضرت عثمان نے انہیں اسی طرح برقرار رکھا۔''

حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اس وضاحتی بیان کے مطابق غیر مسلموں کو مذہبی آزادی دے رکھی تھی۔

مذہبی عبادت گاہوں سے متعلق معاہدات کی پابندی:

آپ نے اپنے ایک اہل کار عبدالرحمٰن بن نعیم کو لکھا:

لا تهدموا کنیسة ولا بیعة ولا بیت نار ......[3]

''کسی ایسے گرجے، یہودیوں کی خانقاہ اور آتش کدے کو منہدم نہ کرنا جس کا صلح نامے میں وعدہ ہو مگر انہیں (مسلم آبادی کے علاقوں میں) نئے معبد بھی نہ بنانے دینا۔''

ایک مسلمان نے ایک گرجے کی نسبت دعویٰ کیا کہ وہ اس کی جاگیر میں ہے۔ آپ نے فرمایا کہ ''اگر یہ عیسائیوں کے معاہدے میں داخل ہے تو تم اس کو نہیں پا سکتے۔''[4]

دمشق میں ایک اور گرجا کافی عرصہ سے ایک مسلمان خاندان کی جاگیر میں چلا آتا تھا۔ عیسائیوں نے آپ کے پاس دعویٰ کیا تو آپ نے انہیں واپس دلوایا۔ ایک اور کنیسہ جو کسی حاکم نے بنی نصر کو جاگیر میں دیا تھا آپ کے پاس اس کا مقدمہ پیش کیا گیا تو

---

[1] المصوط، ۳۹/۵

[2] کتاب الخراج، ص ۲۶۸

[3] تاریخ طبری، ۳۲۴/۵

[4] فتوح البلدان، ص ۱۸۸

آپ نے نصاریٰ کے حق میں بنی نصر کو اس کنیسہ سے بے دخل کر دیا۔[1]

عمر بن عبدالعزیز سے پہلے خلیفہ ولید بن عبدالملک نے دمشق میں جامع مسجد سے متصل ایک گرجے کو مسجد میں شامل کر دیا تھا۔ آپ کے دور خلافت میں عیسائیوں نے آپ سے اس کی شکایت کی تو آپ نے حکم دیا کہ مسجد میں جو اضافہ کیا گیا ہے وہ حصہ نصاریٰ کو واپس کر دیا جائے۔ اس پر مسلم علماء نے نصاریٰ کو پیش کش کی تمہیں الغوطہ کے تمام فتح شدہ گرجے واپس کیے جاتے ہیں بشرطیکہ تم اس گرجا سے دست بردار ہو جاؤ۔ نصاریٰ نے اسے قبول کیا تو تب عمر بن عبدالعزیز نے اس تصفیہ کے نفاذ کا حکم دیا۔[2]

خراج و جذیہ سے متعلق معاہدوں میں ترامیم:

نجران کے نصاریٰ پر حجاج بن یوسف نے ابن الاشعث کی بغاوت میں معاونت کے الزام میں جرمانے کے طور پر اٹھارہ سو منقش حلوں کا جزیہ لگا دیا تھا۔ جب عمر بن عبدالعزیز خلیفہ بنے تو ان لوگوں نے آ کر شکایت کی کہ ہم برباد ہوتے جاتے ہیں۔ ہماری تعداد روز بروز گھٹ رہی ہے۔ عرب (اہل کار) ہم پر چھاپے مارتے ہیں انہوں نے ہم پر اتنا بار ڈال دیا ہے جو ہماری برداشت سے زیادہ ہے اور حجاج نے ہم پر بہت مظالم کیے ہیں۔ عمر بن عبدالعزیز نے ان کی مردم شماری کرنے کا حکم دیا۔ یہ معلوم ہونے پر کہ واقعی یہ لوگ اپنی اصل تعداد سے دسواں حصہ رہ گئے ہیں، فرمایا میری رائے میں (ان کے ساتھ) صلح نفری جزیہ پر ہوئی تھی زمین کے حساب سے نہیں ہوئی تھی۔ آپ نے ان پر آٹھ ہزار درہم قیمت کے صرف دو سو حلے مقرر کر دیے۔ ایسا کرنے سے اگرچہ بیت المال کی آمدنی کم ہوگئی مگر ذمیوں کی ناحق بار سے گلو خلاصی ہوگئی۔[3]

اہل قبرص سے حضرت معاویہ کے زمانے میں سات ہزار دو سو دینار سالانہ پر مصالحت ہوئی تھی وہ اسی صلح پر قائم تھے۔ عبدالملک بن مروان نے اپنے دور حکومت میں ان کے خراج میں ایک ہزار دینار کا اضافہ کر دیا تھا جو عمر بن عبدالعزیز کے خلیفہ ہونے تک لیا جاتا تھا۔ آپ نے اس اضافہ کو ان پر سے ساقط کر دیا۔[4]

ظالمانہ تاوانوں کا خاتمہ:

آپ نے تمام صوبوں کے عمال کے نام حسب ذیل فرمان جاری کیا کہ "میرا یہ خط زمین والوں (ذمیوں) کو پڑھ کر سنا دو کہ اللہ تعالیٰ نے امیر المومنین کی وساطت سے وہ تمام ظالمانہ تاوان ان سے موقوف کر دیے ہیں جو ان سے وصول کیے جاتے تھے۔ جن کی تفصیل یہ ہے نوروز اور مہرجان کے تحائف سرکاری خطوط اور قاصدوں کے اخراجات، پیغام رسانوں کے انعامات، رؤسا کے نذرانے، حکام کا سفر خرچ اور ان کی ضیافت، غلہ کے نرخوں میں توازن پیدا کرنے کے لیے دراہم کی کٹوتی اور پیمانوں کے توازن کی کٹوتی جو ان سے وصول کی جاتی تھی۔ انہیں چاہیے کہ اس پر اللہ رب العزت کا شکریہ ادا کریں۔[5]

---

[1] فتوح البلدان، ص ۱۸۹

[2] ایضاً، ص ۱۹۰

[3] ایضاً، ص ۱۱۲

[4] ایضاً، ص ۲۲۹

[5] سیرت عمر بن عبدالعزیز، ص ۱۷۶

آپ سے پہلے خلفاء بنوامیہ کے دور میں عراق کا صوبہ طائف الملوکی کا شکار رہا تھا۔ وہاں شیعان علی کی سرگرمیوں کی وجہ سے حکام اہل عراق سے نالاں رہتے تھے اور وہاں کے مسلم عوام کے ساتھ ساتھ غیر مسلم عوام کے ساتھ بھی معاندانہ رویہ رکھتے تھے کیونکہ وہ انہیں بھی اموی حکومت کے خلاف سازشوں میں شامل سمجھتے تھے۔ اس لیے نفاذ خراج و جزیہ میں ان کے ساتھ سختی کا برتاؤ کرتے تھے اور نومسلموں تک سے جزیہ وصول کرتے تھے۔

عمر بن عبدالعزیز کے ہاں ان مسائل کا حل عدل و انصاف میں ہی تھا۔ اس لیے آپ نے عراق کے شہر کوفہ کے حاکم عبدالحمید کو لکھا:

فخذ منه ما اطاق و اصلحه حتی یعمر و لا یوخذ من العامر الا وظیفة الخراج فی رفق و تسکین لاهل الارض ولا تاخذن فی الخراج الا وزن سبعة ......[۱]

”خراج صرف زیر کاشت زمین سے وصول کرنا وہ بھی نرمی اور دلجوئی سے اس طرح پر کہ کاشت کار خوش رہیں۔ خراج میں پیداوار کا ساتواں حصہ وصول کرنا جس کے لیے (رقم متعین کرنے کا) کوئی ضابطہ نہیں ہے۔ لگان مقرر کرنے والے اور وصول کرنے والے عملے کا معاوضہ نہ لینا اور نہ نیروز اور مہرجان کا نذرانہ وصول کرنا نہ خطوط اور پالکی لے جانے والوں کی اجرت لینا۔ نہ مکانات کا کرایہ اور نکاح پڑھانے کے دراہم لینا اور نہ نومسلموں سے جزیہ وصول کرنا۔“

آپ نے نومسلموں سے جزیہ موقوف کرانے کے احکام جاری کیے۔ بیت المال کی آمدنی بڑھانے کے لیے حجاج نے نومسلموں سے بھی جزیہ وصول کرنا شروع کر دیا تھا۔ آپ نے اسے بالکل بند کرا دیا اور ایک عام حکم جاری کر دیا کہ جو لوگ مسلمان ہو جائیں ان کا جزیہ چھوڑ دیا جائے۔ اس حکم پر تنہا مصر میں اتنے آدمی مسلمان ہوئے کہ جزیہ کی آمدنی گھٹ گئی۔ حیان بن شریح نے عمر بن عبدالعزیز کو لکھ بھیجا کہ ”اس حکم کی وجہ سے اس کثرت سے لوگ مسلمان ہوئے ہیں کہ آمدنی گھٹ گئی ہے اور مجھے قرض لے کر مسلمانوں کو وظیفے دینے پڑے۔“ آپ نے اس کے جواب میں لکھا کہ ”جزیہ بہرحال موقوف کرو، رسول اللہ ﷺ ہادی بنا کر بھیجے گئے تھے تحصیل دار بنا کر نہیں۔“[۲]

مذکورہ حقائق کی روشنی میں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ عمر بن عبدالعزیز شریعت اسلامی کے کامل پیروکار تھے۔ آپ نے مکمل اسلامی تعلیمات کے مطابق غیر مسلموں کو تمام انسانی حقوق عطا کیے اور ان پر ہونے والی تمام کوتاہیوں اور زیادتیوں کو ختم کروا دیا بلکہ ان کی تلافی کر دی جو ان کے پیشرو اموی حکمرانوں سے سرزد ہوئی تھیں۔

صرف چند پابندیاں جو انتظامی امور سے متعلق تھیں مثلاً شراب اور سور کو مسلم آبادی میں نہ لانا اور مسلمانوں کی سی ہیئت اختیار نہ کرنا اور اسلحہ نہ رکھنا۔ ان کے علاوہ کوئی بے جا پابندی ان پر نہ تھی۔ قیام عدل و انصاف میں مسلم اور غیر مسلم کا کوئی فرق روا نہ رکھا جاتا تھا۔ ان کے جان و مال محفوظ تھے اور اپنی زمین و جائیداد پر انہیں مکمل حق ملکیت حاصل تھا۔

۱۔ تاریخ طبری، ۳۲۱/۵

۲۔ الخطط مقریزیہ، ۱۲۵/۲

باب ششم

عصر حاضر میں غیر مسلموں سے تعلقات و معاہدات اور اسلامی تعلیمات

فصل اول

۱۔ قرآن وسنت کی روشنی میں عصر حاضر کے غیر مسلموں سے تعلقات

۲۔ عالمی معاہدات کی شرعی حیثیت

فصل دوم

۱۔ جدید عالمی نظام اور اس کے عالم اسلام پر اثرات

۲۔ پرامن بقائے باہمی پر مشتمل جدید عالمی نظام کی ضرورت

فصل اول

قرآن وسنت کی روشنی میں عصر حاضر کے غیر مسلموں سے تعلقات

اسلام کی تعلیمات قرآن وسنت کی شکل میں قیامت تک آنے والے تمام انسانوں کے لیے راہنما اصولوں کا درجہ رکھتی ہیں۔ مسلمانوں کے دور عروج میں مسلم فقہاء نے اسلامی نقطہ نظر سے مختلف ممالک اور اقوام کی حیثیت واضح کرنے کے لیے دارالاسلام، دارالحرب اور دارالامن کی اصطلاحات وضع کیں۔ ان کے نزدیک دارالاسلام وہ ہے جہاں اسلامی احکام نافذ ہوں اور مسلمان امن وامان کی زندگی گزار رہے ہوں اور مسلمان ہونے کی وجہ سے انہیں کسی قسم کا خوف اور خطرہ لاحق نہ ہو۔

دارالحرب وہ ہے جہاں کفر وشرک کا غلبہ اور احکام کفر وشرک جاری ہوں۔ دارالاسلام اور دارالحرب کے درمیان اگر امن کا معاہدہ ہو تو وہ دارالامن ہوگا۔

ان سب حالتوں کے ان کے ہاں مختلف احکام ہیں۔

موجودہ صورت حال کے حوالے مولانا جلال الدین عمری لکھتے ہیں کہ موجودہ صورت حال یہ ہے کہ دنیا کا کوئی ملک اس وقت دارالاسلام ہونے اور اس کے مکمل تقاضے پورے کرنے کا دعویٰ نہیں کر رہا ہے۔ اسی طرح اس نے کسی ملک کو دارالحرب قرار دے کر اس سے اعلان جنگ بھی نہیں کیا ہے۔ دنیا کے بیشتر ممالک اس وقت بین الاقوامی معاہدوں میں بندھے ہوئے ہیں۔ مسلم دنیا کے تقریباً تمام ممالک اس وقت جمہوری طرز حکومت اپنانے کے دعوے دار ہیں۔ مسلم اور غیر مسلم ایک دوسرے کے ملک میں ایک بڑی تعداد میں رہ رہے ہیں۔

مسلم ممالک کی یہ شرعی ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ غیر مسلموں کے بنیادی حقوق کی حفاظت کریں ان کی حدود میں انہیں عقیدے اور مذہب کی مکمل آزادی ہو۔ انہیں ترقی کے مواقع فراہم ہوں اور ان پر کسی قسم کا ظلم اور زیادتی از روئے دستور ممنوع ہو۔

تمام جمہوری غیر اسلامی ممالک میں مسلمانوں کو جان ومال کا تحفظ اور عقیدے اور عبادات کی آزادی میسر ہے وہ اپنا نظام زکوٰۃ چلا سکتے ہیں حج کر سکتے ہیں، عائلی قوانین نکاح، طلاق، وراثت، وقف اور ہبہ جیسے معاملات میں ان پر اسلامی قانون ہی نافذ العمل ہوتا ہے مزید برآں انہیں اپنے دین کی تبلیغ کی بھی اجازت وآزادی حاصل ہے۔

لہٰذا یہ صورت حال دارالحرب یا دارالاسلام کی سی نہیں ہے کسی جمہوری ملک کو نہ تو دارالاسلام کہا جا سکتا ہے اور نہ ہی اس پر دارالحرب کا اطلاق ہوتا ہے۔ دارالاسلام کی طرح یہاں غیر مسلموں کے حقوق کا سوال پیدا نہیں ہوتا کیونکہ از روئے دستور ہی انہیں بنیادی حقوق حاصل ہوتے ہیں یہاں ان سے تعلقات کی نوعیت حربیوں کی سی بھی نہ ہوگی بلکہ اسلام کی جامع تعلیمات کے مطابق مسلمان ان سے اپنا سماجی معاشی معاشرتی اور مذہبی رویہ رکھنے کے پابند ہوں گے۔

جمہوری غیر اسلامی ممالک جہاں پر غیر مسلموں کی حکومت ہو وہاں پر مسلمان اسے ایک آزاد دعوتی ملک کے طور پر لیتے ہوئے اپنی اسلامی دعوت وتبلیغ کا کام اسلامی دعوتی اصولوں کے ساتھ دے کر ابلاغ دین کا فریضہ احسن طریقے سے ادا کر سکتے ہیں۔

اسی طرح ایسے تمام ممالک کے مسلم اور غیر مسلم باہم تعلقات رکھ سکتے ہیں [1]

البتہ موجودہ صورت حال میں اگر کوئی ملک دوسرے اسلامی ملک پر جارحانہ لشکر کشی کرے تو اس سے بہر طور حربی غیر مسلم ملک کے تمام اسلامی تعلیمات کی روشنی میں برتاؤ کیا جائے گا اور اس ملک میں موجود مسلمانوں کو موجودہ حالات میں مناسب راہنمائی قرآن وسنت اور اجتہاد کی بنیاد پر فراہم کی جاسکتی ہے۔ اور اس ملک کے خاصمانہ رویے کے خلاف عالمی رائے عامہ اور اداروں کو بھی حرکت میں لایا جاسکتا ہے۔ موجودہ حالات اور زمینی حقائق کی روشنی میں عصر حاضر کے غیر مسلموں سے قرآن وسنت کی روشنی میں خاندانی، معاشرتی، سماجی اور کاروباری تعلقات کا مطالعہ درج ذیل ہے۔

عائلی زندگی اور غیر مسلم تعلقات

رشتہ داروں سے حسن سلوک:

اسلام نے اپنے رشتہ داروں سے حسن سلوک کا عام حکم دیا ہے اور یہ حکم ہر دور کے لیے ہے کسی مخصوص وقت یا زمانہ کے ساتھ خاص نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان:

إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيتَاءِ ذِي الْقُرْبَىٰ [2]

''بے شک اللہ تعالیٰ عدل واحسان اور رشتے داروں کو دینے کا حکم دیتا ہے''

اس کا تعلق کسی خاص دور سے نہیں ہے۔ اگر کسی کے والدین یا کوئی اور عزیز غیر مسلم ہے تو وہ اس کے ساتھ صلہ رحمی کرنے کا پابند ہے۔

عبداللہ بن مروان نے حضرت مجاہدؒ سے پوچھا کہ میرا ایک مشرک رشتہ دار میرا مقروض ہے کیا یہ قرض میں چھوڑ دوں؟ انہوں نے کہا ہاں چھوڑ دو اور اس کے ساتھ صلہ رحمی کرو۔ [3]

اسلام غیر مسلم رشتہ داروں سے سماجی تعلقات رکھنے کے حق میں ہے۔ سماجی تعلقات کا ایک بہترین ذریعہ تحفے تحائف دینا ہے۔ اسلام نے غیر مسلم کو وراثت جاری نہیں کی البتہ تحائف کے تبادلے پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ رسول اکرم ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ایک ریشمی جوڑا بطور تحفہ بھیجا۔ حضرت عمرؓ نے عرض کیا کہ ریشم کے استعمال سے تو آپ نے (مردوں) کو منع فرمایا ہے پھر یہ مجھے کس لیے عطا ہوا ہے؟ آپ نے فرمایا یہ اس لیے نہیں ہے کہ تم اسے پہنو بلکہ اس لیے ہے کہ کسی اور کام میں لاؤ کوئی دوسرا فائدہ اٹھاؤ۔ حضرت عمرؓ نے یہ جوڑا اپنے ایک (اخیافی) بھائی کا جو مشرک تھے تحفہ میں بھیج دیا۔ [4]

---

[1] غیر مسلموں سے تعلقات، ص ۲۲، ۲۳

[2] النحل ۱۶:۹۰

[3] ابوعبید القاسم بن سلام الہروی، کتاب الاموال، دار الفکر، قاہرہ، ۱۴۰۱ھ، ص ۵۴۳

[4] الجامع الصحیح للبخاری، کتاب الہبہ، باب الہدایہ للمشرکین (۲۶۱۹) الکتب الستہ، ص ۲۰۶

غیر مسلم والدین سے حسن سلوک کا خصوصی حکم:

قرآن مجید میں والدین کے ساتھ حسن سلوک کی خاص تاکید فرمائی گئی ہے۔ غیر مسلم والدین ہونے کی صورت میں خطرہ تھا کہ کہیں اولاد ان کے حقوق کی پاسداری نہ کرے اس لیے قرآن نے والدین کے حقوق کا ذکر کرتے ہوئے خاص اس حوالے سے فرمایا:

وَإِن جَاهَدَاكَ عَلَى أَن تُشْرِكَ بِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوفًا[1]

"اور اگر وہ تجھ پر دباؤ ڈالیں کہ تو میرے ساتھ شرک کرے جس کا تجھے علم نہیں ہے تو ان کی بات نہ مان اور ان کے ساتھ معروف کے مطابق اچھا برتاؤ رکھ۔"

اس آیت سے صاف واضح ہوتا ہے کہ والدین کے ساتھ چاہے وہ مشرک ہی کیوں نہ ہوں حسن سلوک کیا جائے گا اور ان کے شرک و کفر کی وجہ سے کسی قسم کی بدسلوکی روا نہ ہوگی اور یہ حکم ہر دور کے والدین کے لیے ہے اس میں زمان و مکاں کی کوئی قید نہیں ہے۔

فقہ حنفی کی معروف کتاب ہدایہ میں اس کا تقاضا یوں بیان ہوا ہے:

لیس من المعروف ان یعیش فی نعم اللہ تعالیٰ و یترکھما جوعا[2]

"یعنی کوئی نیکی اور معروف نہیں ہے کہ آدمی خود تو اللہ کی نعمتوں سے فائدہ اٹھاتا رہے اور والدین کو بھوکا مرنے چھوڑ دے۔"

حسن سلوک کی عمومی ہدایات:

اسلام نے رشتہ داروں سے ہٹ کر بھی عام انسانوں سے بلا امتیاز مذہب اچھا سلوک کرنے کا حکم دیا ہے۔ جس کی چند مثالیں درج ذیل ہیں:

قیدیوں سے حسن سلوک:

اسلام نے قیدیوں سے بلا امتیاز مذہب حسن سلوک کی تلقین کی ہے حالانکہ بعض اوقات قیدیوں کی جنگی نفسیات اور سیاسی نزاکتیں اس کی اجازت نہیں دیتیں پھر بھی مسلمانوں کو اس کا پابند بنایا گیا ہے جسے مسلمانوں نے اتنے عمدہ طریقے سے نبھایا کہ اللہ تعالیٰ نے اس حسن سلوک کو قرآن کا حصہ بنا دیا۔ ارشاد ہوتا ہے:

---

[1] لقمان ۳۱:۱۵

[2] ہدایہ، ۲/۴۲۵

وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّأَسِيْرًا [1]

''وہ کھانا کھلاتے ہیں اس کی خواہش اور طلب کے باوجود مسکین یتیم اور قیدی کو۔''

قیدیوں سے حسن سلوک بھی کسی خاص زمانہ یا حالات کے ساتھ مخصوص نہ ہے۔

غیر مسلم پڑوسیوں سے حسن سلوک:

اسلام نے انسان کو بہترین پڑوسی بننے کی تعلیم دی ہے۔ رسول اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

من كان يومن بالله واليوم الاخر فلا يوذ جاره [2]

''جو شخص اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتا ہے اسے اپنے پڑوسی کو اذیت نہیں پہنچانی چاہیے۔''

حضرت ابوذر غفاری کہتے ہیں کہ میرے محبوب ﷺ نے مجھ سے تاکید کے ساتھ فرمایا کہ جب سالن پکاؤ تو پانی بڑھا دو اور اپنے پڑوسیوں میں سے جس کے گھر ضرورت ہو اس میں سے کچھ اسے بھیج دو۔ [3]

پڑوسیوں کی خدمت اور ان کے ساتھ حسن سلوک کی تعلیم عام ہے۔ اس کے مستحق مسلمان پڑوسی کی طرح غیر مسلم پڑوسی بھی ہیں۔ ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن عمر کے ہاں بکری ذبح ہوئی تو آپ نے گھر والوں سے ایک سے دوبار دریافت کیا کہ ہمارے فلاں یہودی پڑوسی کو اس میں سے کچھ بھیجا ہے؟ اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جبرائیل مجھے پڑوس کے سلسلہ میں اس قدر تاکید کرتے تھے کہ مجھے خیال ہوتا تھا کہ وہ اسے وارث نہ بنا دیں۔ [4]

قرآن مجید میں پڑوسی کی ایک قسم الجار الجنب بتائی گئی ہے۔ بعض علماء نے اس سے یہودی اور نصرانی مراد لیے ہیں۔ اس حوالہ سے علامہ قرطبی لکھتے ہیں:

فالوصاة بالجار مامور بها مندوب اليها مسلما او كافرا [5]

''پڑوسی کے ساتھ حسن سلوک کا حکم ہے یہ مندوب اور پسندیدہ ہے پڑوسی چاہے مسلمان ہو یا کافر۔''

اس سے واضح ہوتا ہے کہ اسلام کی اخلاقی تعلیمات عام ہیں۔ ان کا تعلق مسلم اور غیر مسلم دونوں سے ہے اور ہر زمانے کے لیے ہے۔

غیر مسلموں پر خرچ کرنا بھی انفاق فی سبیل اللہ ہے:

اسلام کے ابتدائی زمانہ میں ہر طرف سے دین حق کی مخالفت اور اس کے پیروکاروں پر تشدد کا سلسلہ زوروں پر تھا اور بہت سے مسلمان خود حاجت مند تھے اس لیے آپ نے انہیں پر صدقہ وخیرات کی تلقین کر دی تھی۔ تو اس پر یہ آیت نازل ہوئی:

---

[1] الدھر ۷۶:۸

[2] ابوداؤد کتاب الادب باب فی حق الجوار (۵۱۵۲) الکتب الستۃ، ص ۱۶۰۰

[3] مسلم، کتاب البر والصلۃ، باب الوصیۃ بالجار (۶۶۸۸) الکتب الستۃ، ص ۱۱۳۶

[4] ابوداؤد، کتاب الادب، باب فی حق الجوار (۶۶۸۵) الکتب الستۃ، ص ۱۱۳۶

[5] قرطبی، ابوعبداللہ محمد بن احمد الانصاری، الجامع لاحکام القرآن، الہیئۃ المصریہ العامہ، ۱۹۸۷ء، ۵/۱۸۳

لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰاهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ ۭ وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَاۗءَ وَجْهِ اللّٰهِ ۭ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ[1]

''اے پیغمبر! آپ پر ان کو ہدایت بخش دینے کی ذمہ داری نہیں ہے البتہ اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت سے نوازتا ہے تم جو بھی مال اللہ کی راہ میں خرچ کرو گے اس کا فائدہ تم ہی کو پہنچے گا (دیکھو) تم اللہ کی رضا ہی کے لیے تو خرچ کرتے ہو۔ تم جو مال بھی خرچ کرتے ہو اس کا پورا بدلہ تمہیں دیا جائے گا اور تمہاری حق تلفی نہ ہوگی۔''

اس آیت کے سبب نزول کے بارے میں متعدد روایات ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ اس آیت میں غیر مسلموں پر انفاق بھی نیکی بتلایا گیا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی ہدایت تھی کہ مسلمان جو کچھ صدقہ وخیرات کریں وہ مسلمانوں ہی پر کریں اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔[2]

سعید بن جبیرؒ کہتے ہیں کہ ذمیوں میں جو حاجت مند ہوتے مسلمان ان پر انفاق کیا کرتے تھے جب مسلمانوں ہی میں حاجت مندوں کی زیادہ تعداد ہوگئی تو آپ نے فرمایا:

لا تتصدقوا الا علی اهل دینکم[3]

''اپنے ہم مذہب لوگوں ہی پر تم صدقہ وخیرات کرو۔''

اس پر مذکورہ آیت نازل ہوئی اور ان لوگوں پر بھی خرچ کرنے کی اجازت دی گئی جو دائرہ اسلام سے باہر ہیں۔

اس طرح اس آیت کے ذریعے قیامت تک کے لیے ضرورت مند شخص خواہ وہ مسلم ہو یا غیر مسلم، مشرک ہو یا اہل کتاب سب کے ساتھ حسن سلوک اور انفاق کی اجازت جاری کردی گئی۔

محارب قوم سے انسانی تعلقات:

آپ ﷺ کا اسوہ بتلاتا ہے کہ محارب قوم کی مصیبت اور تکلیف پر بھی خوشی نہیں منانی چاہیے۔ اور آفت کے دنوں میں اس کی بھی امداد سے گریز نہیں کرنا چاہیے۔

حربی وذمی کی مدد کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے مکہ کے لوگ قحط میں مبتلا ہوگئے تو رسول اللہ نے ابوسفیان بن حرب اور صفوان بن امیہ کے پاس پانچ سو درہم بھجوائے تاکہ وہ مکہ کے ضرورت مندوں اور محتاجوں میں انہیں تقسیم کردیں۔

---

[1] البقرہ ۲:۲۷۲

[2] ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم: ۱/۳۲۳

[3] قرطبی، الجامع لاحکام القرآن: ۳/۳۳۷

"صلہ رحمی ہر مذہب میں پسندیدہ ہے۔ دوسروں کو ہدیہ بھیجنا مکارم اخلاق میں شمار ہوتا ہے۔"[۱]

عصر حاضر کے غیر مسلموں سے معاشرتی تعلقات:

معاشرتی تعلقات کے حوالے سے سب سے اہم چیز غذا اور لباس ہے۔ اس کے بعد دوسرے رسم ورواج آتے ہیں۔ آپ ﷺ کی ولادت عربوں میں ہوئی آپ نے تمام جائز چیزیں کھائیں اور عرب معاشرت کی جائز چیزوں کو اختیار کیا۔ کی دور میں حرام کردہ چار چیزوں کے علاوہ کسی اور چیز کو حکم خداوندی کے بغیر حرام قرار نہ دیا۔ وہ چار چیزیں یہ ہیں جن کا ذکر سورہ انعام کی اس آیت میں ہے:

قُلْ لَّآ اَجِدُ فِیْ مَآ اُوْحِیَ اِلَیَّ مُحَرَّمًا عَلٰی طَاعِمٍ یَّطْعَمُهٗٓ اِلَّآ اَنْ یَّكُوْنَ مَیْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِیْرٍ فَاِنَّهٗ رِجْسٌ اَوْ فِسْقًا اُهِلَّ لِغَیْرِ اللّٰهِ بِهٖ فَمَنِ اضْطُرَّ غَیْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَاِنَّ رَبَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ[۲]

"کہہ دو مجھ پر جو وحی آئی ہے اس میں کسی کھانے والے پر جو چیزیں کہ وہ کھاتا ہے میں کوئی چیز حرام نہیں پاتا سوائے اس کے کہ وہ مرا دیا بہتا ہوا خون ہو یا خنزیر کا گوشت اس لیے کہ وہ ناپاک ہے یا فسق ہو کہ جانور پر ذبح کرتے وقت غیر اللہ کا نام پکارا جائے۔ لیکن اگر کوئی مجبور ہو جائے اور وہ حد سے نہ بڑھے اور زیادتی نہ کرے تو تمہارا رب بڑا معاف کرنے والا اور بڑا رحیم ہے۔"

اس آیت میں وہ چیزیں جنہیں عرب عام طور پر حلال سمجھتے تھے حرام قرار دی گئی ہیں ان کے علاوہ بعض اور چیزوں کو بھی قرآن وحدیث نے حرام قرار دیا۔ مثلاً شراب وغیرہ۔

لیکن حلت وحرمت میں اصل چیز اباحت ہی رہی جو چیزیں حرام کی گئیں وہ تھوڑی ہیں۔

اشیاء میں اصل حلت ہے:

حرام وحلال کے حوالے سے اسلام خواہ مخواہ ہر چیز کو حرام قرار نہیں دیتا بلکہ جب تک کوئی چیز نص قطعی سے حرام ثابت نہ ہو جائے اسے جائز قرار دیتا ہے۔ اس اصول کے تحت جو چیزیں حرام نہیں ہیں انہیں مسلم تیار کرے یا کافر وہ ہر حال میں حلال اور جائز ہیں اور جو چیزیں اللہ نے حرام کر دی ہیں انہیں مسلم تیار کرے یا کافر وہ ہر حال میں حرام ہی رہتی ہیں۔ لہٰذا اس معاملہ میں عصر حاضر یا اسلام کے ابتدائی دور کا کوئی امتیاز نہ ہے۔

غیر مسلم کا پانی:

پانی اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی پاک اور حلال نعمت ہے۔ اسلام کا نقطہ نظر یہ ہے کہ پانی اصلاً پاک ہے وہ کسی کے ہاتھ لگانے یا

---

[۱] رد المحتار علی الدر المختار: ۹۲/۳

[۲] الانعام ۶: ۱۴۵

کسی کی ملکیت سے ناپاک نہیں ہوتا۔ یہ صرف اس وقت ناپاک ہوتا ہے جب اس میں کوئی نجس یا ناپاک چیز ملا دی جائے۔ آپ ﷺ اور صحابہ نے غیر مسلموں کا پانی کھانے پینے اور عبادات تک کے لیے استعمال کیا ہے۔

حضرت عمران بن حصینؓ نے ایک سفر کا واقعہ بیان کیا ہے جس میں ایک غیر مسلم عورت کے پانی سے پانی لینا ثابت ہے۔[1]

حضرت عمرؓ کے بارے میں روایت ہے کہ انہوں نے شام کے سفر میں ایک نصرانی عورت کے گھر سے گرم پانی لے کر وضو کیا۔[2]

غیر مسلم کی تیار کردہ غذائی اشیاء:

غیر مسلموں کی تیار کردہ حلال غذائی چیزیں حلال ہیں اور ان کے استعمال کرنے میں کسی زمان و مکان کی کوئی قید نہ ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمر فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پنیر کا ٹکڑا پیش کیا گیا۔ آپ نے چھری طلب فرمائی۔ اللہ کا نام لے کر اسے قطع کیا اور تناول فرمایا۔[3]

پنیر حجاز میں تیار نہ ہوتی تھی بلکہ شام وغیرہ سے آتی تھی۔

حضرت عبداللہ بن مغفل فرماتے ہیں کہ غزوہ خیبر میں مجھے چربی سے بھرا ہوا ایک جراب (چمڑے کا تھیلا) ملا میں نے اسے اپنے پاس محفوظ کر لیا کہ یہ میں کسی کو نہیں دوں گا اتنے میں پلٹ کے دیکھا تو رسول اللہ ﷺ مسکرا رہے تھے۔[4]

اس حدیث کے ذیل میں امام نووی فرماتے ہیں کہ یہ دلیل ہے اس بات کی کہ یہود کے ذبیحہ کی چربی کا استعمال مسلمانوں کے لیے جائز ہے۔ مالکیہ اور حنابلہ میں سے بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ چونکہ چربی یہود کے لیے حرام تھے اس لیے ان کے ذبیحہ سے نکلی ہوئی چربی ہمارے لیے بھی حرام ہوگی۔ لیکن امام مالک، امام ابوحنیفہ، امام شافعی اور جمہور علماء اس کے جواز کے قائل ہیں۔ قرآن سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔[5]

غیر مسلم کا ذبیحہ:

اسلام نے حلال جانوروں کے گوشت کو جائز قرار دیا ہے اور اس سلسلے میں غیر مسلموں کے ذبیحہ کو بھی جائز قرار دیا ہے۔ ارشاد ہے:

اَلْيَوْمَ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ وَطَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ[6]

---

[1] الجامع الصحیح للبخاری، کتاب المغازی، باب الشاة التی سمت للنبی بخیبر (۴۲۴۹) الکتب الستۃ، ص ۳۴۸

[2] الجامع الصحیح للبخاری، کتاب الوضوء، باب وضوء الرجل مع امراتہ (۱۹۳) الکتب الستۃ، ص ۱۹

[3] ابوداؤد، کتاب الاطعمہ، باب فی اکل الجبن (۳۸۱۹) الکتب الستۃ، ص ۱۵۰۲

[4] الجامع الصحیح للبخاری، کتاب [illegible] الذبائح والصید باب ذبائح اہل الکتاب وشحومہا من اہل الحرب وغیرہم (۵۵۰۸) الکتب الستۃ، ص ۴۷۴

[5] نووی شرح مسلم، دار الریان للتراث قاہرہ، ۱۴۰۷ھ، ج ۳، جزء ۱۲، ص ۱۰۲۔۱۰۳

[6] المائدہ ۵:۵

''آج تمہارے لیے تمام پاک چیزیں حلال کر دی گئیں اور ان لوگوں کا کھانا بھی تمہارے لیے حلال ہے جن کو کتاب دی گئی اور تمہارا کھانا ان کے لیے بھی حلال ہے۔''

اس آیت میں کھانے سے مراد ذبیحہ ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ اس سے ذبیحہ مراد ہے۔[۱]

غیر مسلموں کے برتن:

غیر مسلم اپنے برتنوں میں چونکہ شراب اور خنزیر کا گوشت بھی ڈالتے ہیں اس لیے ایک شرط کے ساتھ آپ ﷺ نے ان کے استعمال کی اجازت دی ہے جو ہمیشہ کے لیے ہے۔

حضرت ابوثعلبہ خشنی بیان کرتے ہیں کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ ہم لوگ ایسے علاقے میں رہتے ہیں جہاں اہل کتاب ہیں کیا ہم ان کے برتن کھانے کے لیے استعمال کر سکتے ہیں۔ آپ نے ارشاد فرمایا:

فان وجدتم غیر انیتهم فلا تاکلوها و ان لم یجدوا فاغسلوها ثم کلوا فیها[۲]

''اگر تمہیں ان برتنوں کے علاوہ اور برتن دستیاب ہوں تو ان کے برتنوں میں نہ کھاؤ۔ لیکن اگر دستیاب نہ ہوں تو انہیں دھولو پھر ان میں کھاؤ۔''

غیر مسلموں کے کپڑے:

غیر مسلموں کے کارخانوں میں تیار ہونے والے کپڑے تو سب جائز ہیں البتہ ان کے پہنے ہوئے کپڑے چونکہ ناپاک ہونے کا احتمال رکھتے ہیں اس لیے انہیں دھو کر استعمال کیا جا سکتا ہے۔

ابوخطاب کہتے ہیں کہ اصل طہارت ہے جب تک کسی کپڑے کے ناپاک ہونے کا ثبوت نہ ہو اسے پاک ہی سمجھنا چاہیے۔[۳]

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ قرون اولیٰ میں لوگ غیر مسلموں سے متعلق فراخ دلی اور حسن ظن کا رویہ رکھتے تھے۔ معاشرتی تعلقات کے حوالے سے مذکورہ چیزوں کے جواز سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ غیر مسلموں سے مسلمان ہر دور میں معاشرتی تعلقات رکھنے میں آزاد ہیں اس میں کوئی گناہ یا قباحت والی بات نہیں ہے۔

غیر مسلموں سے سماجی تعلقات:

عصر حاضر میں جب کہ مسلم اور غیر مسلم کا میل جول قرون اولیٰ کی بہ نسبت بہت زیادہ بڑھ گیا ہے ہر مسلم کا خواہ وہ دنیا کے کسی

۱۔ الجامع الصحیح للبخاری، کتاب الذبائح والصید، باب ذبائح اہل الکتاب، الکتب الستۃ، ص ۴۷۳

۲۔ الجامع الصحیح للبخاری، کتاب الصید والذبائح، باب صید القوس (۵۴۷۸)، الکتب الستۃ، ص ۴۷۲

۳۔ ابن قدامہ، ابو محمد عبداللہ بن احمد بن محمد، المغنی: تحقیق الدکتور عبداللہ، القاہرہ، مصر ۱۴۱۳ھ، ۱/۱۱

ملک رشہر میں بستا ہو اس کا واسطہ گھر، کاروبار اور آفس میں کسی نہ کسی غیر مسلم سے ضرور پڑتا ہے۔ ان حالات میں ان کی آمد اور خوشی و غمی کے مواقع پر ان کے ساتھ انسانی ہمدردی کے کچھ کلمات کہنا ضروری ہوتے ہیں جن کے بارے میں اکثر لوگ گومگو کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ذیل میں کچھ ایسے اعمال کا مطالعہ پیش کیا جاتا ہے۔

غیر مسلم کو سلام و دعا دینا:

غیر مسلم کو سلام و دعا کے حوالے سے امت میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ پیغمبر علیہ السلام کے دور میں یہودیوں نے اس لفظ سلام کا غلط استعمال کرتے ہوئے لفظ سام کہنا شروع کر دیا تھا جس کے معنی موت کے ہیں۔ آپ ﷺ نے جواب میں وعلیکم کا طریقہ اختیار کیا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس واقعہ سے پہلے السلام علیکم بلا امتیاز مسلم و غیر مسلم مروج تھا۔ آج کے دور میں بھی جہاں کسی ایسے خطرے کا امکان نہ ہو تو سلام کہنے میں کوئی حرج نظر نہیں آتا جب کہ آج کے غیر مسلم جو مسلم معاشرے میں رہتے ہیں اس چیز کو برا محسوس کرتے ہیں اگر ان کو سلام یا سلام کا جواب نہ دیا جائے۔

سلام کے حوالے سے زیادہ تر علماء کی رائے یہ ہے کہ اس کا تعلق صرف مسلمانوں سے ہے اس لیے غیر مسلم کو سلام نہیں کیا جا سکتا اور الفاظ بحسب حال کہے جا سکتے ہیں لیکن اکابر علماء میں سے بعض کے نزدیک سلام ایک طرح کی دعا ہی ہے۔ لہٰذا یہ دعا غیر مسلم کو بھی دی جا سکتی ہے۔ ان لوگوں کے عمل کو بنیاد بنا کر آج کے دور میں اگر سلام و دعا غیر مسلموں سے بھی مسلمانوں ہی کی طرح کر لی جائے تو اس کے اثرات تبلیغ اسلام پر اچھے پڑ سکتے ہیں۔ حضرت ابو موسیٰ اشعری نے ایک ذمی کو خط میں سلام لکھا۔ بعض لوگوں نے کہا کہ کیا آپ غیر مسلم کو سلام لکھ رہے ہیں۔ انہوں نے جواب دیا اس نے اپنے خط میں مجھے سلام لکھا تھا۔ میں نے اس کا جواب دیا ہے۔[1]

مشہور محدث ابن عیینہ سے سوال کیا گیا کیا کافر کو سلام کرنا جائز ہے؟ انہوں نے جواب دیا نعم، ہاں دیا جا سکتا ہے اور پھر سورہ ممتحنہ کی یہ آیت پڑھی: لا ینھاکم اللہ ...... جس میں کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے ساتھ نیک اور حسن سلوک سے منع نہیں کرتا جنہوں نے تم سے جنگ نہیں کی اور تمہیں اپنے وطن سے نہیں نکالا۔ وہ تو ان لوگوں سے قریبی تعلق رکھنے سے منع کرتا ہے جنہوں نے تم سے جنگ کی تمہیں تمہارے گھروں سے نکالا اور اس معاملہ میں دوسروں کی مدد کی۔[2]

اس کا مطلب یہ ہوا محدث ابن عیینہ حربی اور غیر حربی یا معاہد اور غیر معاہد غیر مسلموں کے درمیان فرق روا رکھتے تھے۔ ان کے استدلال کے مطابق چونکہ قرآن غیر حربی کے ساتھ حسن سلوک سے منع نہیں کرتا اس لیے اسے سلام بھی کیا جا سکتا ہے۔ یہ بھی ان سے حسن سلوک میں داخل ہے۔

البتہ غیر مسلموں کے لیے سلام کے علاوہ والسلام علی من اتبع الھدیٰ کے الفاظ بھی آپ ؐ کے خطوط میں ملتے ہیں۔ آپ ﷺ نے شاہ روم، ہرقل کو جو خط لکھا تھا وہ اس طرح شروع ہوتا ہے: بسم اللہ الرحمن الرحیم من محمد عبداللہ

---

[1] بخاری، ادب المفرد: ۵۲۹/۲ ۔ فضل اللہ احمد، المطبعۃ السلفیۃ و مکتبھا القاہرہ، ۱۳۷۸ھ

[2] الممتحنۃ: ۸۔۹ قرطبی، الجامع لاحکام القرآن، ۱۱۱/۱۱

و رسوله الی هرقل عظیم الروم ، السلام علی من اتبع الهدی اما بعد.....[1]

لہٰذا موجودہ دور میں جب کہ غیر مسلم عوام مسلمانوں سے معاندانہ رویہ نہیں رکھتے تو ان سے السلام علیکم کہنا یا جواب دینا اسلام اور مسلمان کے لیے مفید ہی ثابت ہوگا۔ اس لیے اسی موقف کو اختیار کرنا اسلام کے فطری مزاج سے ہم آہنگ نظر آتا ہے۔

غیر مسلم کو دعا دینا:

غیر مسلم کو دعا دینا رسول اللہ ﷺ کے اسوہ سے ثابت ہے۔ حدیث نبوی ہے:

حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک یہودی سے پینے کی کوئی چیز طلب کی۔ اس نے وہ پیش کی تو آپ نے اسے دعا دی کہ اللہ تعالیٰ تمہیں حسین و جمیل رکھے۔ چنانچہ مرتے وقت تک اس کے بال سیاہ رہے۔[2]

چھینک کی دعا کا جواب:

یہود آپ کی مجلس میں زبردستی چھینکتے تھے (تاکہ آپ اپنی عادت کے مطابق چھینکنے والے کو الحمد للہ سننے کے بعد یرحمک اللہ کی دعا دیں) آپ ان کے لیے یرحمکم اللہ کے الفاظ کی بجائے **یهدیکم الله و یصلح بالکم** (اللہ تمہیں ہدایت دے تمہارا معاملہ ٹھیک کرے) کہا کرتے تھے۔

اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ غیر مسلموں کو ان کے مناسب حال دعا دی جاسکتی ہے۔ یہ اسلام کی اعلیٰ تعلیمات کا فطری تقاضا بنتا ہے۔

غیر مسلم کی عیادت:

بیمار کی عیادت کرنا بھی ایک سماجی تقاضا ہے جس کی اہمیت آج کے دور میں بہت بڑھ گئی ہے۔ غیر مسلموں کو اسلامی تعلیمات اور اس کے انسانی بھلائی اور خیر خواہی کے جذبہ سے آگاہ کرنے کے لیے بھی اس کی ضرورت ہے۔ آپ ﷺ کا غیر مسلموں کی عیادت کرنا ثابت ہے۔ حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ ایک یہودی لڑکا رسول اللہ ﷺ کی خدمت کیا کرتا تھا۔ وہ بیمار ہوا تو آپ اس کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے۔ اس کے سرہانے بیٹھے۔ اس سے کہا کہ تم اسلام لے آؤ۔ اس نے اپنے باپ کی طرف دیکھا جو اس کے قریب ہی بیٹھا تھا۔ اس نے کہا ابو القاسم کی بات مان لو۔ چنانچہ وہ اسلام لے آیا۔ نبی ﷺ وہاں سے یہ کہتے ہوئے نکلے کہ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے اس بچہ کو جہنم سے بچالیا۔

اس اسوہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ غیر مسلموں کی عیادت اور تعزیت جائز ہے۔

ازدواجی تعلقات:

اسلام نے مشرکین سے ازدواجی تعلقات کی ممانعت فرمائی ہے۔ ارشاد ہے:

---

[1] الجامع الصحیح للبخاری، کتاب الاستئذان باب کیف یکتب الکتاب الی اہل الکتاب (۶۲۶۰) الکتب الستۃ ص ۵۲۷
[2] عبد الرزاق، المصنف: ۳۹۲/۱۰

وَلَا تَنكِحُوا الْمُشْرِكَٰتِ حَتَّىٰ يُؤْمِنَّ ..... [1]

''مشرک عورتوں سے نکاح مت کرو۔''

یہ ممانعت دائمی ہے۔ مشرک عورتوں سے شادی جائز نہیں ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ جب میاں بیوی کے نظریات بالکل متضاد ہوں گے تو شادی کے مقاصد حاصل نہ ہوں گے۔ اور گھر کا سکون تباہ ہو جائے گا۔ کیونکہ شرک اور توحید دو متضاد راہیں ہیں۔ البتہ اہل کتاب اور مسلمانوں میں چونکہ بہت سارے عقائد اور اعمال میں اشتراک پایا جاتا ہے اس لیے شادی کی کامیابی کے امکانات ہیں اس لیے ان سے نکاح جائز ہے۔

ارشاد ہوتا ہے:

وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ الْمُؤْمِنَاتِ وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِن قَبْلِكُمْ [2]

''تمہارے لیے حلال ہیں اہل ایمان میں کی پاک دامن عورتیں اور ان لوگوں کی پاک دامن عورتیں جنہیں تم سے پہلے کتاب دی گئی۔'' [2]

مذکورہ آیت سے واضح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ ایک مسلمان جس طرح شریف مسلمان عورت سے نکاح کر سکتا ہے اسی طرح شریف کتابیہ سے بھی نکاح کر سکتا ہے۔

کتابیہ سے نکاح کا جواز کسی خاص زمانے کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ ہر دور کے لیے بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر نے کتابیات سے نکاح پر برہمی کا اظہار کیا یہ کسی مصلحت کی بنا پر تھا ورنہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک نص قطعی سے ثابت ہونے والی چیز کی مخالفت کیونکر کر سکتے تھے۔ چنانچہ مشہور تابعی حضرت شقیق کی (صحیح سند کے ساتھ) روایت ہے کہ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے ایک یہودیہ سے شادی کی تو حضرت عمرؓ نے لکھا کہ اسے وہ طلاق دے دیں۔ حضرت حذیفہ نے جواب میں لکھا کہ اگر آپ اسے حرام سمجھتے ہیں تو بتائیں میں اسے چھوڑ دوں۔ حضرت عمرؓ نے جواب میں لکھا:

لا ازعم انها حرام و لكن اخاف ان تعاطوا المومسات منهن. [3]

''میں نہیں کہتا کہ وہ حرام ہے لیکن مجھے ڈر ہے کہ تم ان کی بدکار عورتوں سے نکاح نہ کرنے لگو۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی اس وضاحت سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عمر کتابیات میں سے عفیف اور پاک دامن عورتوں سے شادی کے مخالف نہ تھے۔ البتہ اخلاقی گراوٹ کا شکار عورتوں سے نکاح پسند نہ کرتے تھے۔ اس چیز کو پیش نظر رکھ کر دور میں قرین مصلحت نظر آتا ہے۔

---

[1] البقرہ ۲۲۱:۲

[2] المائدہ ۵:۵

[3] قرطبی، الجامع لاحکام القرآن: ۶۸/۳

غیر مسلموں سے کاروباری تعلقات:

اسلام حرام چیزوں کی پیداوار اور لین دین کو جائز قرار نہیں دیتا۔ اور اس سلسلے میں کسی قسم کے تعاون کو بھی روا نہیں رکھتا۔ ناجائز اور حرام چیزوں کے کاروبار میں تعاون کو وہ معصیت اور عدوان میں تعاون کے مترادف قرار دیتا ہے۔ البتہ حلال چیزوں کی تجارت اور لین دین کا معاملہ غیر مسلم سے کیا جاسکتا ہے۔ آپ ﷺ کا کاروباری لین دین غیر مسلموں سے ثابت ہے۔

حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکر کہتے ہیں کہ ہم لوگ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں موجود تھے کہ ایک مشرک جو پراگندہ بال اور دراز قد تھا، کچھ بکریاں لے کر پہنچا۔ آپ نے اس سے سوال کیا کہ کیا یہ فروخت کے لیے ہیں یا تحفہ ہیں؟ اس نے کہا فروخت کے لیے ہیں۔ آپ نے اس سے ایک بکری خریدی۔[1]

اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ حلال چیزوں کی خرید وفروخت غیر مسلموں سے جائز ہے۔

غیر مسلموں کی کمائی کے ذرائع چونکہ وہ چیزیں بھی ہوتی ہیں جن کو اسلام جائز قرار نہیں دیتا۔ اسلام اس چیز کا ہمیں مکلف نہیں ٹھہراتا کہ ہم اس کے ذرائع آمدن کی چھان بین کریں۔ ہم صرف اس بات کے پابند ہیں کہ جو چیز ہم اس سے خرید وفروخت کر رہے ہیں وہ جائز ہے کہ نہیں۔ آپ ﷺ نے یہودیوں سے لین دین ساری عمر جاری رکھا۔

حضرت عائشہؓ آپ کی حیات مبارکہ کے آخری دور کے حوالے سے یوں بیان فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی وفات اس حال میں ہوئی کہ آپ کی زرہ ایک یہودی کے ہاں تیس صاع جو کے عوض رہن تھی۔

یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ کفار سے معاملہ کرنا جائز ہے اور یہ کہ ان کے آپس کے معاملات کے فساد کا اعتبار نہیں کیا جائے گا۔

اسلام نے نہ صرف غیر مسلموں سے کاروبار کو جائز قرار دیا ہے بلکہ ان کے کاروباری حقوق بھی تسلیم کیے گئے۔ وہ باہم ان چیزوں کا لین دین کر سکتے ہیں جو اسلام کی رو سے ناجائز ہیں۔ علامہ ابن عربی مالکی اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے حضرت عمرؓ کا ایک فرمان یوں نقل کرتے ہیں کہ ذمیوں سے شراب بطور جزیہ نہیں لی جائے گی لیکن اگر وہ اسے اپنے لوگوں میں فروخت کر کے جزیہ ادا کریں تو قبول کر لیا جائے گا۔

اسی طرح جمہور علماء کے نزدیک غیر مسلموں کے ساتھ کاروبار میں شرکت بھی جائز ہے۔ اس کی دلیل حضرت عبداللہ بن عمر سے مروی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے خیبر (کی فتح کے بعد) یہود کو اس شرط کے ساتھ مقبوضہ زمین پر کاشت کی اجازت دی کہ انہیں پیداوار کا نصف ملے گا۔[2]

---

[1] الجامع الصحیح للبخاری، کتاب البیوع، باب الشراء والبیع مع المشرکین واہل الحرب (۲۲۱۶) الکتب الستۃ، ص ۱۷۲

[2] الجامع الصحیح للبخاری، کتاب الشرکۃ، باب مشارکۃ الذمی والمشرکین فی المزارعۃ (۲۴۹۹) الکتب الستۃ، ص ۱۹۷

جب کھیتی باڑی اور کاشتکاری میں شرکت جائز ہے تو دوسرے معاملات میں بھی اس کا جواز ثابت ہو جاتا ہے۔

احادیث سے غیر مسلم کی نوکری یا خدمت کر کے مال حاصل کرنے کا جواز بھی ثابت ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ پر فاقہ کی کیفیت تھی۔ حضرت علیؓ کو اس کی اطلاع ملی تو وہ کسی کام کی تلاش میں نکلے تا کہ اس کی آمدنی سے آپ کے لیے کھانے کا سامان کر سکیں۔ ایک یہودی کے باغ میں پہنچے اس کی سنچائی کی۔ سترہ ڈول کھینچے اور ہر ڈول پر ایک عمدہ کھجور ملی اسے لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔[1]

مذکورہ حقائق سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مسلم اور غیر مسلم آپس میں خیر خواہی پر مبنی تعلقات ہر دور میں رکھ سکتے ہیں۔ موجودہ دور میں چونکہ دنیا ایک گلوبل ویلیج کی حیثیت اختیار کر گئی ہے اور مسلم اور غیر مسلم باہم اکٹھے رہنے، کاروبار اور نوکریاں کرنے پر مجبور ہیں۔ لہٰذا اسلام کی ابدی تعلیمات ان کی راہ میں خلیج پیدا کرنے کی بجائے ان میں تعاون اور اشتراک کی بنیادیں فراہم کرتی دکھائی دیتی ہے۔ جن پر عمل پیرا ہو کر مسلمان غیر مسلموں سے مجادلہ احسن اور موعظہ حسنہ کے ذریعے تبلیغ اسلام کا کام عمدہ طریقے سے سرانجام دے سکتے ہیں۔

---

[1] ابن ماجہ، کتاب الرھون، باب الرجل یستقی کل دلو بتمرۃ (۲۴۴۶) الکتب الستۃ، ص ۲۶۲۳

عصر حاضر میں عالمی معاہدات کی شرعی و اخلاقی حیثیت:

اسلام معاہدات کے احترام کا درس دیتا ہے اور بغیر کسی شرعی عذر کے نقض معاہدہ کو جرم سمجھتا ہے۔ آپ ﷺ نے اپنے دور میں کیے گئے تمام معاہدوں کو نبھایا اور معاہدہ توڑنے والوں سے باقاعدہ جنگ کی۔ قرآن وسنت کے حوالے سے معاہدات کی اہمیت باب دوم میں بیان ہو چکی ہے۔ اس فصل میں عصر حاضر کے عالمی معاہدات کے حوالے سے اسلامی نقطہ نظر جاننے کی کوشش کی جائے گی۔

اس وقت عالم اسلام کے تقریباً ستاون ممالک کے حکمران عالمی معاہدات کو تسلیم کرتے ہوئے ان پر دستخط کیے ہوئے ہیں۔ ان معاہدات کی پابندی کے حوالے سے عالم اسلام کے لوگ ان کی شرعی حیثیت اور پاسداری پر مختلف اعتراضات اٹھاتے رہتے ہیں۔

ان معاہدات کا پس منظر اور ان سے متعلقہ قوانین اور ان کو نافذ کرنے والی حکومتوں کے حوالے سے ایک مطالعہ درج ذیل ہے۔

سب سے پہلے یہ بات جاننے کی ضرورت ہے کہ موجودہ بین الاقوامی قانون کی حیثیت کیا ہے۔ کیونکہ اس وقت مسلمانوں کی تمام ریاستوں نے چند بین الاقوامی معاہدات پر دستخط کیے ہیں اور ساتھ ہی انہوں نے بین الاقوامی عرف کی پابندی بھی تسلیم کی ہے جس سے بین الاقوامی تعامل میں چند اصولوں کو قانونی طور پر مسلمات کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔ اس لیے جب تک معاصر بین الاقوامی قانون کی حجیت و عدم حجیت کا فیصلہ نہ کیا جائے عالمی معاہدات کی پاسداری کے جواز اور عدم جواز کا فیصلہ بھی نہیں کیا جا سکتا۔ بعض مسلمان اہل علم نے بین الاقوامی قانون کی حجیت کو اس بنا پر تسلیم کرنے سے انکار کیا ہے کہ یہ غیر مسلموں کا وضع کردہ قانون ہے اور اسلام سے متصادم ہے۔

ایک اعتراض یہ بھی کیا جاتا ہے کہ معاصر بین الاقوامی قانون نے دفاع کے ماسوا جنگ کی دیگر قسموں پر پابندی لگائی ہے جبکہ اسلامی جہاد صرف دفاع تک محدود نہیں ہے۔

اخیراً اقوام متحدہ کے منشور کے حوالے سے ایک بڑا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ اس کے تحت بعض اوقات جب فوجی کارروائی کی جاتی ہے تو اس کی کمان غیر مسلموں کے ہاتھ میں ہوتی ہے اور کارروائی مسلمانوں کے خلاف کی جاتی ہے۔

بین الاقوامی قانون کے حوالے سے یہ مفروضہ کہ اسے غیر مسلموں نے وضع کیا، حقیقت پر مبنی نہیں ہے۔ کیونکہ بین الاقوامی قانون کے دو بڑے ماخذ ایک عرف (Custom) یعنی بین الاقوامی تعامل ہے اور دوسرا معاہدات (Treaties) ان دونوں ماخذوں میں کوئی بھی فی نفسہ غلط اور ناجائز نہیں ہے۔ بین الاقوامی تعامل اور معاہدات کے حوالہ سے مسلمانوں اور غیر مسلموں میں اشتراک پایا جاتا ہے۔ آپ کا سفیروں سے متعلق قانون کو ماننا اور حلف الفضول کی پاسداری اور اس کی اہمیت اور افادیت پر آپ کا اظہار خیال اس کی عمدہ دلیل ہے۔ ان دو چیزوں کو اقوام عالم نے مان کر اگر سفارت کے باقاعدہ دفاتر اور معاہدات کا عالمی نظام بنا لیا ہے تو اصلاً اس میں کوئی قباحت نہیں ہے۔

بین الاقوامی قانون کا ارتقاء:

بیسویں صدی عیسوی میں بین الاقوامی عرف کے اصول اور ضوابط کو معاہدات کی شکل میں منضبط کرنے کی کوشش کی گئی تو ''ویانا معاہدہ متعلقہ بہ سفارتی تعلقات ۱۹۶۱ء'' نے ان اصول وضوابط کو معاہدے کی شکل دے دی۔ تقریباً یہی طریقہ بین الاقوامی قانون کے دوسرے شعبوں میں بھی اپنایا گیا ہے۔ گویا بین الاقوامی قانون تمام انسانوں کی مشترکہ کاوشوں سے وجود میں آیا ہے اور اس میں مسلمانوں کی شریعت کے ضوابط اور اصول بھی بہت حد تک سموئے گئے ہیں۔ بلکہ بین الاقوامی قانون کے بعض غیر مسلم ماہرین نے بھی اس بات کا اقرار کیا ہے کہ اسلامی قانون میں کتاب السیر کی جزئیات کو بین الاقوامی تعامل کے ثبوت کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے کیونکہ ایک تو ان جزئیات سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک قانونی اصول صدیوں سے رائج ہے دوسرے ان سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانوں کے ایک بہت بڑے گروہ نے ان اصولوں کو مانا ہے۔

موجودہ عالمی معاہدات کے عمل کا ارتقاء:

ابتدا میں بین الاقوامی عرف کی پہچان اور اس کی تشریح کا کام بین الاقوامی قانون کے وہ ماہرین کرتے تھے جنہوں نے ریاستوں کے تعامل کے تجزیے اور تحقیق میں عمریں صرف کی ہوتی تھیں۔ انیسویں صدی کے آخر میں ریاستوں کی جانب سے باقاعدہ کوشش کی گئی کہ اس تعامل کو معاہدات کی شکل میں منضبط کیا جائے۔ بیسویں صدی میں بعض بین الاقوامی عدالتیں وجود میں آگئیں جنہوں نے بین الاقوامی قانون کی وضاحت اور تشریح کے کام کو مزید بہتر کیا۔ ان میں بالخصوص مستقل بین الاقوامی عدالت انصاف (Permanent Court of International Justice) کا کام نہایت اہم ہے۔ اقوام متحدہ کی تنظیم کے قیام کے بعد یہی کام اس تنظیم کی اہم شاخ بین الاقوامی عدالت انصاف (International Court of Justice) کے ذمے آ گیا ہے۔

اسی طرح بین الاقوامی تعامل کو معاہدات کی شکل میں منضبط کرنے کا کام ایک بین الاقوامی کمیشن (International Law Commission) کے سپرد کر دیا گیا ہے۔ جس میں مختلف نظام ہائے زندگی وقوانین سے وابستہ افراد کو نمائندگی دی جاتی ہے۔ یہ کمیشن مختلف ریاستوں کی رائے اور مشورے سے معاہدات کی تحریر وتسوید کا کام کرتا ہے۔ اور جب ایک دفعہ مسودہ تکمیل تک پہنچ جائے تو پھر اسے ریاستوں کے سامنے منظوری کے لیے پیش کیا جاتا ہے۔ ریاستیں چاہیں تو اس مسودے کو مسترد بھی کرسکتی ہیں اور اس میں بہتری کے لیے مزید تجاویز بھی دے سکتی ہیں۔ بالآخر جب معاہدہ قابل قبول شکل میں آ جاتا ہے تو ریاستیں اس پر دستخط کرنا شروع کر دیتی ہیں۔ تاہم قانونی لحاظ سے اس معاہدے پر عمل کی پابند صرف وہی ریاستیں ہوتی ہیں جنہوں نے اس پر دستخط کیے ہوتے ہیں۔ بین الاقوامی قانون نے ریاستوں کا یہ حق بھی تسلیم کیا ہے کہ وہ چاہیں تو معاہدے کی بعض دفعات کو ماننے سے انکار کریں اور اس پر اپنے تحفظات (Reservation) ظاہر کریں [1]۔ اب اگر ۵۷ ریاستیں ایسی ہیں جو مسلمان ریاستیں کہلاتی ہیں اور یہ ۵۷ ریاستیں بین الاقوامی کمیشن

---

[1] Vienna convention on the law of treaties- 1969

میں معاہدات کی تیاری کے دوران میں غافل رہیں یا معاہدات پر بغیر سوچے سمجھے دستخط کریں یا اسلامی قانونی اصولوں کو ان معاہدات میں شامل کرنے کی کوشش نہ کریں یا ان معاہدات سے ان شقوں کو دور کرنے کی کوشش نہ کریں جو شریعت سے متصادم ہوں یا وہ ان شقوں پر اپنے تحفظات کا بھی اظہار نہ کریں تو اس کی ذمہ داری بین الاقوامی قانون پر کیسے ڈالی جا سکتی ہے اور یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ اس قانون کو غیر مسلموں نے اپنے مقاصد کے لیے وضع کیا ہے۔

غیر مسلموں کے وہ اقدامات جو مسلمانوں کے بین الاقوامی تعلقات کے حوالے سے جو شریعت اسلامیہ نے دار الاسلام اور دار الکفر کے درمیان جنگ و امن کے تعلقات کی تہذیب کے لیے نصوص کے ذریعے دیے ہیں۔ اگر ان کے موافق ہوں تو ان پر عمل پیرا ہونے میں کوئی قباحت نہیں اور نہ ہی وہ غیر مسلموں کی اطاعت کے زمرے میں آتے ہیں۔ اس لیے یہ کہنا کہ بین الاقوامی قانون معاہدہ نہیں بلکہ قانون ہے، لہٰذا ناجائز ہے۔ یہ موقف اختیار کرنا غلط ہے۔ کیونکہ یہ محض قانونی حیثیت حاصل ہونے کی وجہ سے ناجائز نہیں ہو جاتا بالخصوص جبکہ اس معاہدے میں وہی کچھ طے کیا گیا ہو جو شریعت نے مسلمانوں پر لازم ٹھہرایا ہو۔

کچھ لوگ بین الاقوامی قانون کو ریاستوں کی مرضی قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ بین الاقوامی عدالت انصاف کے ضابطے میں تصریح کی گئی ہے کہ بین الاقوامی قانون کے ماخذ میں محض رواج اور معاہدات ہی شامل نہیں بلکہ بین الاقوامی عدالتوں کے فیصلوں اور ممتاز ماہرین قانون کی تحریرات کے علاوہ مہذب اقوام کے نظامہائے قانون کے مسلمہ قواعد اور اصول بھی شامل ہیں۔[1]

ان مآخذ میں کچھ قانونی حیثیت رکھتے ہیں اور کچھ بنیادی تاہم اتنی بات طے ہے کہ ان سب کا ماخذ ریاستوں کی مرضی نہیں ہے۔

لہٰذا عصر حاضر کے مسلمانوں کو اس پلیٹ فارم پر اپنا کردار ادا کرنا چاہیے اور اس سلسلے میں شریعت سے متصادم شقوں کے خلاف اپنے تحفظات کا اظہار کرنا چاہیے اور مسلم حکمرانوں کو بھی دستخط کرنے سے پہلے اس پر مشترکہ بحث کروا کر اصولی موقف کو اپنانا چاہیے۔ البتہ وہ عالمی معاہدات جو اسلامی شریعت کی رو کے منافی نہیں ہیں ان کو ماننے سے انکار نہیں کرنا چاہیے بلکہ ان کی پابندی کرتے ہوئے انصاف کی راہ اختیار کرنی چاہیے۔

کیونکہ شریعت کے مسلمہ اصولوں کے مطابق معاہدات پر عمل لازم ہے۔ الا یہ کہ اس معاہدے کی کسی شق سے شریعت کی خلاف ورزی ہوتی ہو خلاف شریعت کسی شرط کا ماننا مسلمانوں کے لیے جائز نہیں ہے۔ سنن ترمذی میں ہے:

المسلمون علی شروطھم الا شرطا حرم حلالا او احل حراما[2]

''مسلمانوں پر اپنی (شرعی) شرائط کی پابندی لازم ہے مگر یہ کہ کوئی شرط جو حلال کو حرام اور حرام کو حلال کرے۔''

---

[1] میثاق ریاہا، دفعہ ۳۸ (1)

[2] جامع ترمذی، کتاب الاحکام باب ما ذکر عن رسول اللہ فی الصلح بین الناس، (۱۳۵۲) الکتب الستۃ، ص ۱۷۸۷۷

اگر کسی معاہدہ میں ایسی شرط مان بھی لی گئی ہو تو اس پر عمل ناجائز ہوگا۔ ارشاد نبوی ہے:

ما من شرط لیس فی کتاب اللہ فھو باطل ولو کان مائۃ شرط[1]

''جو شرط کتاب اللہ کے منافی ہو باطل ہے اگرچہ ایسی سو شرطیں ہی کیوں نہ ہوں۔''

شریعت نے مسلمانوں کو دوسری قوموں کے ساتھ تعلقات کے حوالے سے کچھ تفصیلی اور کچھ عمومی قواعد دے کر مسلمانوں پر ان کی پابندی لازم ٹھہرائی ہے۔ اگر بھی غیر مسلم بھی ان قواعد کو معاہدے کا حصہ بنا کر ان کی پابندی پر آمادہ ہوں تو مسلمانوں کے لیے اس قسم کے معاہدات میں شامل ہونا مستحسن قدم ہی ہوگا۔ رسول اللہ ﷺ نے مظلوموں کی مدد کے لیے قبل از بعثت کیے جانے والے معاہدے ''حلف الفضول'' میں حصہ لیا تھا اور بعد از بعثت بھی اس کی توثیق کی بلکہ یہاں تک فرمایا کہ اگر انہیں اس کی طرف اب بھی بلایا جائے تو وہ اب بھی اسے قبول کریں گے۔ نیز آپ نے جاہلیت میں کیے گئے حلف کے معاہدوں کی مکمل پابندی کا حکم بھی دیا۔ فرمان نبوی ہے:

اوفوا بحلف الجاھلیہ فان الاسلام لا یزید الا شدۃ[2]

''جاہلیت کے حلف کی مکمل پابندی کرو کیونکہ اسلام اس کی شدت میں ہی اضافہ کرتا ہے۔''

اگر فرمان نبوی کے مطابق زمانہ جاہلیت کے وہ معاہدے جو اسلام کی روح کے خلاف نہیں ان کی پاسداری لازمی ہے۔ تو آج کے دور کے وہ معاہدات جو اسلامی تعلیمات کے منافی نہ ہوں کیونکر ناجائز ہو سکتے ہیں۔

جہاد کے حوالے سے اعتراض:

کچھ لوگ عالمی معاہدات کو اس لیے بھی مسترد کرتے ہیں کہ ان میں جہاد کو صرف دفاعی جنگ تک محدود کر دیا گیا ہے۔ عالم اسلام کے ہاں ایک عرصہ تک یہ بحث جاری رہی کہ قتال کی علت اور غایت کیا ہے، فقہاء کے ایک گروہ کا موقف یہ تھا کہ قتال کی علت ''کفر'' ہے یہ قول امام شافعی اور بعض ظاہریہ و حنابلہ سے مروی ہے۔[3]

اس قول کے بموجب کفر کا وجود جب تک باقی رہے گا قتال جاری رہے گا۔ تاہم اس قول پر چند قوی اعتراضات وارد ہوتے ہیں۔ مثلاً رسول اللہ ﷺ نے صراحتاً عورتوں، بچوں اور دیگر غیر مقاتلین کے قتل سے منع فرمایا۔[4] اگر قتال کی علت کفر تھی تو اس استثناء کی کیا حیثیت ہوگی۔ مزید یہ کہ اگر قتال کی علت کفر ہو تو جنگ اس وقت تک جاری رہنی چاہیے جب تک کہ تمام کفار مسلمان نہ ہو جائیں یہاں تک کہ ہتھیار ڈالنے والوں کے لیے بھی بس دو ہی راہیں ہوں گی: اسلام قبول کریں، نہیں تو انہیں قتل کیا جائے گا۔ اس طرح یہ قول بنیادی قرآنی اصول لا اکراہ فی الدین سے متصادم ہو جاتا ہے۔ نیز اس قول کے بموجب اسلامی ریاست میں

---

[1] الجامع الصحیح للبخاری، کتاب البیوع، باب اذا اشترط فی البیع شروطا لا تحل (۲۱۶۸) الکتب الستہ، ص ۱۶۹

[2] جامع ترمذی، کتاب السیر باب ما جاء فی الحلف (۱۵۸۵) الکتب الستہ، ص ۱۸۱۵

[3] ابن رشد، بدایۃ المجتہد ونہایۃ المقتصد، الریاض، مکتبہ مصطفیٰ باز، ۱۹۹۰ء، ج ۱، ص ۳۷۱

[4] جامع ترمذی، السیر، باب ما جاء فی النہی عن قتل النساء والصبیان (۱۵۶۹) الکتب الستہ، ص ۱۸۱۳

غیر مسلموں کی اقامت اور ان سے جزیے کی وصولی بھی ناجائز ہو جاتی ہے۔

ان قباحتوں کے پیش نظر بعض لوگوں کی رائے یہ ہوئی کہ قتال کی علت ''کفر'' نہیں بلکہ ''شوکت کفر'' ہے گویا غیر مسلموں کو ان کے دین پر عمل کی اجازت تو ہوگی مگر انہیں یہ حق نہیں حاصل ہوگا کہ وہ منظم ریاست کی صورت میں رہیں اور قتال اس وقت تک جاری رہے گا جب تک کفر کی شان و شوکت باقی ہے۔ جب اسلام اور مسلمانوں کی بالادستی قائم ہو جائے تو غیر مسلموں کو یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ اسلامی ریاست کے زیر سایہ اپنے مذہب پر عمل کریں انہیں اسلام قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا۔ اس دوسرے قول کے لیے عام طور پر استدلال ان آیات و احادیث سے کیا جاتا ہے جن میں یا تو رسول اللہ ﷺ کی جنگوں کے خاص پہلو عذاب الٰہی کا ذکر کیا گیا ہو یا جن میں اسلام اور کفر کی مستقل نظریاتی کشمکش کا ذکر ہو۔ مثلاً یہ آیت:

> هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ [1]
>
> ''وہی اللہ ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ اسے پورے دین پر غالب کر دے خواہ یہ ان مشرکوں کو کتنا ہی ناگوار ہو۔''

بعض اوقات اس نظریے کے حامل لوگ ان آیات و احادیث سے استدلال کرتے ہیں جن میں قتال کا مطلقاً ذکر آیا ہے۔ مثلاً سورہ توبہ ہی میں حکم ہوا ہے:

> یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قَاتِلُوا الَّذِیْنَ یَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ وَلْیَجِدُوْا فِیْكُمْ غِلْظَةً [2]
>
> ''اے ایمان والو جنگ کرو ان کفار سے جو تمہارے قریب ہیں اور چاہیے کہ وہ تمہارے اندر سختی پائیں۔''

اس کے برعکس وہ آیات ہیں جو قتال کو محاربے کے ساتھ مقید کر دیتی ہیں۔ مثلاً سورہ البقرہ میں ہے:

> وَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ [3]
>
> ''اور تم اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں مگر زیادتی نہ کرو کیونکہ اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔''

ایسی صورت میں کہا جاتا ہے کہ سورہ التوبہ کی آیات نے سورہ البقرہ کی آیات کو منسوخ کر دیا ہے لیکن یہ دلیل انتہائی ضعیف ہے کیونکہ نسخ کی طرف تبھی جایا جاتا ہے جب جمع ممکن نہ ہو جبکہ یہاں حمل المطلق علی المقید کے قاعدے پر جمع ممکن ہے اور پھر سورہ البقرہ کی آیات کس طرح منسوخ ہو سکتی ہیں جبکہ وہ قتال کی علت بیان کر رہی ہیں۔

---

[1] التوبہ ۹:۳۳

[2] التوبہ ۹:۱۲۳

[3] البقرہ ۲:۱۹۰

ان وجوہات کی بنا پر جمہور فقہاء، جن میں امام ابو حنیفہ، امام مالک اور شافعیہ و حنابلہ کی اکثریت شامل ہے کی رائے یہ ہے کہ قتال کی علت ''کفر'' یا ''شوکت کفر'' نہیں بلکہ محاربہ ہے۔[1]

اگر مان لیا جائے کہ قتال کی علت کفر یا شوکت کفر کا خاتمہ ہے تو پھر اس کا لازمی تقاضا یہ ہوگا کہ مسلمان غیر مسلموں کے ساتھ مسلسل برسر جنگ رہیں گے۔ امن کا معاہدہ اول تو کیا نہیں جائے گا اور اگر کسی مصلحت یا ضرورت کے تحت کیا گیا تو وہ موقت ہو گا جس کی حیثیت جنگ بندی کی ہوگی۔

اس کے برعکس اگر جمہور فقہاء کی رائے کے مطابق مان لیا جائے کہ قتال کی علت محاربہ ہے تو پھر قتال اس وقت تک جاری رہے گا جب تک مخالفین کی جانب سے محاربہ پایا جائے جب وہ محاربہ ترک کر کے امن کے ساتھ رہنے پر آمادہ ہوں تو ان کے ساتھ جنگ نہیں کی جائے گی۔ جمہور کے قول کا لازمی تقاضا یہ بھی ہے کہ غیر مسلموں کے ساتھ امن کا معاہدہ جائز ہو چاہے یہ معاہدہ موقت ہو یا وقت کی قید سے آزاد ہو۔

جمہور علماء کی رائے کو اگر آج کے مسلمان اپنالیں تو پھر عالمی قانون کے تحت ہونے والے عالمی معاہدات میں دفاع کے لیے جنگ کے جواز سے اسلام کے تصور جہاد پر کوئی قدغن عائد نہیں ہوتی۔ عالمی معاہدات کے عدم جواز کے حوالے سے یہ اعتراض کہ اقوام متحدہ کے منشور کے تحت بعض اوقات فوجی کارروائی کسی غیر مسلم کی کمان میں مسلم ملک پر کی جاتی ہے تو مسلمان اس کا ساتھ کیوں کر دے سکتے ہیں۔

اصل بات جو ہم مسلمانوں کو کرنا چاہیے وہ یہ ہے کہ کارروائی جس کے بھی خلاف ہو خواہ وہ مسلم ہو یا غیر مسلم ممالک انصاف کے مطابق ہونی چاہیے۔ ذاتی اغراض یا پسند ناپسند کی بنا پر نہیں اسلام کا تصور عدل ذات پات بلکہ مذہبی تعصب سے بھی بالاتر ہے۔

ارشاد خداوندی ہے:

> يَآ أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ لِلّٰهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ وَاتَّقُوا اللّٰهَ إِنَّ اللّٰهَ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ ○[2]
>
> ''اے ایمان والو عدل پر قائم رہو اللہ کے لیے اس کی شہادت دیتے ہوئے اور کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس بات پر نہ ابھارے کہ تم عدل نہ کرو، عدل کرو کہ یہ تقویٰ سے قریب تر ہے اور اللہ سے ڈرتے رہو جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے پوری طرح باخبر ہے۔''

لہٰذا یہ بات قابل توجہ ہے کہ اگر دو گروہوں کے درمیان تنازعہ ہو اور ہمیں کسی ایک فریق کا ساتھ دینا پڑے تو کیا ہم اس بنیاد پر فیصلہ کریں گے کہ ان گروہوں میں مسلمان کون ہے؟ یا یہ دیکھیں گے کہ ظالم کون ہے اور مظلوم کون؟ اسلامی قانون نے مسلمانوں پر لازم کیا ہے کہ وہ اپنے اور غیر کی تمیز کیے بغیر ہر معاملے اور تنازعے میں حق کی گواہی دیں اور حق کا ساتھ دیں۔

---

[1] ابن رشد، بدایۃ المجتہد، ۱/۳۷۱

[2] المائدہ ۵: ۸

اقوام متحدہ کی طرف سے اگر کسی مسلم ملک پر بلا جواز ظالمانہ کارروائی کی جائے تو مسلمان ممالک معاہدہ کے خاتمہ کا اعلان کر کے اس ملک کی امداد کر سکتے ہیں۔ لہٰذا اس بنا پر عالمی معاہدات کے عدم جواز کو بنیاد بنانا مناسب نہیں۔ نیز عالمی معاہدات کے جواز یا عدم جواز پر مختلف معاہدات کی مختلف نوعیت میں معاملہ اس کے مطابق ہوگا۔ ایک معاہدے کا حکم دوسرے سے مختلف ہو سکتا ہے۔ البتہ ایک بات حتمی ہے کہ عقود اور شروط کے بارے میں اصل یہ ہے کہ وہ صحیح نافذ اور لازم ہوتے ہیں۔ لہٰذا عالمی معاہدات کے وہ تمام حصے جو اسلامی تعلیمات سے متصادم نہیں ان پر عمل درآمد شرعاً ضروری ہے۔

فصل دوم

جدید عالمی نظام اور اس کے عالم اسلام پر اثرات

خلیج کی جنگ میں اپنی کامیابی کے بعد دنیا کی واحد سپر پاور امریکہ نے اقوام متحدہ کے چارٹر کے مطابق مختلف معاہدات میں بندھی ہوئی اقوام عالم کو ان کی مشاورت اور قانونی تقاضے پورے کیے بغیر ایک جدید عالمی نظام کے پابند کرنے کی نوید سنائی۔ اس اعلان سے دنیا میں امن کا قیام اور اقوام متحدہ کے ادارے کا وجود اور مقصد خاک میں ملتا نظر آیا کیونکہ دنیا کی تقدیر کا فیصلہ اس اعلان کے بعد عملاً امریکن نیشنل سیکورٹی کونسل نے اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے اور پوری دنیا کا کوئی بھی ملک اس غاصبانہ استعماری ایکشن کے خلاف قرارداد تک لانے کی جرأت نہ کر سکا۔

جدید عالمی نظام کا تعارف و پس منظر:

اس جدید نظام کا تعارف خود امریکہ اور دنیا بھر کے دانشوروں نے مختلف مواقع پر یوں کروایا ہے:

جدید عالمی نظام کی نئی سامراجی حکمت عملی کا باضابطہ اعلان امریکہ کے سابق صدر جارج بش نے اکتوبر ۱۹۹۰ء میں اپنے ایک خطاب میں ان الفاظ میں کیا۔

March 6, 1991 (extracts). This speech has often been cited as the US administration's principal policy statement on the new order in the Middle East following the expulsion of Iraqi forces from Kuwait.

.... Tonight I come to this House to speak about the world the world after war. He recent challenge could not have been clearer. Saddam Hussain was the villain, Kuwait the victim. To the aid of this small country came nations from North America and urope, from Asia and South America, from Africa and the Arab world, all united against aggression.

Our uncommon coalition must now work in common purpose to forge a future that should never again be held hostage to the darker side of human nature.

Tonight in Iraq, Saddam walks amidst ruin. His war machine is crushed. His ability to threaten mass destruction is itself destroyed. His people have been lied to, denied the truth. And when his defeated legions come home, all Iraqis will see and

feel the havoc he has wrought. And this I promise you: for all that Saddam has done to his own people, to the Kuwaitis, and to the entire world, saddam and those around him are accountable.

All of us grieve for the victims of war, for the people of Kuwait and the suffering that scars the soul of that proud nation. We grieve for all our fallen soldiers and their families, for all the innocents caught up in this confict. And, yes, we grieve for the people of Iraq, a people who have never been our enemy. My hope is that one day we will once again welcome them as friends into the community of nations.

Our commitments to peace in the Middle East does not end with the liberation of Kuwait. So tonight let me outline four key challenges to be met.

First, we must work together to create shared security arrangements in the region. Our friends and allies in the Middle East recognize that they will bear the bulk of the responsibility for regional security. But we want them to know that just as we stood with them to repel aggression, so now America stands ready to work with them to secure the peace.

This does not mean stationing US ground forces on the Arabian peninsula, but it does mean American participation in joint exercises involving both air and ground forces. It means maintaining a capable US naval presence in the region, just as we have for over 40 years. Let it be clear: our vital national interests depend on a stable and secure Gulf.

Second, we must act to control the proliferation of weapons of mass destruction and the missiles used to deliver them. It would be tragic if the nations of the Middle East and Persian Gulf were now, in the wake of war, to embark on a new arms race. Iraq requires special vigilance. Until Iraq convinces the world of its peaceful intentions that its leaders will not use new revenues to re-arm and rebuild its menacing war machine Iraq must not have access to the instruments of war.

And third, we must work to create new opportunities for peace and stability in the Middle East. On the night I announced Operation Desert Storm, I expressed my hope that out of the horrors of war might come new momentum for peace. We have learned in the modern age geography cannot guarantee security and security does not come from military power alone.

All of us know the depth of bitterness that has made the dispute between Israel and its neighbors so painful and intractable. Yet, in the conflict just concluded, Israel and many of the Arab states have for the first time found themselves confronting the same aggressor. By now, it should be plain to all parties that peacemaking in the Middle East requires compromise. At the same time, peace brings real benefits to everyone. We must do all that we can to close the gap between Israel and the Arab states -and between Israelis and Palestinians. The tactics of terror lead nowhere. There can be no substitute for diplomacy.

A comprehensive peace must be grounded in United Nations Security Council Resolutions 242 and 338 and the principle of territory for peace. This principle must be elaborated to provide for Israel's security and recognition, and at the same time for legitimate Palestinian political rights. Anything else would fail the twin tests of fairness and security. The time has come to put an end to Arab-Israeli conflict.

The war with Iraq is over. The quest for solutions to the problem in Lebanon, in the Arab-Israeli dispute, and in the Gulf must go forward with new vigor and determination. And I guarantee you: no one will work harder for a stable peace in the region than we will.

Fourth, we must foster economic development for the sake of peace and progress. The Persian Gulf and Middle East form a region rich in natural resources with a wealth of untapped human potential. Resources once squandered on military might must be redirected to more peaceful ends. We are already addressing the

immediate economic consequences of Iraq's aggression. Now the challenge is to reach higher to foster economic freedom and prosperity for all people of the region.

By meeting these four challenges, we can build a framework for peace. I've asked secretary of state baker to go to the Middle East to begin the process. He will go to listen, to probe, to offer suggestions, and to advance the search for peace and stability. I have also asked him to raise the plight of the hostages held ■ Lebanon. We have not forgotten them, and we will not forget them.

To all the challenges that confront this region of the world. There is no single solution, no solely American answer. But we can make ■ difference. America will work tirelessly as a catalyst for positive change.

But we cannot lead a new world abroad if, at home, it's politics as usual on American defense and diplomacy. It's time to turn away from the temptation to protect unneeded weapons systems and obsolete bases. It's time to put an end to micro-management of foreign and security assistance programs, micro-management that humiliates our friends and allies and hamstrings our diplomacy. It's time to rise above the parochial and the pork barrel, to do what is necessary, what is right and what will enable this natin to play the leadership role required of us.

The consequences of the conflict in the Gulf reach far beyond the confines of the Middle East. Twice before in this century, an entire world was convulsed by war. Twice this century, out of the horrors of war hope emerged for enduring peace. Twice before, those hopes proofed to be a distant dream, beyond the grasp of man.

Until now, the world we've known has been a world divided - a world of barbed wire and concrete block, conflict and cold war.

Now, we can see a new world coming into view. A world in which there is the very real prospect of a new world order. In the words of Winston Churchill, a "world

order" in which "the principles of justice and fair play ... protect the weak against the strong..." A world where the United Nations, freed from cold war stalemate, is poised to fulfil the historic vision of its founders. A world in which freedom and respect for human rights find a home among all nations.

The Gulf war put this new world to its first test, and, my fellow Americans, we passed that test.

For the sake of our principles, for the sake of the Kuwaiti people, we stood our ground. Because the world would not look the other way. Ambassador (Saud Nasir) al-Sabah, to-night, Kuwait ■ free.

Tonight as our troops begin to come home, let us recognize that the hard work of freedom still calls us forward. We've learned the hard lessons of history. The victory over Iraq was not waged as "a war to end all wars." Even the new world order cannot guarantee an era of perpetual peace. But enduring peace must be our mission ...[1]

جارج بش نے اس نیو ورلڈ آرڈر کے ذریعے نیو ورلڈ آرڈر کے ذریعے اپنا نقطہ نظر کو واضح کیا اور اپنے اغراض و مقاصد کا اظہار کیا نیز نیو ورلڈ آرڈر کو اسلحہ کی تخفیف اور بین الاقوامی امن کے قیام کی پالیسی قرار دیا۔

جارج بش کی ۱۳ اپریل ۱۹۹۱ء کی تقریر سے نیو ورلڈ آرڈر کی اور زیادہ وضاحت ہو جاتی ہے۔

A New World Order really describes in regards to the us, new international responsibilities imposed by our successes. It refers to new ways of working with the other nations to deter aggression and achieve stability, prosperity and above all peace. The cold war's end has not unfortunately delivered us into an era of prepetual peace.

As cold threats recede, new threats emerge. The challenge to us (the US) and the international community to find ways of keeping the dangers of disorder at day.[2]

جارج بش نے اپنی اس تقریر میں اپنی کامیابیوں کو بنیاد بنا کر اپنی عالمی ذمہ داریوں کو نیو ورلڈ آرڈر قرار دیا ہے اور سرد جنگ کے کچھ تجربات کو بنیاد بناتے ہوئے نئی حکمت عملی اپنانے کی ضرورت واضح کی ہے۔

---

[1] www.al-bab.com/arab/docs/pal/pal10.htm

[2] do

"امریکہ کو سرد جنگ میں کچھ تجربات حاصل ہوئے جن کو مدنظر رکھتے ہوئے امریکہ کو نئے سامراجی دور کے لیے نئی حکمت عملی کی اشد ضرورت تھی جس کی تشکیل میں درج ذیل عوامل پیش نظر تھے:

(i) ویت نام کی جنگ میں امریکی فوجوں کی شکست نے امریکہ کو دفاعی حکمت عملی میں تبدیلی کی ضرورت کا احساس دلایا۔

(ii) ایران میں اسلامی انقلاب کی آمد سے اس خطہ میں امریکی مفادات کو خاصا نقصان پہنچا تھا۔

(iii) ایران عراق جنگ کے ختم ہو جانے سے امریکی مفادات کی کما حقہ تکمیل نہ ہو سکی۔

(iv) مشرق وسطیٰ میں عراق ایک بڑی اسلامی طاقت بن کر ابھرا تھا۔

(v) اسرائیل کے خلاف فلسطینیوں کی تحریک آزادی (انتفاضہ) کی بڑھتی ہوئی کاروائیاں امریکی مفادات کے لیے سخت نقصان کا باعث ہو سکتی تھیں۔

(vi) جرمنی کا متحد ہو جانا جس سے مشرقی یورپ میں وسیع پیمانے پر تبدیلیاں رونما ہوئیں۔

(vii) امریکہ میں بے روزگاری اور اقتصادی بحران میں اضافہ ہوا۔

(viii) عالمی تجارت میں جاپان کی ابھرتی ہوئی اقتصادی قوت اور امریکی مصنوعات کا عالمی منڈیوں میں گرتا ہوا معیار اس کے لیے سخت تشویش کا باعث تھا۔

(ix) غیر جانبدار تحریک NAM کے بیشتر ممالک کا امریکہ اور سوویت یونین کے ورلڈ آرڈر کی اطاعت سے انکار اور اپنی قومیت پر مبنی خارجہ پالیسیوں کی تشکیل امریکہ کے لیے سخت سیاسی دھچکا تھا۔

(x) امت مسلمہ میں بیداری کی لہر اور فلسطین، کشمیر اور وسط ایشیا میں آزادی کی تحریکوں میں شدت کا عنصر امریکی مفادات کے لیے قابل قبول نہ تھا۔

(xi) جرمنی کے اتحاد کے علاوہ جاپان، فرانس اور EEC (یورپین اکنامک کمیونٹی) کا سیاسی اور اقتصادی طور پر مضبوط ہو جانا بھی امریکہ کے لیے چیلنج تھا۔

(xii) دنیا بھر میں تجارتی بنیادوں پر نئے علاقائی اتحادوں (Free Trade Zones) کا قیام امریکی مفادات کے لیے تشویش کا باعث تھا۔

امریکہ کے پالیسی ساز ادارے ایک عرصہ سے محسوس کر رہے تھے اور امریکہ پر ان تبدیلیوں اور بین الاقوامی رویوں کے باعث یہ واضح ہو گیا تھا کہ پرانے ورلڈ آرڈر کے ذریعے امریکہ دنیا میں اپنی خواہش اور مرضی کا نظام مسلط نہیں کر سکے گا۔ چنانچہ پوری دنیا میں بلاشرکت غیرے حکمرانی کے خواب کو عملی جامہ پہنانے اور دنیا کی تمام قوموں کو سیاسی، اقتصادی، دفاعی اور فوجی اعتبار سے اپنے زیر سایہ کرنے کے لیے امریکہ نے نئی سامراجیت کا لائحہ عمل پیش کیا اور اسے نیو ورلڈ آرڈر کا نام دیا اور عالمی سطح پر اس کے نفاذ کا اعلان کر دیا"[1]

---

[1] نیو ورلڈ آرڈر اور عالم اسلام، ص ۲۱، ۲۲

دنیا بھر کے مفکرین اور تجزیہ نگاروں نے اس عالمی نظام پر جس طرح تبصرہ کیا ان میں سے چند ایک یہاں درج کیے جاتے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ نیو ورلڈ آرڈر کی اصل شکل کیا ہے۔

ڈاکٹر اسرار احمد نے لکھا:

''یہ یہودیوں کا نیو ورلڈ آرڈر ہے۔''[۱]

چومسکی نے نیو ورلڈ آرڈر کے بارے میں کہا:

''مطلب ہے ہم تمہارے آقا ہیں اور تم ہمارے بوٹ صاف کرو۔''[۲]

پروفیسر خورشید احمد کے بقول:

''اس کا ہدف امریکہ کی بالادستی ہے۔ معاشی اعتبار سے جرمن اور جاپان پر اور نظریاتی اعتبار سے اسلام اور اسلامی تحریکات پر۔''[۳]

امجد حیات ملک کے خیال میں:

''امریکی سرکاری اداروں اور عمائدین کے بیانات کے مطابق امریکی نیو ورلڈ آرڈر کے تین بنیادی ستون ہیں: (۱) جمہوریت (۲) انسانی حقوق (۳) آزاد معیشت۔''[۴]

صفدر محمود کی رائے ہے:

''یہ نام مائٹ از رائٹ یعنی جس کی لاٹھی اس کی بھینس اور یہ سارے کام اب اقوام متحدہ کے پلیٹ فارم سے لیے جائیں گے۔''[۵]

طارق وحید بٹ نے اپنی کتاب نیو ورلڈ آرڈر میں اپنی رائے کا اظہار اس طرح کیا:

''امریکہ کے نئے عالمی نظام کا محور و مرکز بھی یہی سوچ ہے کہ وہ اپنی معیشت کے استحکام اقتصادی بحران پر قابو پانے اور نئی ابھرتی ہوئی اقتصادی اور صنعتی طاقتوں کا مقابلہ کرنے اور خاص طور پر جدید ٹیکنالوجی پر اپنی اجارہ داری قائم رکھنے، مذہبی عصبیت کے حوالے سے مسلمان ممالک کو ہر شعبہ زندگی میں پسماندہ رکھنے، ان کے وسائل پر قبضہ جمانے اور جدید ایٹمی ٹیکنالوجی سے انہیں محروم کرنے کے لیے ساری تگ و دو کر رہا ہے۔''[۶]

---

[۱] روزنامہ جسارت، کراچی، ۱۴ مئی ۱۹۹۴ء
[۲] روزنامہ جنگ، کراچی، ۲۳ نومبر ۱۹۹۴ء
[۳] روزنامہ جسارت، کراچی
[۴] امجد حیات ملک، نیو ورلڈ آرڈر، لاہور: احمد پرنٹنگ پریس، ۱۹۹۴ء، ص ۱۱
[۵] روزنامہ جنگ، کراچی، ۹ ستمبر ۱۹۹۴ء
[۶] نیو ورلڈ آرڈر اسلام اور پاکستان، گلشن ہاؤس ۱۸ احمر نگ روڈ لاہور، س ن۔ ص ۲۲

طارق مجید نیو ورلڈ آرڈر کو ایک یہودی منصوبہ قرار دیتے ہوئے رقمطراز ہیں:

"The SO called "N W O" is not at all and American concept or scheme. It is a long thought out project of the 210 mist jewelry to change the shape of the world in all spheres of life ie political, economic, military, social, cultural moral and ideological. In order to complete and secure its control over the world. The force of Islam is the only remaining obstacle in the way of the 21 onist jewery. That is way the Muslim people and the Muslim countries are its primary targets." [1]

ناؤم چوسکی نے نیو ورلڈ آرڈر کے اعلان کے ابتدائی زمانہ میں یوں لکھا تھا:

''سرد جنگ کے خاتمے کے بعد یہ باور کرایا گیا کہ اب قومیں آزاد ہیں، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اب چھوٹی قومیں ایک بے بس غلامی کی طرف دھکیل دی گئی ہیں۔ خلیج کی جنگ میں امریکی اسلحہ بارود کی گھن گرج میں امریکی صدر جارج بش نے New World Order کا اعلان کیا۔ حقیقتاً اس نیو ورلڈ آرڈر کی Outline کی تفصیل آج تک سامنے نہیں آئی اور اگر یہ کہا جائے کہ واحد عالمی طاقت امریکہ کا نیو ورلڈ آرڈر ایک Blind عالمی نظام ہے تو غلط نہ ہوگا۔ اس کے تحت وہ اقتصادی، معاشی اور عسکری حوالے سے جو چاہے کرنے کا حق رکھتا ہے۔'' [2]

مذکورہ بالا مباحث سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ امریکہ دنیا میں اپنی مرضی اقتصادی معاشی اور عسکری حوالے سے نافذ کرنا چاہتا ہے اور اس کی اس پالیسی کا نام نیو ورلڈ آرڈر ہے جس کی وضاحت کے لیے امریکہ نے شروع میں بہت محتاط الفاظ کیے لیکن بعد میں کھلم کھلا اپنے عزائم دنیا کے سامنے رکھ کر انہیں پورا کرنے کے لیے کسی کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اپنی طاقت کا استعمال شروع کر دیا ہے جس سے دنیا کا عالم درہم برہم ہوگیا ہے۔

امریکہ اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے صرف امریکن نیشنل سیکورٹی کونسل کی سفارشات کو حرف آخر سمجھتا ہے۔ امریکن نیشنل سیکورٹی کونسل کی سفارشات نیو ورلڈ آرڈر سے متعلق ۶ مارچ ۱۹۹۱ء کو وائس آف امریکہ سے نشر کی گئیں۔

روزنامہ ''الراعیہ'' نے اس رپورٹ کو شائع کیا اس کے مندرجات درج ذیل ہیں:

---

[1] The Global Ceome for A New World Order,Tayyab Iqbal Printers, Lahore, page 114

[2] ناؤم چوسکی، ورلڈ آرڈر کی حقیقت مترجم محمد احسن مخدوم، ص ۱۰

1. the future security arrangements should involve other countries like France, England, Italy and Russia.
2. The Non-Arab countries like Iran and Turkey should also be included to work with those countries which stood against Iraq viz. Gulf countries, Egypt, Syria and Morocco.
3. In future our policy should remain so as not to allow any Military power to be created as it happened in the case of Iran and Iraq. The balance of power would be maintained in future. The opportunity would not be given to any Arab country of Turkey or Iran or Ethopia to challenge the American interest in the region.
4. Defense capacity of the Gulf countries should be improved. Military training should be made compulsory.
5. Destructive weapons should not be sold to the Arab Islamic countries.
6. In case of selling these weapons the following points will be kept in mind.

   a) It should not be in large quantities.

   b) Should not be able to move quickly.

   c) Particular types of weapons should not be sold at all, but should be rented out.
7. Peace force should be established with the collaboration of Syria and Egypt and small representation of Non-Arab countries like Iran, Turkey and Ethopia.
8. To distribute the wealth of Gulf Countries. A bank should be established for reconstruction. It should be run by the Gulf Countries. But the main policies will be formulated by USA, England and France. The main functions for the Bank should be as follow:-
   - To supervise the peace force.
   - To build constructive projects in the countries which supported the

Allied Forces.

- Such projects to be established in some other Non-Arab Countries like Iran, Turkey and Ethopia who will play an important role in keeping peace in the region
- Nominal aids to be given to the countries like Yemen, Tunis and Sudan. While giving aids to these countries the following points should be kept in mind:-

a) Aids to be given only for nominal reconstruction of these countries

b) Strong propagation should accompany these aids.

c) The aids should be utilized to effect the political decisions of these countries.

9. The system of Government must be changed in all those Arab Countries which are not co-ordinating with the American policies.
10. As for as the Gulf countries are concerned there is no need to touch them as they always accept the American decisions. Efforts should be made to give authority to those persons who have studied in the west. Efforts should also be made to change the culture of this region.

The Other Countries

1. SYRIA

Hafiz Al Asad is acceptable leader to us. He should be given opportunity to continue his rule so that he becomes powerful. He has proved to be a faithful ally.

2. EGYPT

The present Government has taken the right direction. During the time of Abdul Nasser and Sadat the democracy was badly effected but now the democracy should be give the opportunity to develop so that all people excute their activities freely and the will help crushing fundamentalism. To stop the

increasing influence of Islam and the potential threats. It is necessary to take the following steps:-

The Muslims should be engaged in disputes and differences amongst themselves to finish their strength. As Mohammad al Ghazali is being used in rasing disputes over the position of women in Islam.

4. The Government of those Gulf Countries should be changed which are trying to implement Islam seriously. If such countries are taking steps to implement Islam, the efforts should be made to stop them implementing shariah punishment and all other Islamic activities. Some of the shariah laws to be changed.

The Mashaekh i.e. Ulama should not be given the opportunity to use the media of information to influence public opinion.

This should not be confined to the Gulf Countries only but to all Islamic Countries. The Islamic elements should not be allowed to influence the people through the Educational and information medias. This is the only way to stop the Islamic elements to influence the public opinion. For example Abdul Aziz Abdul Sattar and Dr. Yousuf Al Qarzawi were having profound influence. Similarly some of the Iraqis got Kuwaiti nationality and became strong and leaders of Islamic elements.

5. It is necessary and very important that Arab and Muslim man-power should be stopped in Gulf countries. The workers should be brought from Philippines. Sri Linka and Thailand. Through these workers the Islamic values and spirit will be abolished. If it is necessary to bring employees from other countries, they should not be brought from Pakistan and Bangladesh. To fulfil this object other countries should be contacted.

6. The systems of Education and Culture to be changed and Radio and T.V. programmes to be expanded.

7. The Islamic elements like "Salafi" and "Ikhwani" should be kept under keen observation.
8. Those countries which are having Islamic thinking must be engaged in differences and problems like Pakistan and Sudan[1]

اس رپورٹ کی روشنی میں اہداف یہ ہو سکتے ہیں۔

۱۔ امریکہ فرانس برطانیہ اٹلی اور روس کا تعاون اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے حاصل کرے گا۔

۲۔ مستقبل میں کسی ملک کو ایران اور عراق کی طرح فوجی طاقت نہ بننے دیا جائے گا۔

۳۔ عرب مسلمان ملکوں کو تباہ کن ہتھیار فروخت نہیں کیے جائیں گے۔

۴۔ امریکی مفادات اور پالیسیوں کے خلاف نظام حکومت عرب ریاستوں میں تبدیل کر دیے جائیں گے۔

۵۔ مشرق وسطیٰ کی تہذیب وثقافت تبدیل کرنے کے لیے ان کی حکومت کی باگ ڈور مغربی تعلیم یافتہ لوگوں کے سپرد کی جائے گی۔

۶۔ شام اور مصر کی موجودہ حکومتوں سے بنیاد پرستوں کو کچلنے میں امداد لی جائے گی۔

۷۔ خلیجی ممالک کی دولت کی تقسیم کے لیے ایک بنک بنایا جائے گا جس کی نگرانی اور پالیسی کا کام امریکہ فرانس اور انگلینڈ کے پاس ہوگا۔

مذکورہ اہداف سے پتہ چلتا ہے کہ امریکہ مشرق وسطیٰ اور مکمل عرب ممالک پر طاقت کے زور پر اپنی من مانی نافذ کرنا چاہتا ہے اور اس کے لیے وہاں کے موجودہ حکمرانوں اور اپنے دوست ممالک کو ساتھ ملا کر اپنا استعماری نظام مسلط رکھنا چاہتا ہے۔ اور ان ممالک کے لوگوں کی ثقافت تک کو تباہ کرنے کے لیے سرگرم ہے۔

مذہبی آزادی اور اسلامی اثر ونفوذ کو روکنے کے اقدامات:

اپنی مذکورہ رپورٹ میں امریکہ اپنے نیو ورلڈ آرڈر کے ذریعہ مسلمانوں کی مذہبی آزادی پر قدغن لگانے کے ساتھ ساتھ اسلام کے بڑھتے ہوئے اثر ونفوذ کو روکنے کے لیے اقدامات تجویز کرتا نظر آتا ہے جو حسب ذیل ہیں:

امریکی مفادات کے خلاف مسلمانوں کی مزاحمتی طاقت کو بڑھنے سے روکنے کے لیے مسلمانوں کو آپس کے جھگڑوں اور اختلافات میں مصروف رکھا جائے گا۔

۲۔ نفاذ اسلام کے لیے سنجیدہ کوشش کرنے والی حکومتوں کو تبدیل کروا دیا جائے گا۔

۳۔ اسلام پسند عناصر کو کسی ملک میں بھی تعلیمی اداروں اور ذرائع ابلاغ کے ذریعے عوام تک رسائی حاصل کرنے اور رائے عامہ ہموار کرنے کا موقعہ فراہم نہیں کیا جائے گا۔

۴۔ موثر مشائخ اور علماء کو ذرائع ابلاغ کے ذریعے رائے عامہ کو متاثر کرنے کا موقع فراہم نہ کیا جائے گا۔

---

[1] روزنامہ الرابعہ، ۳ جنوری، ۱۹۹۲ء، قطر

۵۔ خلیجی ریاستوں میں مسلمانوں کو روزگار کے مواقع فراہم نہیں کیے جائیں گے بلکہ یہ افرادی قوت فلپائن، سری لنکا اور تھائی لینڈ سے حاصل کی جائے گی۔ ان لوگوں کے ذریعے خلیجی ریاستوں کی تہذیب و ثقافت تبدیل کر دی جائے گی۔ اسلامی اقدار اور اسلامی رسومات کو ختم کر دیا جائے گا وہاں پاکستان اور بنگلہ دیش کے افراد کو روزگار پر مکمل پابندی لگا دی جائے گی۔

۶۔ تمام ممالک کے تعلیمی اور ثقافتی اداروں میں اصلاحات لائی جائیں گی۔

۷۔ اسلام پسند عناصر اور اسلامی قیادت پر سختی سے نظر رکھی جائے گی۔

۸۔ وہ ممالک جو سوڈان اور پاکستان کی طرح اسلامی نظریات اور سوچ کے حامل ہوں گے انہیں اختلافات اور مسائل میں مبتلا کر دیا جائے گا۔

مذکورہ اقدامات کو نیشنل سیکورٹی کونسل کی رپورٹ کے مطابق نیو ورلڈ آرڈر کے تحت قابل عمل قرار دے دیا گیا ہے اور ان پر تیزی سے عمل جاری ہے۔ امریکہ کے تمام ادارے پینٹاگون اور سی آئی اے سے لے کر امریکن انفارمیشن ایجنسی تک ان اقدامات پر عملی کارروائی کرتے نظر آ رہے ہیں تو ان حالات میں امریکہ کے خلاف نفرت اور انتقامی جذبات کا پیدا ہونا لابدی ہے جس سے دنیا میں امن کی راہیں مسدود اور جنگ اور انارکی کے جذبات مسلسل بڑھ رہے ہیں۔

اور اقوام متحدہ کا ادارہ جس کے بہت سے اقدامات اور تساہل سے متعلق دنیا کے بیشتر ممالک پہلے یہ تحفظات رکھتے تھے۔ نیو ورلڈ آرڈر کے نفاذ کے بعد ایک عضو معطل یا پھر امریکہ اور اس کے اتحادیوں کا دست نگر بنا دکھائی دیتا ہے۔

مسئلہ فلسطین اور نیو ورلڈ آرڈر:

ذیل میں مسلم دنیا کے بڑے بڑے مسائل کے چند سلگتے مسائل اور ان میں نیو ورلڈ آرڈر کا کردار درج ذیل ہے:

عالمی مسائل میں فلسطینی عوام کی آزادی اور ان کے وطن کی بازیابی کا مسئلہ بیسویں صدی کا اہم ترین مسئلہ رہا ہے۔ جس کے حل کے لیے اقوام متحدہ اپنی تمام قراردادوں پر عمل درآمد کے لیے مجبور نظر آتی رہی۔ اس کی بڑی وجہ امریکہ اور اسرائیل گٹھ جوڑ قرار دیا جا سکتا ہے۔ امریکہ نے اپنے نیو ورلڈ آرڈر کے ذریعے اس مسئلہ کے حوالے سے نام نہاد امن مذاکرات کے بعد ۱۳ ستمبر ۱۹۹۳ء کو وائٹ ہاؤس میں پی ایل او اسرائیل امن معاہدے پر یاسر عرفات اور اسرائیل کے وزیر اعظم اسحاق رابین سے دستخط کروائے۔ اس معاہدے کے ذریعے پی ایل او سے اسرائیل کو باضابطہ طور پر تسلیم کروالیا گیا۔ اسرائیل نے معاہدے کے تین ماہ بعد اپنی فورسز کو بعض مقبوضہ علاقوں سے نکالنے اور فلسطینیوں کو غزہ اور جریکو کے مقبوضہ علاقوں میں محدود حق خود اختیاری دینے کا وعدہ کیا۔

یہ سمجھوتہ فلسطین کے مسائل حل کروانے کے بجائے امریکی نیو ورلڈ آرڈر کے مقاصد پورے کرتا نظر آیا کیونکہ اس کے ذریعے آزادی فلسطین کی پوری تحریک کو ایک بہت بڑے بحران کا شکار کر دیا گیا اور عربوں کی اسرائیل کے خلاف تمام مخالفانہ پالیسیوں کو ختم کروا دیا گیا اور اسرائیل کے وجود کو پی ایل او سمیت اکثر عرب ممالک سے تسلیم کروالیا گیا اور معاہدے پر عمل کرواتے کی بجائے انتفاضہ سمیت دوسری تحریکوں کو پی ایل او کا دشمن بنا کر آپس میں لڑا دیا گیا۔ اس طرح نیو ورلڈ آرڈر کی منشاء کے مطابق فلسطینی اور عرب آپس میں ایک دوسرے کے دشمن بن چکے ہیں۔ فلسطین کی آزادی کا مسئلہ دفن ہو چکا ہے البتہ عظیم تر اسرائیل کے

قیام کی راہیں امریکی نیو ورلڈ آرڈر کے تعاون سے صاف نظر آ رہی ہیں۔ جس کے نتیجہ میں ایک بہت بڑی عالمی جنگ سے دنیا ہمکنار ہو سکتی ہے۔ نیو ورلڈ آرڈر کے اعلان کے ساتھ ہی اسرائیلی وزیر اعظم نے اعلان کیا تھا کہ عظیم تر اسرائیل وجود میں آ چکا ہے۔[1]

مسئلہ کشمیر اور نیو ورلڈ آرڈر:

کشمیر کا مسئلہ پچھلی نصف صدی سے بڑی طاقتوں اور عالمی اداروں کے سامراجی اور استحصالی ہتھکنڈوں کی وجہ سے حل ہوتا نظر نہیں آتا۔ بھارت کشمیر میں بین الاقوامی قوانین اور انسانی حقوق کی وسیع پیمانے پر خلاف ورزی کر رہا ہے جس کے نتیجے میں لاکھوں جانیں ضائع ہو چکی ہیں۔ اقوام متحدہ کی قراردادیں اس مسئلہ کے حل کے لیے بے بس دکھائی دیتی ہیں کیونکہ کشمیریوں کی آزادی کے مطالبہ میں امریکہ کو اپنا کوئی مفاد نظر نہیں آتا اس لیے نیو ورلڈ آرڈر کا وادی کشمیر پر کوئی اطلاق نہیں ہوتا البتہ بھارت کی امداد کیونکہ امریکہ کی سامراجی پالیسی کے لیے معاون نظر آتی ہے اس لیے نیو ورلڈ آرڈر کے تحت امریکہ جنوبی ایشیا میں بھارت کو وہ کردار دینا چاہتا ہے جو اس نے مشرق وسطیٰ میں اسرائیل کے سپرد کیا ہے۔ اسی سے جنوبی ایشیا کا امن تباہی کے دہانے کھڑا نظر آ رہا ہے۔

بوسنیا کا مسئلہ اور نیو ورلڈ آرڈر:

مشرقی یورپ کی واحد مسلمان ریاست بوسنیا ہرزیگوینا ایک ایسی اسلامی ریاست ہے جس کا وجود بلقان کی جنگوں کے وقت سے یورپی غیر مسلم اقوام کو برداشت نہیں ہے۔ روس کے مشرقی یورپ پر سے اثر و رسوخ کے خاتمے کے بعد سے سرب اور کروشیائی درندوں نے اس خطہ کو مسلمانوں کے وجود سے خالی کرنے کے لیے بے دردی سے مسلمانوں کا قتل اور مسلمان عورتوں اور بچوں پر انسانیت سوز مظالم ڈھائے۔ اس خطہ پر مسلمانوں پر ظلم اور بربریت کو امریکہ اور یورپی اقوام نے خاموش تماشائی بن کر دیکھا۔

امریکہ کے نیو ورلڈ آرڈر نے بوسنیا کے مسلمانوں کے درد کا کوئی مداوا نہیں کیا کیونکہ اس خطہ میں امریکہ کے مفادات کو کوئی خطرہ لاحق نہ تھا۔ یورپی اقوام نے بوسنیا کے مسئلہ کے حل کے لیے جتنے بھی مذاکرات کیے ہیں وہ سب سربیا اور کروشیا کے مفادات کے تحفظ کے لیے ہوئے۔ اس سلسلے میں جنیوا امن منصوبہ جس کے تحت 50% علاقہ سربوں کے لیے اور 30% مسلمانوں کے لیے اور 20% کروشیا کے لیے مقرر ہوا ہے۔ اس طرح ایک اسلامی ریاست کو ختم کرنے کی منصوبہ بندی کی گئی۔ مذکورہ تقسیم پر نیو ورلڈ آرڈر کی خاموشی اس بات کی دلیل ہے کہ امریکن نیو ورلڈ آرڈر صرف امریکی مفادات کے لیے کام کرتا ہے اس سے عالمی مسائل کے حل کی امید نہیں رکھی جا سکتی۔ اس کی موجودگی میں دنیا امن سے ہمکنار نہیں ہو سکتی۔

پاکستان اور نیو ورلڈ آرڈر:

امریکہ کے نیو ورلڈ آرڈر میں پاکستان اس کی نئی سامراجیت کے دوہرے معیار کا شکار نظر آتا ہے۔ ایک طرف تو پاکستان کو دہشت گردی کے خلاف جنگ میں اپنا حلیف قرار دیا جاتا ہے اور دوسری طرف پاکستان کے ایٹمی پروگرام کا خاتمہ بھی امریکی ترجیحات میں سرفہرست ہے۔

---

[1] امجد حیات ملک، نیو ورلڈ آرڈر، ص ۱۳

پاکستان کے ایٹمی پروگرام کا تعلق پاکستان کے دفاعی نظام سے ہے بھارت جو ۱۹۷۴ء میں ایٹمی دھماکہ کر چکا ہے اور امریکہ کی اپنی رپورٹوں کے مطابق ۱۰۰ سے زائد ایٹم بم استعمال کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے مسلسل پاکستان کے خلاف جارحیت کا مرتکب ہوتا رہا ہے اور کشمیر میں مسلمانوں کی نسلی تطہیر کا کام بھی منظم پیمانے پر جاری رکھے ہوئے ہے۔ بھارت مسلمانوں کے مذہبی جذبات کی مسلسل توہین کر رہا ہے اور انسانی حقوق کی وسیع پیمانے پر خلاف ورزیوں کا مرتکب ہو رہا ہے وہ کسی وقت بھی پاکستان کے خلاف جارحیت کا ارتکاب کر سکتا ہے۔ بھارت کے مذموم ارادوں میں جو چیز حائل ہے وہ صرف پاکستان کی ایٹمی توانائی کی صلاحیت ہے۔ امریکہ نے مشرق وسطیٰ میں عراق کے ایٹمی پروگرام کو جس طرح تباہ کیا تھا اور اس کے مقابلے میں اسرائیل کو ایک ایٹمی طاقت بنوایا تھا ایسا ہی معاملہ نیو ورلڈ آرڈر کے تحت پاکستان اور بھارت کے درمیان کروایا جا رہا ہے امریکہ بھارت کے مقابلے میں پاکستان کو اسی طرح بے بس دیکھنا چاہتا ہے جیسے وہ عراق سمیت تمام عرب ممالک کو اسرائیل کے مقابلے میں بے بس کر چکا ہے۔ اس مقصد کا حصول امریکہ اپنے نیو ورلڈ آرڈر کے تحت پاکستان میں جاری رکھے ہوئے ہے اور ہر قسم کا دباؤ ڈال رہا ہے۔

ان حالات میں پاکستان کے عوام امریکہ سے نفرت کا اظہار کیے بغیر کیسے رہ سکتے ہیں۔ اس لیے قیام امن کی راہ میں حائل نیو ورلڈ آرڈر کا متبادل ضروری ہے۔

پرامن بقائے باہمی پر مشتمل جدید عالمی نظام کی ضرورت

امریکہ کے جاری کردہ نیو ورلڈ آرڈر کے بعد پوری دنیا پر عملاً امریکہ کا راج قائم ہو چکا ہے اور اقوام متحدہ کا ادارہ بے بس یا امریکہ کے ذیلی ادارے کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ ان حالات میں اقوام عالم کو مل کر اقوام متحدہ کے ادارے کی نئے سرے سے تصویب اور تشکیل کا کام کرنا چاہیے اور اس ادارے کی نیو ورلڈ آرڈر کے بعد پیدا شدہ صورت حال کی روشنی میں اسے فعال اور اقوام عالم کے لیے قابل قبول بنانے کی ضرورت ہے۔ نیو ورلڈ آرڈر کی وجہ سے چونکہ سب سے زیادہ متاثر مسلمان اور اسلامی ممالک ہو رہے ہیں اس لیے انہیں اقوام عالم کو ساتھ ملا کر اقوام متحدہ کی تنظیم نو کروانے کے ساتھ ساتھ دنیا کی ایک بڑی اکثریت اور اپنے دور عروج کا شاندار ماضی رکھنے کی وجہ سے جدید دور کے تقاضوں کے مطابق جدید عالمی نظام پیش کرنے اور اسے قابل عمل بنانے کے لیے تگ و دو بھی کرنا ہوگی۔

ذیل میں اقوام متحدہ کے ادارے کی فعالیت برقرار رکھنے اور نیو مسلم ورلڈ آرڈر کے خدوخال کا ایک خاکہ پیش کیا جاتا ہے:

۱۔ اقوام متحدہ کے چارٹر اور تنظیمی ڈھانچے کی تشکیل نو:

کیونکہ دنیا کا Power Structure تبدیل ہو چکا ہے۔ سرد جنگ ختم ہو چکی ہے۔ دنیا کے تقریباً تمام خطوں میں سیاسی جغرافیائی اور فوجی نوعیت کی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں لہٰذا موجودہ عالمی سیاسی صورت حال کو دیکھتے ہوئے اقوام متحدہ کے چارٹر اور تنظیمی ڈھانچے کو از سر نو تشکیل دینے کی ضرورت ہے تاکہ اقوام عالم کو انصاف اور مساوات کے اصولوں کے مطابق اس ادارے میں نمائندگی مل سکے۔

۲۔ اقوام متحدہ کے ادارے کی بالادستی:

دنیا کے تمام ممالک کو امریکہ سمیت نئی تشکیل شدہ اقوام متحدہ کے تابع کیا جائے۔ نیو ورلڈ آرڈر امریکہ کی نیشنل سیکورٹی کونسل، پنٹاگون اور سی آئی اے سب کی الگ سے کارروائیاں کالعدم اور غیر قانونی قرار دی جائیں۔

۳۔ ویٹو کا حق ختم:

اقوام متحدہ کی تشکیل نو میں کسی بھی ملک کو پوری دنیا پر اپنی مرضی ٹھونسنے کا حق ہرگز نہ دیا جائے۔ لہٰذا ویٹو کے حق کو ختم کیا جائے۔

۴۔ آبادی کے لحاظ سے نمائندگی:

مسلم سمیت تمام اقوام عالم کو ان کی آبادی کے لحاظ سے اقوام متحدہ کے تمام اداروں میں بھرپور اور مؤثر نمائندگی دی جائے۔

۵۔ ایٹمی توانائی سے استفادہ:

ایٹمی توانائی سے استفادہ کے لیے بین الاقوامی انصاف پر مبنی پالیسی تشکیل دی جائے تاکہ تمام ممالک اپنے پرامن اور اقتصادی مقاصد کے لیے اسے استعمال کر سکیں۔

۶۔ دوہرے معیار کا خاتمہ:

دنیا کی بڑی طاقتوں کو دوہرے معیار کی بجائے انصاف پرمبنی رویہ اپنانا ہوگا تاکہ ظلم کا شکار ہونے والے ممالک عالمی امن کو خراب کرنے کا ذریعہ نہ بنیں۔ مثلاً امریکہ کا اسرائیل اور بھارت کو غیر مشروط امداد اور سرپرستی کرنا اور فلسطینیوں اور کشمیریوں کے معاملے میں کمل کرساتھ بھی نہ دینا یہ رویہ ختم کرنا ہوگا۔

۷۔ اقوام متحدہ تخفیف اسلحہ کے لیے جو بھی قانون یا فارمولہ بنائے اس میں عالمی تحفظات کی ضمانت ہونی چاہیے اور اس کا اطلاق یکساں قانون کے مطابق ہونا چاہیے۔

۸۔ کشمیر فلسطین بوسنیا صومالیہ اور جس ملک میں بھی ظلم وستم اور حق خودارادیت کی نفی ہو رہی ہو اقوام متحدہ کو بلا امتیاز مذہب وقوم ان کی دادرسی کے لیے فوری موثر کردار ادا کرنا ہوگا تاکہ اقوام عالم اس ادارے پر بھروسہ کرسکیں۔

مسلمان اپنی مذہبی تعلیمات کی روشنی میں دنیا کے ساتھ ان تمام معروف کاموں میں اور معاہدات میں شامل ہو سکتے ہیں۔ جو ان کی مذہبی تعلیم کے آڑے نہ آئے۔ اسلام ایک دین امن ہے اور مسلمانوں نے اپنے قرن اول میں دنیا کو ایک پرامن جگہ بنانے اور انسانیت کی فلاح و بقا اور احترام انسانیت پرمبنی معاشرہ قائم کرنے کی اعلیٰ مثالیں قائم کی ہیں۔ اسلام چونکہ قیامت تک آنے والے حالات و واقعات کے مطابق راہنمائی فراہم کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اس لیے موجودہ حالات میں امت مسلمہ کے لیے اسلامک ورلڈ آرڈر کے خدوخال کچھ اس طرح سے ہو سکتے ہیں:

۱۔ اقتصادی پالیسی

امریکہ اپنے نیو ورلڈ آرڈر کے ذریعے عالم اسلام کو کمزور اور ان کے اقتصادی وسائل پر قبضہ کرنے کا عزم کیے ہوئے ہے۔ عالم اسلام کو اپنی ایک مضبوط اور مربوط اقتصادی بھلائی کے لیے مسلمان ممالک پر مشتمل "مسلم اکنامک کمیونٹی" تشکیل دے کر اپنی معیشت کا تحفظ کرنا ہوگا۔ امت مسلمہ کے تمام اداروں خصوصاً OIC کو چاہیے کہ وہ مسلم ممالک کی مشترکہ منڈی قائم کرے اور علاقائی اور بین الاقوامی سطح پر اقتصادی تعاون کے موثر منصوبوں کو فروغ دیں اور اس سلسلے میں مغربی ایشیا اور وسط ایشیا میں اقتصادی تعاون کی تنظیم (ECO) کو مضبوط بنیادوں پر استوار کرلیں تو یہ عالم اسلام کا ایک بڑا اقتصادی بلاک بن سکتا ہے۔ جسے سیاسی اور دفاعی بلاک میں بھی تبدیل کیا جاسکتا ہے اور پھر اسے دوسرے خطوں کے ساتھ بھی جوڑا جاسکتا ہے۔ اس طرح عالم اسلام ورلڈ بنک اور آئی ایم ایف کی معاشی اجارہ داریوں سے آزادی حاصل کرسکتا ہے۔ اس عمل کے لیے ہمیں اسلامی بھائی چارہ اور اخوت کے جذبات کو ابھارنا ہوگا اور پیغمبر اسلام کے ان فرمودات کو مشعل راہ بنانا ہوگا۔ جن میں باہم تعاون اور معاشی جدوجہد کی تلقین اور میانہ روی کو اپنانے کی تلقین کی گئی ہے:

المومن للمومن کالبنیان یشد بعضہ بعضا[۱]

"تمام مومن ایک عمارت کی مانند ہیں جس کا ایک حصہ دوسرے حصے کو مضبوط کرتا ہے۔"

۱۔ الجامع الصحیح للبخاری، کتاب المظالم، باب نصر المظلوم (۲۴۴۶) الکتب الستۃ، ص ۱۹۴

ما عال من اقتصد[1]

''جس نے میانہ روی اختیار کی وہ محتاج نہ ہوا''۔

الاقتصاد فی النفقة نصف المعیشة[2]

''خرچ میں میانہ روی آدھی معیشت ہے۔''

۲۔ اسلامک اکنامک یونینز کا قیام:

عالم اسلام کو بین الاقوامی تجارت کے فروغ کے لیے اسلامک اکنامک یونینز قائم کرنا ہوں گی اور پھر ان کے ذریعے زیادہ سے زیادہ اسلامی بنک قائم کرنے کے ساتھ ساتھ اسلامک چیمبرز آف کامرس اینڈ انڈسٹریز قائم کرنا چاہیں۔ اسی طرح کثیر القومی تجارتی نظام اور کثیر القومی کارپوریشنز قائم کر کے امت مسلمہ کے خطوں میں از سر نو ایک بین الاقوامی سطح پر ایک آزاد تجارت کا آغاز کر دینا چاہیے۔

مذکورہ اقدامات سے عالم اسلام سود اور اس پر مشتمل نظام سرمایہ داری کے چنگل سے نکلنے کی سبیل پیدا کر سکتا ہے۔

سود اللہ اور اس کے رسول سے اعلان جنگ کے مترادف ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سود کی ممانعت کے بعد مخالفت پر اسے اللہ اور رسول سے جنگ قرار دیا ہے:

فَإِن لَّمْ تَفْعَلُوا فَأْذَنُوا بِحَرْبٍ مِّنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ[3]

''پھر اگر تم نے ایسا نہ کیا (سود نہ چھوڑا) تو آگاہ ہو جاؤ کہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے تمہارے خلاف اعلان جنگ ہے۔''

نبی کریم ﷺ اس کی مذمت اپنے عالمی خطبہ حجۃ الوداع میں کر چکے ہیں:

وربا الجاهلية موضوع[4]

''اور جاہلیت کا سود ختم کر دیا گیا ہے۔''

اس طرح عالم اسلام اس سود کی لعنت سے چھٹکارا پا کر اپنا آزاد اسلامک اکنامک پر مشتمل عالمی نظام قائم کر سکتے ہیں۔

۳۔ سائنس و ٹیکنالوجی میں ترقی:

عالم اسلام کو اپنے تمام وسائل، تعلیم، سائنس و ٹیکنالوجی اور دفاع کے لیے لگانے ہوں گے۔ ان کے ساتھ ہی بین الاقوامی تجارت کو مضبوط کرنا اور چلانا ممکن ہوگا۔ قرآن ہمیں ہر لحاظ سے طاقت ور رکھنے اور قوت جمع کرنے کی تلقین کرتا ہے:

---

[1] مسند احمد، رقم حدیث (۴۲۵۷)

[2] معجم الاوسط ۷/۲۵

[3] البقرہ ۲:۲۷۹

[4] سیرت ابن ہشام ۴/۲۵۳

وَأَعِدُّوا لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم مِّن قُوَّةٍ ۱

''اور تم ان کے لیے مقدور بھر طاقت تیار رکھو۔''

بدلتے ہوئے حالات میں طاقت وقوت میں شامل تمام علوم وفنون اور ذرائع خصوصاً سائنس اور ٹیکنالوجی میں ترقی اور مہارت کی اہمیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے عالم اسلام کو ان تمام میدانوں میں اپنی صلاحیتوں کو بڑھانا ہوگا۔

۵۔ تعلیم وتحقیق کے مشترکہ منصوبے:

اسلامی ممالک میں شرح خواندگی کو بڑھانے کے ساتھ ساتھ ایسے مشترکہ منصوبے شروع کیے جائیں جن میں تحقیق کا کام ہو تاکہ ایسے مسلم سائنس دان تیار ہو سکیں جو مسلم قوم کو دنیا میں سیاسی اقتصادی اور دفاعی میدان میں ایک قوت بنا دیں اور اپنی تہذیب و ثقافت کو خود اپناتے ہوئے اس کو تباہ کرنے والے نیو ورلڈ آرڈر کے عزائم کو خاک میں ملا سکیں۔

اس کام کے لیے قرون اولیٰ کی سائنسی ترقی اور قرآن مجید کی وہ آیات جو ہمیں تحقیق اور غور وخوض پر ابھارتی ہیں مشعل راہ بنانا ہوں گی۔ قرآن ہمیں بار بار تحقیق اور تدبر کی دعوت دیتا نظر آتا ہے:

أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ ۲

''کیا یہ لوگ قرآن پر غور نہیں کرتے؟''

أَفَلَا يَنظُرُونَ إِلَى الْإِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ ○ وَإِلَى السَّمَاءِ كَيْفَ رُفِعَتْ ○ وَإِلَى الْجِبَالِ كَيْفَ نُصِبَتْ ○ وَإِلَى الْأَرْضِ كَيْفَ سُطِحَتْ ○ ۳

''تو کیا یہ لوگ اونٹوں کو نہیں دیکھتے کہ کیسے بنائے گئے؟ آسمان کو نہیں دیکھتے کہ کیسے اٹھایا گیا؟ پہاڑوں کو نہیں دیکھتے کہ کیسے جمائے گئے؟ اور زمین کو نہیں دیکھتے کہ کیسے بچھائی گئی؟''

أَفَلَا تَتَفَكَّرُونَ ۴

''کیا تم غور وخوض نہیں کرتے؟''

۶۔ مشترکہ دفاع:

عالم اسلام کو نئی سامراجی یلغار سے نپٹنے کے لیے اپنا اسلامی ممالک کا دفاعی نظام تشکیل دینا چاہیے اور خصوصاً جن مسلمان ممالک کی سرحدیں آپس میں ملتی ہیں انہیں NATO اور وارسا پیکٹ کی طرز پر اپنے دفاعی معاہدے تشکیل دینا ہوں گے اور اعلیٰ سطح پر معلومات کے تبادلے کا موثر نظام بنانا ہوگا۔

---

۱ الانفال ۸:۶۰

۲ النساء ۴:۸۲

۳ الغاشیہ ۸۸:۱۷۔۲۰

۴ الانعام ۶:۵۰

دفاعی اور فوجی سطح پر ریسرچ اور انٹیلی جنس کے منصوبوں میں بھی تعاون بڑھانا ہوگا۔ تاکہ مستقبل میں اگر کوئی ڈیزرٹ سٹارم جیسا آپریشن ہو تو اس سے مشترکہ طور پر نمٹا جا سکے۔

۷۔ ورلڈ اسلامک کورٹ آف جسٹس کا قیام:

عالم اسلام کے بین الاقوامی سطح پر مسائل اور اختلافات کو نمٹانے کے لیے ورلڈ اسلامک کورٹ آف جسٹس قائم کی جائے تاکہ اس سلسلے میں بین الاقوامی قوانین کے ضابطوں پر عمل درآمد کے انتظار کرنے کی بجائے اسلامی بین الاقوامی قانون کے مطابق فیصلے کیے جائیں۔

دنیا کے تمام اسلامی ممالک میں داخلی اور خارجی قوانین پر مشتمل Unified codes بنائے جائیں تاکہ عدالتی نظاموں میں یکسانیت آئے۔

کشمیر، فلسطین اور دیگر ایسے ممالک کے لیے مشترکہ حکمت عملی:

کشمیر، فلسطین، بوسنیا یا کسی اور ملک میں اس طرز کی زیادتی اور ہونے والے ظلم وستم کے خاتمے کے لیے عالم اسلام کو مشترکہ حکمت عملی طے کرنی چاہیے تاکہ مظلوم مسلمانوں کو حق خودارادیت مل سکے اور ظلم وستم سے نجات مل جائے ایسے ظلم میں شامل ممالک کے ساتھ سفارتی تعلقات اور تجارتی روابط بند کر کے یا پھر مشترکہ جذبہ۔ جہاد کو کام میں لا کر ایکشن کرنا چاہیے۔

مسلم ممالک میں عدل کا قیام:

تمام اسلامی ممالک کو اپنے نظام سیاست میں عدل کو بنیاد بناتے ہوئے اسلامی تعلیمات کے مطابق عادلانہ جمہوری نظام جو کہ قرآن وسنت کے تابع ہو قائم کرنا ہوگا اور دنیا کے لیے ایک مثال بننا ہوگا تاکہ غیر مسلم ممالک میں ہونے والے ظلم کے خلاف عالمی رائے عامہ کو ہموار رکھنے کے ساتھ ساتھ ظلم کے خلاف ایکشن لیا جا سکے۔ اور اپنے ممالک میں موجود غیر مسلموں کو وہ تمام حقوق دینا ہوں گے جن کی تلقین قرآن وسنت میں ہے اور جن کی عمدہ مثالیں ہمیں قرن اول سے ملتی ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے:

اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَى[1]

''عدل کرو وہ تقویٰ کے زیادہ قریب ہے۔''

امت مسلمہ کی دولت مشترکہ کا قیام:

امت مسلمہ اپنے آپ کو قرآن وسنت کی تعلیمات سے آراستہ کر کے اور اسلامی فلاحی ریاست قائم کر کے جو تمام اسلامی ممالک پر مشتمل الحاق کی شکل میں بھی ہو سکتی ہے۔ دنیا کو ایک ایسا رول ماڈل دے جس میں احترام انسانیت خیر خواہی اور عدل کی بالادستی ہو جیسا کہ قرن اول میں تھا تو آج کے جمہوری دور میں لوگ اس کی طرف متوجہ ہو کر اپنے دکھوں کا مداوا حاصل کرنے کے لیے

---

[1] المائدہ ۵:۸

اسلام قبول کر سکتے ہیں اس کے لیے عالم اسلام کو انفرادی اور اجتماعی طور پر اپنے فرائض سر انجام دینا ہوں گے اور اس آیت کا مصداق بننا ہوگا۔

كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ[1]

"تم بہترین امت ہو تمہاری تخلیق لوگوں کے لیے ہوئی ہے تم نیکی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو۔"

اور اسلام کے تصور جہاد کو وسیع تر مفہوم میں لیتے ہوئے اپنانا ہوگا جس کے بغیر دنیا میں امن و امان کا قیام ناممکن ہے۔ ارشاد ہے:

إِلَّا تَفْعَلُوهُ تَكُن فِتْنَةٌ فِي الْأَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيرٌ[2]

"اگر تم اسے (جہاد کو) نہیں کرو گے تو زمین پر فتنہ اور بڑا فساد پھیل جائے گا۔"

لہٰذا اسلامک ورلڈ آرڈر ہی دنیا میں فتنہ اور فساد کو ختم کرنے کا واحد حل ہے۔

---

[1] آل عمران ۳:۱۱۰

[2] الانفال ۸: ۷۳

خلاصہ بحث

خلاصہ بحث

اسلام پرامن بقائے باہمی پر مشتمل پالیسی کے نہایت اہم اور ماڈل دور قرن اول کو بنیاد بناتے ہوئے عصری تقاضوں اور اسلام پر اٹھنے والے اعتراضات کا جواب دینے کے لیے میں نے اپنے تحقیقی عنوان "قرن اول میں مسلمانوں کے غیر مسلموں سے تعلقات و معاہدات اور عصر حاضر" کو چھ ابواب میں یوں زیر بحث بنایا ہے:

پہلے باب کی پہلی فصل میں غیر مسلموں کی مختلف حیثیتیں اور اقسام لکھی ہیں کیونکہ ان کے مطابق ہی ان سے مختلف اوقات میں مختلف رویہ ہو سکتا ہے۔

مسلم فقہاء نے مسلمانوں کے دور عروج میں دنیا کی تقسیم بطور مسلم و غیر مسلم اقوام کے اختیارات کے حوالے سے کر کے ان کے بارے میں تفصیلی احکام اپنی کتب میں درج کیے ہیں۔ موجودہ حالات میں اگرچہ یہ تقسیم ممکن نہیں لیکن غیر مسلموں سے متعلق احکام و مسائل جاننے کے لیے اور سابقہ کتب فقہ سے استفادہ کے لیے ان اصطلاحات سے آگاہی بھی ضروری ہے۔

دوسری فصل میں غیر مسلموں سے متعلق قرآن و حدیث کی تعلیمات کا جائزہ لے کر غیر مسلموں سے تعلقات کی حدود، حکمت اور اسلامی تعلیمات کے اصول پیش کیے گئے ہیں۔

دوسرے باب کی پہلی فصل میں معاہدات کا معنی و مفہوم اور اقسام لکھی گئی ہیں۔ اس باب کی دوسری فصل میں معاہدات سے متعلق آیات و احادیث کو بنیاد بنا کر انسانی زندگی میں ان کی اہمیت اجاگر کی گئی ہے۔

تیسرے باب کی پہلی فصل میں نبی کریم ﷺ کے مولد شہر مکہ کا تاریخی، معاشی، سیاسی اور مذہبی پس منظر بتا کر ان حالات اور واقعات سے آگاہی حاصل کی گئی ہے کہ اس شہر کے لوگ کس طرح کے مختلف غلط عقائد میں مبتلا تھے اور کیسے سیاسی نظام میں بندھے ہوئے تھے اور کیسا حلیفی اور معاہداتی نظام رکھتے تھے۔

دوسری فصل میں نبی کریم ﷺ اور مسلمانوں نے دعوت دین کے لیے جو پر امن رویہ اختیار کیا اسے پیش کیا گیا ہے۔

تیسری فصل میں کفار مکہ کا منفی طرز عمل اور مزاحمتی تدابیر اور ان کے مقابلے میں مسلمانوں کا عزم و ثبات زیر بحث لایا گیا ہے۔

چوتھے باب کی پہلی فصل میں مدینہ میں موجود غیر مسلموں کا عملی رویہ بیان کر کے دوسری فصل میں مدنی دور کے اہم معاہدات اور ان کی سیاسی و معاشرتی اہمیت واضح کی گئی ہے۔

اس باب کی تیسری فصل میں غیر مسلموں کی بڑی بڑی عہد شکنیوں اور معاہدات کی عدم پاسداری کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

پانچویں باب کی پہلی فصل میں خلفاء راشدین کے دور میں غیر مسلموں سے تعلقات و معاہدات کا جائزہ لیا گیا ہے۔

اس باب کی دوسری فصل میں قرن اول میں شامل اموی حکمرانوں کا مختصر تعارف اور ان کے غیر مسلموں سے تعلقات و معاہدات زیر بحث لائے گئے ہیں۔

چھٹے باب کی پہلی فصل میں عصر حاضر کے غیر مسلموں سے متعلق سماجی، معاشرتی اور معاشی تعلقات سے متعلق اسلامی تعلیمات کا

مطالعہ اس انداز سے پیش کیا گیا ہے کہ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلامی تعلیمات ہر دور کا ساتھ دے سکتی ہیں اور قیامت تک کے لیے راہنما ہیں۔ اسی فصل میں عصر حاضر کے معاہدات کی شرعی حیثیت بھی زیر بحث لائی گئی ہے۔

اس باب کی دوسری فصل میں امریکی نیو ورلڈ آرڈر جس نے پوری دنیا کو اپنی کمانڈ میں لینے کا اعلان کیا ہوا ہے۔ اس کی حقیقت اور اقوام عالم خصوصاً عالم اسلام پر اس کے اثرات کا جائزہ لے کر اس کے متبادل اسلامی ورلڈ آرڈر کے ممکنہ خدوخال اور اسلامی ممالک کے لیے حکمت عملی تجویز کی گئی ہے۔

نتائج تحقیق

نتائج تحقیق

الحمدللہ میرا تحقیقی عنوان قرن اول میں مسلمانوں کے غیر مسلموں سے تعلقات ومعاہدات ایک اچھوتا، منفرد اور وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ انسانی تعلقات کا مسئلہ چونکہ سماج کا نازک ترین مسئلہ ہوتا ہے اور ان حالات میں جب کہ اسلام کی تصویر بگاڑنے یا مسخ کرنے کی کوشش اپنے عروج پر ہیں۔ تو اس کی پرامن بقائے باہمی پر مشتمل تاریخ خصوصاً قرن اول کی عمدہ مثال کو دنیا کے سامنے رکھنا اشد ضروری ہوگیا ہے۔ قرن اول کے اس انداز کے مطالعہ کے بعد عصر حاضر پر اس کی تطبیق کے حوالے سے درج ذیل نتائج اوران کے مطابق یہ سفارشات سامنے آتی ہیں:

۱۔ اسلام کا قرن اول اقوام عالم کے لیے پرامن بقائے باہمی کی عدیم النظیر مثال رکھتا ہے۔

۲۔ یہ دور اقوام عالم کو مختلف ادیان کی موجودگی کے باوجود عمدہ تعلقات اور پرامن معاہدات کے تحت پنپنے کے لیے ایک عملی مثالی دور ہے۔

۳۔ مسلمانوں کو غیر مسلموں سے تعلقات ومعاہدات کے لیے اسے مشعل راہ بنا کر اقوام عالم سے صحیح اسلامی رواداری، وسعت ظرفی اور احترام انسانیت سے بھرپور رویوں کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔

۴۔ اسلام ایک عالمی دین ہے اور نبی اکرم ﷺ کی بعثت پورے عالم انسانیت کے لیے ہوئی ہے۔ لہٰذا تمام مسلمانوں کو بھی اپنی سوچ عالمی بنا کر دنیا کے مسائل حل کرنے اور عالم انسانیت کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی تعلیمات کو اپنانے کے لیے حکمت موعظہ حسنہ اور مجادلہ احسن سے کام لینا چاہیے۔

۵۔ نبی اکرم ﷺ نے اپنی نبوت کے مکی دور میں جب کہ مسلمان تعداد میں کم اور طاقت کے لحاظ سے بہت کمزور تھے اپنے اور ساتھیوں کے لیے اس دور کے نظام پناہ اور معاہدات کے نظام کو اپنایا تھا۔ اس دور میں بھی مسلمانوں کو پوری دنیا سے کٹنے کی بجائے عالمی امن معاہدات کے ذریعے اپنے آپ کو محفوظ کر کے اپنا تبلیغی مشن جاری رکھنا ہوگا۔

۶۔ نبی اکرم ﷺ نے مدنی دور میں غیر مسلم اقوام سے مختلف معاہدے کیے جو آج کے دور میں مسلمانوں کے لیے مشعل راہ بن سکتے ہیں۔

۷۔ خلفاء راشدین نے اقوام عالم سے تعلقات ومعاہدات کے لیے دور نبوی کو بنیاد بنایا تھا ان کا نمونہ بھی عالم اسلام کے لیے ایک اعلیٰ مثال اور اقوام عالم کو اپنا شاندار ماضی دکھانے کے لیے ایک بے مثال دور کی حیثیت رکھتا ہے۔

۸۔ اموی دور میں چند حکمرانوں سے ہوئی والی غلطیوں پر مسلم فقہاء کا برہم ہونا اور احتجاج کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ ان کا وہ عمل اسلام کی ترجمانی نہ تھا بلکہ ان کا ذاتی فعل تھا جسے حضرت عمر بن عبدالعزیز نے مکمل مسترد کر کے خلافت راشدہ کی یاد تازہ کردی تھی۔ موجودہ دور کے مسلم حکمرانوں کے لیے حضرت عمر بن عبدالعزیز کے دور کو مثال بنایا جاسکتا ہے۔

۹۔ اسلام کی تعلیمات ابدی ہیں۔ دور نبوی اور خلفاء راشدین کے دور کی مثالیں ہمیں ہر دور کے غیر مسلموں سے احسن سلوک

اوران سے خاندانی، سماجی، مذہبی اور معاشی تعلقات کی بنیادیں فراہم کرتی ہیں۔

۱۰۔ اسلام معاہدات کی پاسداری کی تلقین کرتا ہے اور وعدہ توڑنے اور بدعہدی کی ہرگز اجازت نہیں دیتا۔ اور اس سلسلے میں اپنے ہم مذہب اور غیر مذہب والوں کی کوئی تقسیم روانہیں رکھتا۔ اس لیے مسلمانوں کو ان تمام عالمی معاہدوں کی پاسداری کرنی چاہیے جن میں کسی مسلمہ اسلامی احکام کی نافرمانی لازم نہ آتی ہو۔

۱۱۔ اقوام متحدہ کے ادارے کو فعال بنانے کے لیے مسلمانوں کو اس ادارے کے خدوخال اور اپنی تعداد کے مطابق نمائندگی کے لیے تبدیلی لانے کی کوشش کرنی چاہیے۔

۱۲۔ امریکی نیو ورلڈ آرڈر جو کہ ایک سامراجی حکم کی حیثیت رکھتا ہے۔ مسلمانوں کو اقوام عالم کو ساتھ ملا کر اس کی تردید کرنی چاہیے اور دنیا کے سامنے اس کے مضر اثرات رکھ کر اقوام عالم کی تائید سے پوری دنیا کے لیے قابل قبول نظام تشکیل دینے میں اپنا فریضہ سرانجام دینا چاہیے۔

۱۳۔ اقوام عالم اگر مجموعی طور پر مسلمانوں کا ساتھ دینے پر تیار نہ ہوں تو مسلمانوں کو عالم اسلام کو متحد اور یک جا کر کے اس نیو ورلڈ آرڈر کے مقابلے کے لیے لائحہ عمل تیار کرنا ہوگا اور اقوام عالم میں سے جو ممالک بھی ساتھ دیں انہیں ساتھ ملا کر چلنا ہوگا۔

۱۴۔ اسلام کا قرن اول ایسے تمام قسم کے حالات سے نبرد آزما ہونے کے لیے عمدہ مثالیں فراہم کرتا ہے۔ خاص طور پر صلح حدیبیہ اور میثاق مدینہ۔

۱۵۔ مذکورہ اقدام کو عملی جامہ پہنانے کے لیے مسلمانوں کے ذہن میں بین الاقوامیت کے تصور کو فروغ دے کر ان کو ان کی ذمہ داریوں سے آگاہ کرنا ہوگا۔

اشاریہ

اشاریہ

شخصیات

مقامات

مصادر و مراجع

مصادر و مراجع

- ☆ آلوسی، محمود، بلوغ الادب فی معرفۃ احوال العرب، المطبعہ الرحمانیہ، مصر، ۱۹۲۳ء
- ☆ آلوسی، محمود، روح المعانی، دار احیاء التراث العربی، بیروت، لبنان، س ن
- ☆ ابراہیم مصطفیٰ، معجم الوسیط، بیروت، لبنان، ۱۳۸۱ھ
- ☆ ابن اثیر، مجد الدین، ابو السعادات المبارک بن محمد الجزری، النہایہ فی غریب الحدیث، المطبعہ عثمانیہ، مصر، ۱۳۱۱ھ
- ☆ ابن الاثر الجزری، تاریخ الکامل، القاہرہ، ۱۲۹۰ھ
- ☆ ابن حجر، محمد بن عسقلانی، الاصابہ، احیاء التراث العربی، بیروت، لبنان، ۱۳۲۸ھ
- ☆ ابن حجر عسقلانی، فتح الباری، دار احیاء التراث العربی، بیروت، لبنان، ۱۹۸۸ء
- ☆ ابن حزم، ابو محمد علی بن احمد بن حزم، الفصل فی الملل والاھواء والنحل، المطبع الادبیہ فی سوق الخضار القدیم بمصر، ۱۳۱۷ھ
- ☆ ابن رشد، بدایۃ المجتہد ونہایۃ المقتصد، مکتبہ مصطفیٰ باز، الریاض، ۱۹۹۰ء
- ☆ ابن سعد، ابو عبد اللہ محمد، الطبقات الکبریٰ، دار صادر، بیروت، لبنان، ۱۹۵۸ء
- ☆ ابن سید الناس، عیون الاثر، دار الجیل، بیروت، لبنان، ۱۹۷۴ء
- ☆ ابن عبد البر، الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب، مطبع دائرۃ المعارف، حیدرآباد، ۱۳۳۶ھ
- ☆ ابن عبد ربہ، احمد بن محمد، العقد الفرید، مطبع التالیف والنشر والترجمہ، ۱۹۴۰ء
- ☆ ابن قدامہ، ابو عبد اللہ بن احمد بن محمد، المغنی، تحقیق الدکتور عبد اللہ، القاہرہ، مصر، ۱۴۱۳ھ
- ☆ ابن قیم الجوزیہ، زاد المعاد فی ھدی خیر العباد، مطبعۃ السنۃ المحمدیہ، ۱۳۷۱ھ
- ☆ ابن کثیر، عماد الدین، البدایہ والنہایہ، مکتبہ المعارف، بیروت لبنان، ۱۹۷۷ء
- ☆ ابن کثیر، ابو الفداء عماد الدین، تفسیر ابن کثیر، مکتبہ قدوسیہ، لاہور، ۱۹۹۴ء
- ☆ ابن ماجہ، محمد بن یزید، ابن ماجہ، الکتب الستۃ، دار السلام للنشر والتوزیع، الریاض، ۱۴۲۹ھ
- ☆ ابن ہشام، سیرۃ النبویہ، لبنان، مطبع دار احیاء التراث العربی، بیروت، لبنان، ۱۹۷۱ء
- ☆ ابو البرکات، مجد الدین، امام، المحرر فی الفقہ، دار الکتاب العربی، بیروت، لبنان، ۱۳۶۹ھ
- ☆ ابو داؤد سلیمان بن اشعث، سنن ابی داؤد، الکتب الستۃ، دار السلام للنشر والتوزیع، الریاض، السعودیہ، ۱۴۲۹ھ
- ☆ ابو زہرہ، محمد، خاتم النبیین، دار الفکر العربی، القاہرہ، س ن
- ☆ ابو سلیمان، عبد الحمید احمد، اسلام اور بین الاقوامی تعلقات، فیض بکس، لاہور، ۱۹۹۱ء

☆ ابوعبید، القاسم بن سلام، کتاب الاموال، دار الفکر، قاہرہ، ۱۳۰۱ھ
☆ ابو یوسف، یعقوب بن ابراہیم، کتاب الخراج، دار المعرفہ، بیروت، لبنان، س ن
☆ احمد امین، فجر الاسلام، عمر احمد عثمانی (مترجم) ادارہ طلوع اسلام، لاہور، ۱۹۶۷ء
☆ احمد بن ابی یعقوب، تاریخ یعقوبی، مطبع دار البیروت، بیروت، لبنان، ۱۹۶۰ء
☆ احمد بن حنبل، مسند، المطبعۃ المیمینہ، مصر، ۱۳۱۳ھ
☆ ادریس کاندھلوی، معارف القرآن، مکتبہ عثمانیہ، ۱۹۸۲ء
☆ اسحاق قریشی، حضور اکرم پیغمبر امن وسلامتی، مکتبہ زاویہ، لاہور، ۱۹۹۸ء
☆ اصلاحی، امین احسن، تدبر قرآن، فاران فاؤنڈیشن، لاہور، س ن
☆ البلاذری، ابوالحسن، فتوح البلدان، مطبعہ المصریہ، قاہرہ، ۱۹۳۲ء
☆ الجزیری، عبدالرحمن، کتاب الفقہ علی مذاھب الاربعہ، محکمہ اوقاف، لاہور، ۱۹۷۹ء
☆ الحموی، یاقوت بن عبداللہ، معجم البلدان، مطبعہ السعادہ، مصر، ۱۹۰۶ء
☆ الدینوری، احمد بن داؤد، اخبار الطوال، لیڈن، ای جے بریل، ۱۹۱۲ء
☆ الذیلعی، عبداللہ بن یوسف، نصب الرایہ، مکتبہ حقانیہ، پشاور، س ن
☆ السرخسی، شمس الدین، محمد بن احمد بن ابی سہل، المبسوط، دار الکتب العلمیہ، بیروت، لبنان، ۱۹۹۷ء
☆ السیوطی، جلال الدین، تاریخ الخلفاء، مطبع مجیدی، کانپور، ۱۳۳۱ھ
☆ السیوطی، جلال الدین، عبدالرحمن بن ابی بکر، تاریخ الخلفاء، مطبع مجیدی، کانپور، ۱۳۳۱ھ
☆ الشوکانی، محمد بن علی، فتح القدیر، مصطفی البابی الحلبی، مصر، ۱۳۵۰ھ
☆ الطبری، محمد ابن جریر، تاریخ الامم والملوک، مکتبہ الحسینیہ، القاہرہ، ۱۳۳۶ھ
☆ الکاسانی علاؤ الدین ابوبکر بن مسعود، بدائع الصنائع، ایچ ایم سعید کمپنی، کراچی، ۱۳۲۸ھ
☆ الماوردی، ابوالحسن علی بن محمد، دار الکتب العلمیہ، بیروت، لبنان، ۱۳۹۸ھ
☆ المتقی، علی علاؤ الدین بن حسام الدین، کنز العمال فی سنن الاقوال والافعال، مطبع الاسلامیہ، حیدر آباد، ۱۳۱۲ھ
☆ المرزوقی، ابوعلی، کتب الازمنہ والامکنہ مجلس دائرۃ المعارف، حیدر آباد، ۱۳۳۲ھ
☆ المبسوط، کتاب السیر، دار الکتب العلمیہ، ۱۹۹۷ء
☆ المسعودی، حسین بن علی، مروج الذہب، مطبعہ السعادۃ، مصر، ۱۹۱۸ء
☆ النسائی، احمد بن شعیب، سنن نسائی، الکتب الستۃ، دار السلام للنشر والتوزیع، الریاض، السعودیہ، ۱۳۲۹ھ

☆ امجد حیات ملک، تیور ورلڈ آرڈر، احد پرنٹنگ پریس، لاہور، ۱۹۹۴ء
☆ امجد علی، مولانا، بہار شریعت، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، س ن
☆ بخاری، محمد بن اسماعیل، الجامع الصحیح للبخاری، الکتب الستۃ، دار السلام للنشر والتوزیع، الریاض، السعودیہ، ۱۴۲۹ھ
☆ پیر محمد کرم شاہ، ضیاء القرآن، ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور، ۱۳۹۸ھ
☆ ترمذی، ابو عیسی محمد بن عیسی، الجامع ترمذی، الکتب الستۃ، دار السلام للنشر والتوزیع، الریاض، السعودیہ، ۱۴۲۹ھ
☆ جصاص، ابو بکر احمد بن علی، احکام القرآن، المطبعۃ البھیۃ، مصر، ۱۳۴۷ھ
☆ جلال الدین عمری، غیر مسلموں سے تعلقات اور ان کے حقوق، ادارہ تحقیق وتصنیف اسلامی دودھ پور، علی گڑھ، ۱۹۹۹ء
☆ حسن احمد زیات، تاریخ الادب العربی، مکتبہ نھضۃ، مصر، س ن
☆ حفظ الرحمٰن سیوہاروی، اخلاق اور فلسفہ اخلاق، خالد مقبول پبلشرز، لاہور، ۱۹۷۶ء
☆ حمید اللہ، ڈاکٹر، خطبات بہاول پور، ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد، ۱۹۹۲ء
☆ حمید اللہ، ڈاکٹر، رسول اکرم کی سیاسی زندگی، دار الاشاعت کراچی، ۱۳۸۰ھ
☆ حمید اللہ، ڈاکٹر، سیاسی وثیقہ جات، زریں آرٹ پریس، لاہور، ۱۹۶۰ء
☆ حمید اللہ، ڈاکٹر، عہد نبوی میں نظام حکمرانی، اکیڈمک آفسٹ پریس، آرام باغ روڈ، کراچی، ۱۹۸۷ء
☆ رفیق خاور، اردو تھیسارس، ایس ٹی پرنٹرز، راولپنڈی، ۱۹۹۶ء
☆ زمخشری، ابو القاسم محمود بن عمر، الکشاف عن حقائق غوامض التنزیل وعیون الاقاویل فی وجوہ التاویل الناشر دار الکتب العربی، بیروت، لبنان، س ن
☆ زیدان، عبدالکریم ڈاکٹر، احکام الذمیین والمستامنین فی دار السلام، موسسۃ الرسالۃ بیروت، لبنان، ۱۴۰۸ھ
☆ سلیمان منصور پوری، رحمۃ للعالمین، لاہور اکیڈمی، لاہور، س ن
☆ سید سلیمان ندوی، تاریخ ارض القرآن، معارف پریس، اعظم گڑھ، ۱۹۵۵ء
☆ سید سلیمان ندوی، خطبات مدراس، لاہور اکیڈمی، لاہور، س ن
☆ سید قطب شہید، فی ظلال القرآن، اسلامی اکادمی لاہور، ۱۹۸۹ء
☆ شاہ ولی اللہ، حجۃ اللہ البالغۃ، الفیصل ناشران، لاہور، ۱۹۸۳ء
☆ شبلی نعمانی، الفاروق، مکتبہ رحمانیہ، لاہور، س ن
☆ شبلی نعمانی، سیرۃ النبی، الفیصل ناشران وتاجران، لکھنو، ۱۹۱۹ء
☆ صاعد بن احمد بن صاعد اندلسی، طبقات الامم، مطبعہ السعادہ، س ن

- ☆ صدیقی، نجات اللہ، اسلام کا نظام محاصل، مکتبہ چراغ راہ، کراچی، ۱۹۶۶ء
- ☆ صفی الرحمٰن مبارک پوری، الرحیق المختوم، مکتبہ السلفیہ، شیش محل روڈ، لاہور، ۱۹۷۳ء
- ☆ عبدالرزاق بن ہمام، المصنف، تحقیق حبیب الرحمٰن الاعظمی، المکتب الاسلامی، بیروت، لبنان،
- ☆ عبداللہ بن عبدالحکیم، سیرت عمر بن عبدالعزیز، یوسف لدھیانوی (مترجم) مکتبہ لدھیانوی، ۱۹۹۶ء
- ☆ علی بن حامد بن ابی بکر، چچ نامہ (فتح نامہ سندھ) مجلس مخطوطات فارسیہ، حیدرآباد، دکن، ۱۹۳۹ء
- ☆ عمر فروخ، الدکتور، تاریخ الجاھلیۃ، دار المسلم، بیروت، لبنان، ۱۳۸۲ھ
- ☆ فواد حمزہ، قلب جزیرۃ العرب، المطبعۃ السلفیہ، مصر، ۱۳۵۲ھ
- ☆ قرطبی، ابو عبداللہ محمد بن احمد الانصاری، الجامع لاحکام القرآن، الھیئۃ المصریہ العام، ۱۹۸۷ء
- ☆ کتاب مقدس، پاکستان بائبل سوسائٹی انارکلی لاہور، ۱۹۸۳ء
- ☆ گلپ پاشا، محمد رسول اللہ، سٹیزن پبلشرز، کراچی، س ن
- ☆ مالک، امام، موطا، دار الفکر، بیروت، لبنان، ۱۹۸۹ء
- ☆ مجیب اللہ ندوی، اسلامی فقہ، زاہد بشیر پرنٹرز، لاہور، ۱۹۹۱ء
- ☆ محمد الغزالی، فقہ السیرہ، دار الکتاب العربی، ۱۳۷۰ھ
- ☆ محمد میاں، سید، دین کامل، جمعیۃ پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۲ء
- ☆ محمد تانی، ڈاکٹر، محسن انسانیت اور انسانی حقوق، دار الاشاعت، کراچی، ۱۹۹۹ء
- ☆ محمد میاں، محمد رسول اللہ ﷺ قرآن اور تاریخ کے آئینے میں، مکتبہ محمودیہ، لاہور، ۱۹۸۶ء
- ☆ محمد یونس، ڈاکٹر، رسول اللہ کا سفارتی نظام، دار القرقان، راولپنڈی، ۱۹۹۶ء
- ☆ مرغینانی، برہان الدین، ابوالحسن علی بن ابی بکر، الھدایہ، کتب خانہ رشیدیہ، دہلی، ۱۳۵۸ھ
- ☆ مسلم بن حجاج، الجامع الصحیح المسلم، الکتب الستۃ، دار السلام للنشر والتوزیع، الریاض، السعودیہ، ۱۴۲۹ھ
- ☆ مفتی محمد شفیع، معارف القرآن، ادارہ المعارف، کراچی ۱۹۹۳ء
- ☆ مقریزی، تقی الدین احمد بن علی، الخطط المقریزیہ، القاہرہ، مطبع النیل، ۱۳۲۴ھ
- ☆ منہاج الدین منہاجی، اسلامی فقہ، مکتبہ الحسنات، دہلی، ۱۹۸۶ء
- ☆ مودودی، ابوالاعلیٰ، تفہیم القرآن، ادارہ ترجمان القرآن، لاہور، ۱۹۷۹ء
- ☆ مودودی، ابوالاعلیٰ، ہمارے داخلی خارجی مسائل، اسلامک پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۸ء
- ☆ میرٹھی، زین العابدین، تاریخ ملت، دار الاشاعت، کراچی، ۲۰۰۲ء

☆ نجات اللہ صدیقی، شرکت و مضاربت کے شرعی اصول، اسلامک پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۶۹ء

☆ نجیب اکبر آبادی، تاریخ اسلام، اسلامی اکادمی، لاہور، س ن

☆ ندوی، معین الدین، تاریخ اسلام، مکتبہ رحمانیہ، لاہور، س ن

☆ نعیم صدیقی، محسن انسانیت، اسلامک پبلی کیشنز، لاہور، س ن

☆ نعیم صدیقی، مقالات سیرت، وزارت مذہبی امور، اسلام آباد، پاکستان ۱۴۰۲ھ

☆ نور محمد غفاری، اسلام کا قانون تجارت، دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری، لاہور، ۱۹۸۶ء

☆ نور محمد غفاری، نبی کریم کی معاشی زندگی، دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری، لاہور، س ن

☆ نیو ورلڈ آرڈر، اسلام اور پاکستان، گلشن ہاؤس، مزنگ روڈ لاہور، س ن

☆ واقدی، محمد بن عمر و ابن واقد، کتاب المغازی، مطبع جامع آکسفورڈ، لندن، ۱۹۴۳ء

☆ وہبہ الزحیلی، التفسیر المنیر، دار الفکر، دمشق، ۱۹۹۱ء

☆ ہیکل، محمد حسین، حیات محمد، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ۱۹۴۷ء

☆ یحییٰ بن آدم القرشی، کتاب الخراج، مطبع المکتبۃ العلمیہ، لاہور، س ن

☆ یوسف قرضاوی، الحلال والحرام فی الاسلام شمس پیرزادہ، (مترجم) اسلامک پبلی کیشنز پرائیویٹ لمیٹڈ، لاہور، ۱۹۹۶ء

0000000

☆ ابن منظور، الافریقی، لسان العرب، دار الصادر، بیروت لبنان، س ن

☆ راغب اصفہانی، مفردات القرآن، محمد عبدہ فلاح (مترجم) المکتبۃ القاسمیہ، ۱۳۸۳ھ

☆ عبدالحفیظ بلیاوی، مصباح اللغات، مکتبہ برہان، دہلی، ۱۹۵۰ء

☆ لوئیس معلوف، المنجد، دار الاشاعت، کراچی، ۱۹۷۵ء

☆ محمد رفیع، مولانا، فرہنگ فارسی، دار الاشاعت، کراچی، ۱۹۹۰ء

0000000

☆ اردو دائرہ معارف اسلامیہ، دانش گاہ، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۱۹۷۳ء

☆ دائرۃ المعارف اسلامیہ، دار المعرفہ، بیروت، لبنان

0000000

☆ روزنامہ جنگ، کراچی، ۲۳ نومبر ۱۹۹۴ء

☆ روزنامہ جسارت، کراچی، ۱۹۹۴ء

☆ روزنامہ الرایہ، قطر، ۲۳ جنوری ۱۹۹۲ء

0000000

- A.J Arberry, Aspects of Islamic civilization, London, 1964
- Hamid ullah, Dr. the first written constitution in the world, Lahore, 1975
- Mont qumry watt, Muhammad at Madina, oxford university press, London, 2004
- Mont qumry watt, Muhammad the prophet and states man, oxford university press, London, 1974
- Muhammad Ali, Muhammad the prophet . Ahmadiyya Aunjumani-Ishat-I-Islam Lahore, 1924
- The Global Ceome for A New World Order, Tayyab Iqbal printers, Lahore
- Tor, Andree, Muhammad: The Man and his faith, new york, 1960
- A Merriam Webster, Webster's, third new international dictionary of English e.M. Kirk patrich, chambers family dictionary (Edin Burg) 1981
- herry Dratt Fairchild, Dictionary of Socialogy, New york.
- Joyce. M. Habins The Oxford Reference Dictionary chamber press Oxf. 1986
- New Age Encyclopedia (Lexieon publications 1979
- The word book encyclopedia (Chicago, 1998)
- http:// www. Al bab.com/ arab/docs pal/pal10.htm

0000000

فہرست آیات واحادیث

احادیث — صفحہ نمبر